بس یہی دل

ابویحییٰ

مصنف : ابویحییٰ

ناشر : انذار

Inzaar

(0092)-03458206011

(0092)-03323051201

ویب سائٹ : www.inzaar.org

www.inzaar.pk

ای میل : info@inzaar.org

info@inzaar.pk

ملنے کا پتہ : پوری دنیا میں کسی بھی جگہ گھر بیٹھے یہ کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے۔

(0092)-03458206011

(0092)-03323051201

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free. www.inzaar.org ,www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: www.facebook.com/inzaartheorg

Whatsapp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from Whatsapp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

Join us on Youtube @ youtube.com/inzaar-global

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to info@inzaar.org and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD
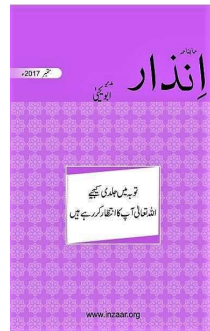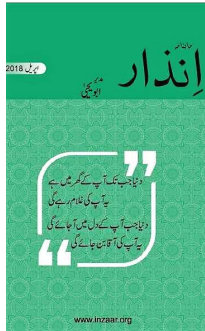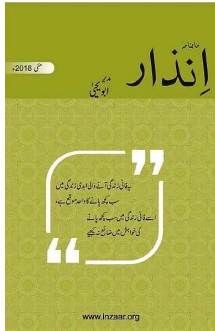
ماہنامہ انذار

مدیر: ابویحییٰ

ماہنامہ انذار ایک دعوتی و اصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان و اخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کے لیے ان نمبروں پر رابطہ کیجیے۔

0345-8206011 or 0332-3051201

مالی تعاون

اللہ تعالیٰ کے پیغام (ایمان و اخلاق، تعمیرِ شخصیت اور فلاحِ آخرت) کو پھیلانے میں انذار کا ساتھ دیجیے۔

ہمارا مالی طور پر ساتھ دینے کے لیے درج ذیل اکاؤنٹ میں عطیات جمع کرائے جا سکتے ہیں۔

For Local Transaction

Title of Account: Inzaar Educational and Charitable Trust

Address: P.O.BOX.7285 Karachi.

Bank Name: United Bank Limited

Branch Address: UBL Vault Branch, Abdullah Haroon Road, Saddar, Karachi.

Account Number: 0080248866323

Branch Code: 0080

For Foreign Transaction

IBAN: PK32 UNIL 0109 0002 4886 6323

SWIFT CODE: UNILPKKA

عطیات جمع کرنے کے بعد

0092-345-8206011 یا info@inzaar.org یا info@inzaar.pk پر ہمیں مطلع کریں تاکہ اس کی رسید آپ کو بھیجی جا سکے۔

رضاکارانہ تعاون

انذار کے لئے رضاکارانہ تعاون فراہم کرنے کے لئے براہ مہربانی ذیل میں درج ای میل ایڈریس پر ای میل بھیجیں۔ info@inzaar.org , info@inzaar.pk

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

بندہ مومن کی زندگی کا جونقشہ قرآن مجیداوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ سے سامنے آتا ہےاسے دوجملوں میں بیان کی جاسکتا ہے۔مومن ایک ایساانسان ہوتا ہےجس کا دل خدا کی محبت سے مزین اوراس کی سوچ مثبت اندازفکر سے عبارت ہوتی ہے۔میری زندگی کا مقصدانہی دو چیزوں کا فروغ ہے۔میں نے زندگی میں جولکھااور جو کہا وہ بالواسطہ اور بلاواسطہ اسی مقصد کے حصول کاایک ذریعہ رہاہے۔

پیش نظر مجموعہ ''بس یہی دل'' میرے ان مضامین پر مشتمل ہے جوپچھلے کئی برسوں میں لکھے گئے ہیں۔ان مضامین سے میرا مقصد لوگوں میں ایک ایسی شخصیت پیدا کرنا تھا جس کے لیے خدا کی ذات ، صفات اوراس کی ملاقات زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بن جائے اور جو بدترین حالات میں بھی امید کے ساتھ جینا سیکھ لے۔یہی وہ صفات ہیں جوکسی شخصیت کواللہ تعالیٰ کی مطلوب شخصیت بناتی ہیں۔یہی وہ شخصیت ہے جسے قرآن قلب سلیم کہتا ہے اورجس کا بدلہ جنت کی ختم نہ ہونے والی ابدی بادشاہی ہے۔میں نے اس شخصیت کواس مجموعے میں ''بس یہی دل'' کاعنوان باندھ کر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ یہ مضامین قارئین میں خدا کی مطلوب شخصیت کی تشکیل کاایک موثر ذریعہ ثابت ہوں گے۔

ابو یحییٰ

abuyahya267@gmail.com

15جون2012

بس یہی دل

پچھلے دنوں مجھے ایک تقریب میں شرکت کا اتفاق ہوا جس کا انعقاد ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ یہ تقریب جس ہال میں منعقد کی گئی تھی اس کا ماحول بہت مسحور کن تھا۔ وسیع ہال، بڑے بڑے خوبصورت فانوس، دبیز قالین، ٹھنڈی فضا، خوش رنگ پردے اور دیواریں اور ان سب کے ساتھ ایک پر تکلف عشائیہ۔

میں اس محفل میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح کے ماحول میں ایسی محافل دنیا بھر میں عام ہوتی ہیں۔ مگر ان میں ہر کس و ناکس کو داخلے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایسی جگہوں پر داخلے کی ایک قیمت ہوتی ہے جو صرف نامور، باصلاحیت، صاحب حیثیت اور بااثر لوگ ہی دے سکتے ہیں۔ معاشرے کے عام افراد کی پہنچ سے یہ سب کچھ ساری زندگی باہر ہی رہتا ہے۔

ایسے میں مجھے خیال آیا کہ مالک کائنات جب اپنی جنت بنائے گا تو یقیناً وہ دنیا کی ان تمام نعمتوں سے زیادہ حسین ہوگی۔ مگر اس جنت کی خوبیوں میں سے سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں داخلہ کے لیے کوئی مال، کوئی نام، کوئی صلاحیت اور کوئی اثر و رسوخ نہیں چاہیے۔ جنت کی حسین وادی، اس کی پر لطف محفلوں، اس کی ابدی بادشاہی اور اس کی غیر فانی نعمتوں کے حصول کی قیمت کچھ نہیں۔ بس اک ٹوٹا ہوا دل ...... رب کی عظمت کے احساس سے پاش پاش دل۔ یہی جنت کی قیمت ہے۔

وہ دل جس میں اخلاص ہو۔ رب کی سچی چاہت ہو۔ اس کی اطاعت کا جذبہ ہو۔ اس کے نام پر مر مٹنے کی خواہش ہو۔ اس کے عہد کی پاسداری ہو۔ اس سے وفا کا عزم ہو۔ اس کی رحمت کی امید ہو۔ اس کی پکڑ کا خوف ہو۔ اس سے ملاقات کا شوق ہو۔ اس کے رسول کی محبت ہو۔ اس کے دین کی حمیت ہو۔ اس کی فردوس کی رغبت ہو۔ بس یہی ...... بس یہی دل چاہیے۔

لوگ ٹوٹی ہوئی چیزیں پھینک دیتے ہیں۔ مگر خدا ٹوٹے ہوئے دل کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ اتنا زیادہ کہ اس کے بدلے میں اپنی سب سے بڑی نعمت — فردوس کی ابدی بادشاہی — دینے کے لیے تیار ہے۔ مگر کیا کیجیے کہ آج لوگوں کے پاس ساری دینداری ہے...... یہی ٹوٹا ہوا دل نہیں۔

خدا کی ذات پر ایقان کر کے دیکھتے ہیں

ہمارے ہاں چھوٹے بچوں کو چلنا سکھانے کے لیے ایک خاص طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس طریقے کے مطابق جب بچہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو سکے تو ہم اسے دیوار کے سہارے کھڑا کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے ذرا دور ہٹ کر دونوں ہاتھ اس کی طرف پھیلا کر اسے اپنی طرف بلاتے ہیں۔ بچے کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ ہم اسے گود میں لے لیں۔ لہٰذا وہ یہ سمجھ کر کہ ہم اسے گود میں لینا چاہتے ہیں، اپنا سہارا یعنی وہ دیوار جس سے ٹیک لگا کر وہ کھڑا ہوتا ہے، چھوڑ دیتا ہے اور ہماری طرف بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں اس کے نو آموز قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ لیکن ہم تک پہنچنے کی خواہش میں وہ ایک کے بعد دوسرا قدم زمین پر ٹکا کر اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ شروع شروع میں وہ بمشکل ایک دو قدم ہی اٹھا پاتا ہے مگر آہستہ آہستہ اسے اپنا توازن برقرار رکھنا آ جاتا ہے اور وہ خود اپنے قدموں پر چل کر ہمارے پاس آنے لگتا ہے اور یوں وہ چلنا سیکھ لیتا ہے۔

اس عمل کے دوران میں آج تک ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے بچے کو بانہیں پھیلا کر اپنی طرف بلایا ہو اور جب اس نے اپنا سہارا چھوڑ دیا ہو تو ہم نے اسے گرنے دیا ہو۔ جب تک بچہ چل سکتا ہے، ہم اسے چلنے دیتے ہیں اور خود پیچھے ہٹتے چلے جاتے ہیں، مگر جس لمحے بچہ گرنے لگتا ہے، ہم آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا مقصد بچے کو گرانا، اسے تکلیف دینا نہیں، بلکہ چلنا سکھانا ہوتا ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس کے ذریعے سے ہم خدا اور بندے کے تعلق کو سمجھ سکتے ہیں۔ وہ تعلق جو اس وقت شروع ہوتا ہے جب اس کائنات کا رب ایک کمزور بندے کو اپنی طرف بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ بندہ اس ربِ کریم کی پکار پر لبیک کہہ کر آگے بڑھتا ہے۔ وہ راہِ وفا پر قدم رکھ دیتا

ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا کی سمت چلنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنی ہر دیوار چھوڑنی ہوگی۔ خود کو بے سہارا کرنا ہوگا۔ لیکن وہ اپنے رب پر بھروسا کر کے ڈگمگاتا ہوا، لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب دنیا والے اسے احمق خیال کرتے ہیں۔ اس کی کم عقلی پر ماتم کرتے ہیں۔ اسے ملامت کرتے ہیں۔ لیکن اس کی نگاہوں میں تو اس کا رب ہوتا ہے۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ ہوتے ہیں۔ اسے اعتماد ہوتا ہے کہ یہ اٹھے ہوئے ہاتھ اتنے کمزور نہیں کہ اسے سنبھال نہ سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ عالم اسباب خدا نے انسانوں کی آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے۔ لیکن یہاں اسباب کی ڈوریاں بھی وہی ہلاتا ہے اور آزمائش کی بساط بھی وہی بچھاتا ہے۔ ایسا اس کی صفتِ علم و حکمت کے تحت ہی ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو زمانے کے سرد و گرم سے آزماتا ہے اور اپنے نیک بندوں کو تو کچھ زیادہ ہی آزماتا ہے۔ کبھی ان کے کھوٹ دور کرنے کے لیے، کبھی جنت میں ان کے درجات بلند کرنے کے لیے اور کبھی دنیا کے سامنے ایک نمونہ پیش کرنے کے لیے۔ تاہم اس آزمائش کی ایک حد ہوتی ہے، اس حد کا انحصار خدا پر نہیں، بلکہ بندے پر ہوتا ہے۔ اس کی بلندی شوق پر ہوتا ہے۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ اسے راہِ حق میں کانٹا بھی نہ چبھے اور کوئی موسیٰ کے مقابلے میں آنے والے جادوگروں کی طرح وقت کے فرعون کے سامنے اس لیے ڈٹ جاتا ہے کہ اسے موت کی شکل میں خدا کی رحمت بالکل سامنے نظر آ رہی ہوتی ہے۔

خدا ہر شخص کو جنت کی طرف پکارتا ہے مگر اس کی یہ جنت بے قیمت نہیں۔ اس راہ میں طرح طرح کے اندیشے ستاتے ہیں۔ قدم قدم پر مشکلات کے پہاڑ سامنے آجاتے ہیں۔ بے یقینی کے مہیب سائے بار بار انسان کو گھیر لیتے ہیں۔ ایسے میں خدا پر توکل ہی اسے آگے بڑھاتا ہے۔ خدا کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی کشش اسے آخری دم تک خدا کی طرف بڑھتے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ مگر جس لمحے اس کے قدم اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیتے ہیں، وہاں عرش کا مالک خود فرش پر

آتا ہے اور گرنے سے پہلے اسے سنبھال لیتا ہے۔ یہ راہِ خدا ہے تماشا نہیں ہے۔اس کا اصول یہ بھی ہے کہ انسان خود کو برباد کرے اور اس کا اصول یہ بھی ہے کہ خدا بندے کو برباد نہ ہونے دے۔

آج انسانیت کو کچھ ایسے ہی صاحبان دل اور صاحبان شوق درکار ہیں جو خدا کے لطف و عنایت کی امید پر خود کو برباد کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ خدا کی شانِ کریمی ایسا نہ ہونے دے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس کے پیغام اور اس کے دین کی دعوت کو دوسروں تک پہنچانا اپنی زندگی کا مشن بنالیں۔ جو سچائی اور حق کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کریں۔ جو خواہش اور مفاد سے اوپر اٹھ کر جنت کی نعمتوں کو دیکھ سکیں۔ جو فرقہ واریت، تعصب اور انتہا پسندی سے اوپر اٹھ کر علم و عقل کے مسلمات کی بنیاد پر قرآن و سنت سے دین سمجھیں اور دوسروں کو اسے سمجھانا اپنا نصب العین بنالیں۔

خدا نے قرآن میں اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ اپنی راہ میں مشقت جھیلنے والوں کو اپنی راہ ضرور دکھائے گا۔اب انسانوں میں سے کوئی ہے جو یہ کہتا ہوا اپنی دیوار چھوڑ دے......خود کو بے سہارا کر دے:

سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں

انسان کو ہمیشہ اس کی تقدیر ملتی ہے
مگر اس تقدیر تک انسان کو چل کر جانا پڑتا ہے

تو تو ہے، میں میں ہوں

خلافت راشدہ کے بعد عربوں کی دو عظیم حکومتیں قائم ہوئیں۔ ایک کا تعلق بنوامیہ سے تھا اور دوسری کا بنوعباس سے۔ بنوعباس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کی اولاد میں سے تھے۔ عباسی خاندان نے پانچ صدیوں تک حکومت کی۔ تہذیب وتمدن، علم وحکمت، قوت واقتدار، غرض ہر اعتبار سے ان کے دور میں اسلامی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔

عباسی خاندان کا سب سے بڑا خلیفہ ہارون الرشید تھا۔ اس کے اقتدار کی عظمت کا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ دارالخلافہ بغداد میں خشک سالی ہوگئی۔ ایک روز خلیفہ اپنے محل کی چھت پر کھڑا تھا کہ ابر چھا گیا، مگر بادل برسے بغیر آگے چلا گیا۔ یہ دیکھ کر ہارون رشید نے کہا: اے بادل تو جہاں چاہے جا کر برس، تیری پیداوار کا خراج میرے ہی پاس آئے گا۔

ہارون رشید اپنی ذاتی زندگی میں ایک صالح آدمی تھا۔ اس کی ایک دعا اس طرح نقل ہوئی ہے۔

یا رب انت انت و اناانا۔ انا العواد بالذنب و انت العواد بالمغفرۃ۔فاغفرلی

اے میرے رب! تو تو ہے اور میں میں ہوں۔ میں بار بار گناہ کرتا ہوں

اور تو بار بار بخشنے والا ہے۔ پس مجھے بخش دے۔

اس دنیا میں ساری بڑائی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ کسی انسان کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ اس کی دی ہوئی بھیک سے ہر آدمی پل رہا ہے۔ اس کی بخشی ہوئی پناہ میں ہر آدمی جی رہا ہے۔ یہ حقیقت اگر انسان کو یاد رہے تو خدا اس کی ہر امید اور ہر خوف کا محور بن جائے گا۔ وہ سب سے بڑھ کر اس سے محبت کرے گا اور سب سے زیادہ اسی سے ڈرے گا۔ اپنے بشری تقاضوں کی بنا پر اس انسان سے کوئی غلطی تو ہوسکتی ہے، مگر یہ غلطی کبھی سرکشی اور بے نیازی میں نہیں بدل سکتی۔

رب کی عظمت اور اس کے سامنے اپنے بے وقعت ہونے کا احساس اگر زندہ ہے تو انسان بادشاہ بن کر بھی غافل نہیں رہتا۔ یہ احساس مردہ ہو جائے تو معمولی انسان بھی خود کو فرعون سمجھتا ہے۔

سکندر جب گیا دنیا سے......

سکندرِاعظم (356ق م- 323ق م) کا شمار دنیا کے عظیم ترین فاتحین میں کیا جاتا ہے۔وہ سائرس (جسے قرآن ذوالقرنین کہتا ہے) کے بعد پہلا شخص تھا جس نے تمام قدیم دنیا کو فتح کر کے اس پر اپنی حکومت قائم کی۔اس کا باپ فلپ، یونان کی ایک چھوٹی سی ریاست مقدونیہ کا حکمران تھا،مگر سکندر نے صرف چند برسوں میں اُس تمام دنیا کو زیر وزبر کرڈالا جو یونان سے ہندوستان تک لاکھوں مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے۔اس کی عظیم یوریشیائی سلطنت میں چین ہی واحد متمدن خطہ تھا جواس کی قلمرو میں شامل نہ تھا۔

سکندر کی یلغار اتنی شدید تھی کہ دارا کی عظیم ایرانی سپر پاور خس و خاشاک کی طرح اس کے سامنے بکھر کر رہ گئی۔اس کے حوصلے اتنے بلند تھے کہ رواں دریا، فلک بوس پہاڑ، عظیم صحرا، وسیع و عریض میدانی علاقے، بپھرے ہوئے سمندر، اندھیری راتیں،موسلا دھار بارش، کچھ بھی اس کا راستہ نہ روک سکے۔قدیم دنیا کے سارے خزانوں اور سارے علاقوں کا یہ مالک،صرف بتیس سال آٹھ ماہ کی عمر میں ملیریا کا شکار ہوکر،عراق کے قدیم شہر بابل میں انتقال کر گیا۔اس کے بعد جلد ہی اس کا بارہ سالہ بیٹا مار ڈالا گیا اور اس کی نسل ختم ہوگئی۔

سکندر کی زندگی اور اس کی شخصیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا نمونہ قائم کیا ہے جس میں قیامت تک انسانوں کے لیے عبرت و نصیحت کا سامان ہے۔ ہر انسان جو اس دنیا میں آتا ہے اپنے سینے میں خواہشات کا ایک طوفان لیے پھرتا ہے۔ وہ دولت ،شہرت ،حکومت اور طاقت کے پیچھے بھاگتا ہے۔کبھی وہ نامراد رہ جاتا ہے اور کبھی مقدر کا سکندر بن کر اپنی ہر خواہش پالیتا ہے۔مگر ایک عظیم حقیقت ایسی ہے جو کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ وہ یہ کہ ایک روز بہر حال اسے مرنا ہے اور اپنی آرزوؤں کی سلطنت کو چھوڑ کر اسے حقیقت کی اُس

دنیا میں جانا پڑتا ہے جس کا نام آخرت ہے۔

انسانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دنیا ہی میں اپنی جنت بنانا چاہتے ہیں۔ وہ گاڑی، بنگلہ اور سونا چاندی کو اپنا مقصود بنا لیتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ایک روز موت کو آنا ہے۔ وہ آ کر رہے گی۔ 323 ق م میں یہ سکندر کو آئی تھی اور ایک صدی کے اندر اِس وقت تک زندہ ہر انسان کو آ جائے گی۔

انسان کے لیے اہم بات یہ نہیں ہے کہ اس نے اِس دنیا میں کیا حاصل کیا۔ اسے تو ہر چیز سکندر کی طرح چھوڑ کر جانی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی ابدی زندگی کے لیے کیا لے کر جا رہا ہے۔

ایک دعا

اے اللہ! میں نے تیرے سب سے محبوب حکم میں تیری اطاعت کی، اس بات کی شہادت میں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو تنہا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیرے رسول ہیں۔ اور تیری سب سے ناپسندیدہ چیز – تیرے ساتھ کسی کو شریک کرنے سے دور ہوں۔

میرے رب! توحید اور شرک کے بیچ میں جو غلطیاں مجھ سے ہو گئی ہیں، تو انہیں معاف کر دے۔

قبر کا فقیر

پچھلے دنوں مجھے دو جنازوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ پہلا جنازہ ایک صاحب حیثیت شخص کا تھا۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے زندگی میں مادی اعتبار سے غیر معمولی کامیابیاں عطا فرمائی تھیں۔ وہ اپنے پیچھے بہت بڑا کاروبار اور وسیع و عریض گھر چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری، بچوں کی خوشیاں دیکھیں اور اپنی طبعی عمر پوری کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ جبکہ دوسرا جنازہ ایک ایسے صاحب کا تھا جن کے پاس ملازمت تھی نہ اپنا گھر۔ ڈاکٹروں نے ان کے ایک معمولی مرض کی غلط تشخیص کی۔ آپریشن ہوا۔ ان کے جسم میں انفیکشن پھیل گیا اور وہ اپنی طبعی عمر سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

یہ محض میرے جاننے والے دو افراد نہیں، بلکہ دو کردار ہیں جو آزمائش کی اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو تفویض کیے ہیں۔ غربت اور امارت، پانا اور کھونا، خوشی اور غمی، آزمائش کی اس دنیا میں امتحان کے پرچے ہیں۔ اس آزمائش میں انسان کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس نے اچھے برے حالات پیش آنے پر کیا رویہ اختیار کیا۔ اس نے اللہ اور بندوں کے حقوق کس حد تک پورے کیے۔ اس نے حق، انصاف اور احسان کا رویہ اختیار کیا یا ظلم، جہالت اور تعصب کا۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی شخص کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس پر نہیں کہ دنیا میں اس نے کیا کمایا۔ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ خود کرتے ہیں۔ وہ انسان کی مادی دنیا، اس کے جسم کی طرح، خود تخلیق کرتے ہیں۔ وہی طے کرتے ہیں کہ دنیا میں اسے کس قسم کے حالات سے گزرنا ہے۔ البتہ ایمان واخلاق کی دنیا انسان کو خود تشکیل دینا ہوتی ہے۔ یہی وہ روحانی دنیا ہے جو کل قیامت کے دن ابد تک باقی رہنے والی ایک مادی دنیا میں بدل جائے گی۔

انسان جب اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو پیدائش کے وقت کی طرح، ایک دفعہ پھر غربت و امارت کے سارے فرق مٹ جاتے ہیں۔ ہر انسان کے پاس پہننے کو صرف کفن کا اور رہنے کو محض قبر کا گڑھا رہ جاتا ہے۔ قبر کا یہ گڑھا پکار پکار کر ہر انسان کو بتاتا ہے کہ مادی دنیا میں خالی ہاتھ آنے والا انسان، خالی ہاتھ ہی دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ ہاں جو چیز ساتھ جاتی ہے وہ حسن عمل کا سرمایہ ہے۔ جس کے پاس یہ سرمایہ ہے وہ قبر میں بھی امیر ہے۔ جس کے پاس یہ نہیں وہ قبر میں فقیر ہے۔ اور قبر کا فقیر دنیا کا سب سے بدنصیب فقیر ہوتا ہے۔

مسجد کا ماحول

مساجد اللہ کا گھر ہیں۔ یہاں ہر روز مسلمان دن میں پانچ دفعہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔فرض نمازیں جماعت سے ادا کرنے کی بہت فضیلت آئی ہے۔بعض روایات میں جماعت کی نماز کو فرد کی نماز سے 27 گنا افضل قرار دیا گیا ہے۔(بخاری: رقم 619)

مسجد میں پڑھی جانے والی نماز عام نماز سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ یہ انسان کو اس کے مادی ماحول سے کاٹتی ہے اور مسجد کے روحانی ماحول میں لے جاتی ہے۔ یہ ماحول مختلف طریقوں سے انسان کی تربیت کرتا ہے۔

انسان اپنے گھر، دکان، دفتر سے اٹھتا ہے اور مسجد کی سمت روانہ ہوتا ہے۔ اپنی جگہ چھوڑنا اور مسجد کی طرف جانا اپنی ذات میں ایک اعلیٰ درجہ کا خداپرستانہ عمل ہے جس میں ہر قدم پر انسان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ درحقیقت وہ اللہ کا بندہ ہے اور اسے لوٹ کر اپنے رب کے حضور جانا ہے۔

مسجد میں نماز کے انتظار میں اسے بیٹھنا پڑتا ہے۔ یہ تنہائی اور خاموشی کا وقت ہوتا ہے۔ انسان اپنے روٹین کی روزمرہ زندگی اور معمولات میں غور وفکر کا کوئی وقت نہیں پاتا۔مگر مسجد میں اسے نماز کی عبادت کے ساتھ غور وفکر کی عظیم عبادت بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ وہ اس دوران میں اللہ کا ذکر کرتا اور کائنات میں پھیلی اس کی نشانیوں پر غور کرتا ہے۔اسے احساس ہوتا ہے کہ جس طرح اس لمحے لوگ بظاہر بے مصرف اور خاموش بیٹھے، مگر درحقیقت اللہ کی یاد میں مشغول ہیں، اسی طرح کائنات میں موجود مخلوقات کا ہجوم اپنی خاموش زبان میں رب کی حمد اور تسبیح بیان کرتا ہے۔اسے اپنے رب کی عظمت کا احساس ہو جاتا ہے جو ان تمام مخلوقات کا خالق ہے۔

مسجد میں بہت سے لوگوں کے ساتھ جماعت کی نماز ادا کی جاتی ہے۔جس میں ہر شخص ایک امام کی پیروی کرتا ہے۔اس سے نمازی کو یہ سبق ملتا ہے کہ انسانوں کو اپنے اپنے اختلافات کے باوجود ایک ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب سب لوگ اپنے آپ کو ایک ڈسپلن کے حوالے کر دیں۔

مسجد سے واپسی پر وہ یہ احساس لے کر جاتا ہے کہ وہ ابھی سر سے پاؤں تک جسم کے ہر حصے کو خدا کے سامنے جھکا کر اس سے اطاعت کا عہد کر کے آیا ہے۔اس لیے مسجد سے باہر آتے ہی وہ اطاعت کا یہ عہد نہیں توڑ سکتا۔اس طرح نماز اسے مسجد سے باہر بھی رب کا بندہ بنائے رکھتی ہے۔

قبر کی پکار

نماز جنازہ میں شرکت کرنا ہماری روایت ہے۔ یہ مرنے والے کے حقوق میں سے ایک حق ہے جو ہر قریبی شخص پر عائد ہوجاتا ہے۔اس روایت کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ دنیا سے جانے والے ایک بھائی کو عزت واحترام سے رخصت کیا جائے اور رب کے حضور پیشی کے وقت دعاؤں کی سوغات اس کے ہم رکاب کی جائے۔

مرنے والے اوراس کے لواحقین سے گہرا تعلق رکھنے والے لوگ نمازِ جنازہ کے بعد قبرستان تک ساتھ جاتے ہیں۔ وہ جنازے کو کندھا دیتے ہیں۔ اپنے بھائی کو قبر میں اتارتے وقت موجود رہتے ہیں۔اس کی قبر پر مٹی ڈالتے ہیں اور واپسی سے پہلے ایک دفعہ پھر رب کے حضور اس کی خطاؤں پر درگزر کی درخواست کرتے ہیں۔

اس پورے عمل کا ایک بہت بڑا فائدہ ان لوگوں کو بھی ہوتا ہے جو جنازے کے ہمراہ ہوتے ہیں۔ انسان زندگی کی گہما گہمی میں موت کی تلخ حقیقت کو فراموش کیے رہتا ہے۔مگر جنازے میں شرکت کا یہ عمل اسے موت کے ناگزیر سامنے کی یاددہانی کرادیتا ہے۔اسے یاد آجاتا ہے کہ یہ مرنے والا اسی طرح پیدائش، نکاح، معاش اور زندگی کے دیگر معاملات سے گزرا جس طرح وہ گزر رہا ہے۔مگران سب کے باوجود جس طرح موت نے مرنے والے کو آدبوچا، اس کا وقت بھی جلد ہی آنے والا ہے۔

مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ عین جنازہ اور دفن کے مناظر کے وقت بھی ان کی توجہ دنیا کی طرف لگی رہتی ہے۔کوئی میت کے حالات پر گفتگو کرتا ہے،کوئی سیاست کو موضوع بحث بناتا ہے۔کسی کو قبرستان میں امریکی سازشیں یاد آجاتی ہیں اور کوئی قبرستان کی حالت زار کا رونا رونے لگتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ عزیزوں ، رشتہ داروں سے ملنے کا نادر موقع ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے کاروباری حالات اور خاندانی معاملات پر گفتگو شروع کردیتے ہیں۔

جو لوگ بہت زیادہ بولتے ہیں وہ سنتے نہیں ہیں۔ ورنہ اگر سننے والے کان ہوں تو اُس وقت وہ قبر کی پکار کو ضرور سنیں گے جو چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاتی ہے کہ اے غافلو! میرے پاس آئے ہو تو لمحہ بھر کے لیے سہی، اِس دنیا کو چھوڑ کر اُس دنیا کو یاد کرلو۔ میں آخرت کا دروازہ ہوں۔ یہ دروازہ آج تمہارے بھائی پر کھلا ہے۔بہت جلد یہ تمہارے لیے کھول دیا جائے گا۔

خدا کی جنگ

مسلمانوں کی تاریخ کے کئی ادوار ہیں۔ایک دور وہ تھا جس میں امت کی قیادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ خلافت راشدہ کا دور تھا۔ دین حق کا غلبہ تھا۔ زمین پر وہ عدل تھا کہ آسمان والے بھی داد دیتے تھے۔ زمین والوں نے بھی یہ دیکھ لیا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایمان لانے کی جزا دیتے ہیں تو زمین کا اقتدار کیسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔اسی طرح روزِ قیامت دنیا کا اقتدار اور جنت کی بادشاہی، ابدی طور پر اللہ کے نیک بندوں کے حوالے کر دی جائے گی۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْض

يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْن (الانبیا105:21)۔

یہ دنیا انعام کی نہیں آزمائش کی جگہ ہے۔اس لیے جلد ہی خلافت راشدہ کا دور ختم ہو گیا۔ یہ ایک عظیم سانحہ تھا مگر اس کے باوجود مسلمانوں کے عروج کا سورج آنے والے دنوں میں مزید بلند ہوا۔ بنو امیہ کے دور میں برعظیم ہند اور براعظم یورپ میں مسلمانوں کے قدم جا پہنچے۔ چین کی عظیم سلطنت نے مسلمانوں کو خراج ادا کرنا شروع کر دیا۔ بنو عباس کے دور میں مسلمانوں کو ایک دھچکا یہ لگا کہ مسلم امہ کی وحدت باقی نہ رہی اور اندلس میں بنو امیہ کی الگ حکومت قائم ہو گئی۔ تاہم اس کے باوجود مسلمانوں کی عظمت وسطوت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایک طرف مسلمانوں کی پیش قدمی فرانس کے قلب تک جا پہنچی اور دوسری طرف عیسائی دنیا قسطنطنیہ کی مضبوط فصیلوں اور رومی حکومت کے کمزور سائے میں بمشکل چھپی، مسلمانوں کی یلغار کو خائف نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

مسلمان ذرا کمزور ہوئے تو عیسائی دنیا نے اپنی پوری قوت کے ساتھ نبیوں کی سرزمین–شام و فلسطین–پر حملہ کر دیا۔ مگر مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہی یورپ بھر کی قوتوں کا مقابلہ کرنے

میں کامیاب ہوگئیں۔ دوسو برس بعد انہیں ذلت آمیز طریقے سے اسلامی مما لک سے رخصت ہونا پڑا۔ مسلمان اس مغربی یلغار کو سہہ گئے مگر مشرق سے اٹھنے والے تا تاریوں کے ٹڈی دل نے مسلم اقتدار کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ صدی بھر کو تو یوں لگا کہ مسلمانوں کی تاریخ اگر ختم نہیں ہوئی تو کم ازکم ان کی عظمت کا چراغ ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا ہے۔ مگر ایسے میں دینِ اسلام کی دعوتی قوت حرکت میں آئی ۔تا تاری جو مسلمانوں کے فاتح تھے، اسلام سے مغلوب ہوگئے۔ان نئے مسلمانوں نے آنے والوں دنوں میں ایسی عظیم سلطنتیں قائم کیں کہ مسلمان نہ صرف بغداد بلکہ غرناطہ کا غم بھی بھول گئے۔ خاص طور پر عظیم عثمانی سلطنت نے جو چھ سو سال تک تین براعظموں ایشیا، افریقہ اور یورپ میں تنہا سپر پاور تھی، مسلمانوں کی عظمت کا علم اٹھائے رکھا۔

انیسویں صدی میں مغربی اقوام سائنس اور ٹیکنالوجی کے اسلحے سے لیس ہوکر یورپ سے نکلیں اور دنیا بھر پر چھا گئیں۔ مسلمانوں کی دنیا اب یورپی اقوام کی دنیا تھی۔ نئی زبان، نئے تمدن اور نئی فکر کے اس دور میں مسلمان مغلوب ہوگئے۔ مسلمانوں کے اس زوال پر اب کم وبیش دوسو برس گزر چکے ہیں۔ محرم کے مہینے میں جب سال نو کا آغاز ہورہا ہے تو طلوع ہوتے ہوئے نئے سورج کا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کا زوال کب تلک جاری رہے گا؟

اس سوال کا جواب ہمارے اس عظیم ماضی میں پوشیدہ ہے جس کی ایک جھلک چند سطروں میں ہم نے قلمبند کی ہے۔ ہمارا ماضی یہ بتا تا ہے کہ چاہے قریش مکہ کا ظلم ہو یا تا تاریوں کا فساد، یہ اسلام کی دعوتی طاقت ہے جو مایوسی اور نا امیدی کے ہر موڑ کے بعد امید کی راہ کھول دیتی ہے۔ مکہ میں جب ظلم کی رات نا قابل برداشت حد تک طویل ہوگئی تو سحر، انصارِ مدینہ کے قبول اسلام کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اسی طرح تا تاریوں کے سیلابِ بلا خیز کو اسلام کی دعوتی طاقت نے ایک ایسے پرسکون دریا میں بدل دیا جو صدیوں تک عالم اسلام کی بنجر زمینوں کو زرخیز کرتا رہا۔

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے　　　پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

دوسو برس کی مسلسل شکستوں کے بعد آج بھی اگر کوئی امید ہے تو اسلام کی اسی تسخیری قوت سے ہے جو ہر دور کی فاتح ہے۔ شرط یہ ہے کہ مسلمان صبر کرنا سیکھ لیں۔ صبر کے بغیر کوئی دعوتی عمل ممکن نہیں ہوسکتا۔ صبر کرنا بزدلی کی علامت نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا عمل ہے جس کا اجر وہ بغیر حساب عطا کرے گا۔ دعوت کے لیے صبر اس لیے ضروری ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ آپ بیک وقت اپنے مدعو سے جنگ بھی کر رہے ہوں اور اسے اسلام کی دعوت بھی دے رہے ہوں۔ دعوت اصلاً ایک مظلومانہ جدوجہد ہے۔ یہ ظلم کے باوجود کی جاتی ہے۔ اس میں مخاطب کے مقابلے سے ہٹنا پڑتا ہے۔ مگر یہ پسپائی اپنے مقابل سے ہار جانے کا نہیں اسے جیت لینے کا نام ہے۔

آج مسلمان دوسروں سے اپنی قومی جنگ لڑ رہے ہیں۔ وہ ہر اعتبار سے کمزور ہیں۔ اس لیے دوسو برس سے پٹ رہے ہیں۔ جب وہ لوگوں کو دین حق کی دعوت دیں گے تو وہ خدا کی جنگ لڑیں گے۔ خدا سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ جو خدا کی سمت کھڑا ہو کر اس کی جنگ لڑے گا، فتح ہر حال میں اس کا مقدر ہے۔ یہی قرآن کا پیغام ہے۔ یہی تاریخ کا سبق ہے۔ یہی سال نو کے طلوع ہوتے ہوئے سورج کے ہر سوال کا جواب ہے۔

تیری مانند کون ہے؟

ایک برتر ہستی سے محبت کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ انسان چاہے نہ چاہے، وہ کسی نہ کسی کو اپنا معبود بنانے پر مجبور ہے۔ مگر معبود بننے کے لائق صرف ایک ہی ہستی ہے۔ اللہ، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

انسان کا المیہ دیکھیے کہ اس نے اپنی تاریخ میں کبھی اللہ تعالیٰ کو قابل توجہ نہیں سمجھا۔ ہر دور میں اس نے رب کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرایا ہے۔ پھر خدا کو غیر اہم جان کر انہی کی حمد کی ہے۔ انہی کی عظمت کے گن گائے ہیں۔ انہی سے مدد مانگی ہے۔ انہی کے سامنے سر جھکایا ہے۔ انہی سے محبت کی ہے۔ انہی کے لیے روئے ہیں۔ انہی کے لیے تڑپے ہیں۔ انہی کا اعتراف کیا ہے۔ انہی کے شکر گزار بنے ہیں۔ انہی کے لیے محبت اور انہی کے لیے نفرت کی ہے۔ انہی کے نام کو آنکھوں کی روشنی اور انہی کی یاد کو زبان کی مٹھاس بنایا ہے۔

یہ سب تو اللہ کا حق ہے ۔ ہر دور میں تھا۔ ہر دور میں رہے گا۔ غیر اللہ کی عبادت اور حمد کرنے والے یہ لوگ، انبیائے بنی اسرائیل کے الفاظ میں، اُس عورت کی مانند ہیں جو اپنے شوہر کو چھوڑ کر دوسرے مردوں کے ساتھ بدکاری کرتی ہے۔ اس کے برعکس اللہ کے رسولوں کا طریقہ یہ ہے کہ ان کا جینا مرنا سب اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ وہ ہر مشکل میں اسی پر بھروسہ کرتے اور ہر کامیابی پر اسی کی حمد کے ترانے پڑھتے ہیں۔ ہمارے پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے عرب پر غلبہ کے بعد صفا پہاڑ پر چڑھ کر اللہ تعالیٰ کی جو حمد کی، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، بادشاہی اسی کی ہے اور حمد بھی اسی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ (مسلم، رقم 1218)

اللہ تعالیٰ نے فرعون کو جب غرق کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو سمندر سے

سلامتی کے ساتھ گزار دیا تو اس موقع پر حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کی انتہائی خوبصورت انداز میں حمد وثنا کی۔اس حمد کا ایک جملہ یہ ہے۔

''معبودوں میں اے خداوند، تیری مانند کون ہے''۔(خروج 15:11)

ان دونوں پیغمبروں کی ذات رہتی دنیا تک اس بات کا بھی نمونہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے کیسے ہوتے ہیں اور اس بات کا بھی کہ ایسے وفاداروں کو وہ کس طرح نوازتا ہے۔مگر اس کی عطا اسی پر بس نہیں، وہ تو ایسا کریم ہے کہ لوگوں کو غیر اللہ کی پرستش کرتے دیکھتا ہے، پھر بھی ان پر اپنی نعمتوں کے دروازے بند نہیں کرتا۔

وفاداروں کو دینے والے تو بہت ہوتے ہیں، مگر بے حیا اور بے وفا لوگوں پر رحم کرنے والی ایک ہی ہستی ہے؛ اللہ جس کے سوا کوئی رب نہیں۔وہ جب اپنے وفاداروں کو نوازے گا تو دنیا دیکھے گی۔سو اب جو جس کو چاہے اپنی وفا کا مرکز ومحور بنالے۔نبیوں کے طریقے پر چلنے والے، مرتے دم تک خدا کی محبت سے سرشار، یہی کہتے رہیں گے۔

معبودوں میں اے خداوند، تیری مانند کون ہے؟

شیرون اور فرعون

اریئیل شیرون اسرائیل کے وزیراعظم ہیں۔اسرائیل کوعظیم سے عظیم تر بنانا ان کا مشن اور فلسطینیوں کا قتلِ عام ان کا شغل رہا ہے۔بقول ان کے، وہ فلسطینیوں کو ناشتے میں چٹ کر جاتے ہیں۔دنیا بھر میں ان کی شہرت اس وقت ہوئی جب صابرہ اور شتیلہ کے کیمپوں میں،ان کے زیر نگرانی،انتہائی وحشت اور درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا۔

حال ہی میں شیرون کی طبعیت خراب ہوئی اور ۷۷ سال کی عمر میں ان پر فالج کا اٹیک ہوا۔وہ مفلوج ہوکر کومے میں چلے گئے اور دنیا کے سامنے بے کسی کی تصویر بنے پڑے ہیں۔کافی عرصے سے وہ اسی حال میں ہیں اور ڈاکٹر ان کی جان بچانے کی کوشش میں ہیں۔ان کے متعلق حال ہی میں یہ اطلاع آئی ہے کہ انہوں نے لمحے بھر کے لیے اپنی آنکھیں کھولیں تو ان میں آنسو تھے۔

یہ سن 2006 کا شیرون ہے۔اب آیئے 3500 سال قبل کے فرعون کی طرف۔قرآن پاک میں بیان ہوا ہے کہ فرعون نے ساری زندگی اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی۔بنی اسرائیل کو اس نے بدترین عذاب دیے۔آخر کار اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت موسیٰ ؑ نے اپنی قوم کے ساتھ ہجرت کی۔فرعون اور اس کے لشکر نے ان کا تعاقب کیا۔راستے میں سمندر آ گیا۔اللہ کے حکم سے سمندر حضرت موسیٰ ؑ کے لیے دو حصوں میں تقسیم ہوگیا اور وہ اس کے پار گزر گئے۔فرعون اور اس کے لشکر نے تعاقب کی کوشش کی،مگر ان کے پار ہوتے ہی سمندر کا پانی آپس میں مل گیا۔فرعون ڈوبنے لگا تو موت کو سامنے دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔اس نے کہا کہ وہ موسیٰ ؑ کے رب پر ایمان لے آیا۔مگر اس وقت اس کا ایمان لانا بے فائدہ ہو چکا تھا۔

موت زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے،مگر انسان اسے بھولے رہتا ہے۔اس کی صحت، طاقت، دولت اسے اس غلط فہمی میں ڈال دیتی ہے کہ کبھی اس کی پکڑ نہیں ہوگی۔وہ زندگی بھر

شیرون اور فرعون بن کر جیتا ہے۔ وہ لوگوں پر ظلم کرتا ہے۔ رب کی نافرمانی کرتا ہے۔ مگر ایک روز اللہ تعالیٰ اس کی مہلتِ عمر سلب کرتے ہیں اور وہ ایک حقیر چوہے کی طرح موت کے شکنجے میں جکڑا جاتا ہے۔ اس وقت وہ سراپا عجز بن جاتا ہے۔ مگر اس وقت کا عجز بے معنی ہے۔ اس وقت کی توبہ بے معنی ہے۔ توبہ وہ ہے جو زندگی میں کی جائے۔

عقلمند انسان وہ ہے جو اس بات کو زندگی میں سمجھ لے۔ وگرنہ موت کی بے کسی ہر کسی پر طاری ہونی ہے۔ موت ہر فرعون کا انجام ہے۔ موت ہر شیرون کا انجام ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا

اَللّٰھُمَّ، اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَّا یَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَّا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَۃٍ لَّا یُسْتَجَابُ لَھَا۔

''اے اللہ، میں تیری پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے اور ایسے دل سے جس میں خشوع نہ ہو اور ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو اور ایسی دعا سے جو قبول نہ ہو۔''

فحش سائٹس اور ہمارے نوجوان

انٹرنیٹ دورِ جدید کی ایک بہت مفید اور کارآمد ایجاد ہے۔ یہ نہ صرف معلومات کا ایک خزانہ ہے بلکہ مواصلات کے شعبے میں بھی اس نے ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ پر ہر طرح کی معلومات بہت آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ اس کے ذریعے سے لوگ اپنے دور دراز عزیزوں سے باآسانی رابطہ کر سکتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس نے بڑی حد تک لائبریری اور ڈاک کے نظام کی جگہ لے لی ہے۔

پاکستان میں انٹرنیٹ دس سال قبل متعارف ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ ملک میں انٹرنیٹ فراہم کرنے والی کمپنیوں کی تنظیم 'اسپاک' کے اعداد و شمار کے مطابق اس وقت ملک میں انٹرنیٹ کے صارفین کی کل تعداد چوبیس لاکھ سے زائد ہو چکی ہے۔ امید ہے کہ آنے والے دنوں میں یہ تعداد کئی گنا بڑھ جائے گی۔

اس حوالے سے یہ امر بے حد تشویشناک ہے کہ پاکستان میں انٹرنیٹ کے بیشتر صارفین اسے فحش اور عریاں ویب سائٹس تک رسائی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ محض اندازہ نہیں، مذکورہ بالا تنظیم 'اسپاک' کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں انٹرنیٹ استعمال کرنے والے بیشتر لوگوں کا پسندیدہ شغل، فحش اور عریاں ویب سائٹ دیکھنا ہے۔

یہ صورتحال ہر باشعور شخص کے لیے باعث تشویش ہے۔ باخبر لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ یہ تنہا پاکستان کا مسئلہ نہیں بلکہ پوری دنیا اس مسئلے سے پریشان ہے۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ فحش ویب سائٹس ہی دیکھی جاتی ہیں۔ ان سائٹس پر باقاعدگی سے جانے والے لوگ، دنیا کی نظر سے چھپ کر، انٹرنیٹ کی تاریک گلیوں میں آوارہ پھرتے رہتے ہیں۔ یہ آوارگی ان کی عادت بن کر قلب و نظر کو ناپاک کر دیتی ہے۔ اس کے بعد زندگی دو میں سے کسی ایک راستے کی طرف مڑ جاتی ہے۔ یا تو انسان حلال و حرام کی ہر تمیز کو فراموش کر کے زنا کی وادی قدم رکھ دیتا ہے یا پھر شادی کا جائز راستہ کھلنے کے بعد بھی تا عمر پورنوگرافی کے نشہ کا عادی بنا رہتا ہے۔

ہماری سوسائٹی کا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے غلط رویوں، نظریات اور بعض حالات کی بنا پر شادی کی بنیادی ضرورت کو، نوجوانوں کے لیے ناقابل رسائی بنادیا ہے ۔جبکہ دنیا بھر میں یا تو مناسب عمر میں نوجوانوں کی شادی ہو جاتی ہے یا پھر شادی کیے بغیر نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ساتھ رہنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔'اسپاک' کی اس رپورٹ کے ذریعے سے پوری سوسائٹی کو یہ پیغام مل گیا ہے کہ یا تو لوگوں کے لیے نکاح کے جائز راستے کو کھول دیا جائے یا پھر سوسائٹی کی تباہی کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

اس پیغام کا پس منظر یہ ہے کہ جن مغربی ممالک میں نکاح کے بغیر مرد و زن کا تعلق عام بات ہے، ان کے ہاں یہ کوئی اخلاقی خرابی نہیں ہے۔ان کے ہاں کی بلیو فلمیں ہوں یا فحش ویب سائٹس، اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کو ان سے دور رکھا جائے باقی لوگ آزاد ہیں کہ جو چاہیں کریں۔مگر ہمارے ہاں حیا اور عفت بنیادی اقدار ہیں۔اسی طرح اخلاقی بحران کے اِس دور میں خاندان کا ادارہ ہماری واحد معاشرتی ڈھال ہے۔زنا اور بے حیائی کے فروغ سے یہ اقدار اور یہ ادارہ ختم ہو جائے گا۔

انٹرنیٹ پورنوگرافی کا کوئی حل ابھی تک جدید دنیا دریافت نہیں کرسکی ہے۔سعودی عرب اور سنگاپور جیسے ممالک نے سنسر شپ کے ذریعے سے اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔مگر تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اس طرح کا حل بہت زیادہ مؤثر نہیں ہوسکا ہے۔ہمارے ہاں بھی سنسر شپ کی کوشش کی گئی مگر اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوسکا۔ بلکہ جیسا کہ رپورٹ سے ظاہر ہے کہ جتنے زیادہ انٹرنیٹ کو استعمال کرنے والے بڑھیں گے اتنے ہی زیادہ فحش سائٹس پر وزٹ کرنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی۔

اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ والدین اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں۔وہ بچوں کی تربیت کو اپنا مسئلہ بنائیں۔ان کو وقت کی رفتار کے حوالے نہ کریں بلکہ زندگی کے ہر سرد و گرم میں ان کی کریں۔بچوں کے شعور میں حیا اور عفت کی اہمیت واضح کریں۔ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔کسی غلطی کی صورت میں نرمی اور محبت سے ان پر یہ واضح کریں کہ یہ چیزیں ہماری اقدار کے خلاف ہیں۔جب بچے بڑے ہو جائیں تو ایک مناسب عمر میں ان کی شادی کو اپنی ترجیحات میں بہت اوپر رکھیں۔یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم اس مسئلے کو حل کرسکتے ہیں۔

وہ آگ جس نے جلا دیا

کچھ عرصہ قبل کراچی کے علاقے ،گلشنِ اقبال میں ایک اندوہناک سانحہ پیش آیا۔ یہاں واقع فائیو اسٹار اپارٹمنٹ کے ایک فلیٹ کے مکین، اے سی کی ٹھنڈی ہوا میں سونے کے لیے لیٹے۔ رات گئے شارٹ سرکٹ ہوا اور پورے گھر میں آگ پھیل گئی۔ ان لوگوں نے گھر سے نکلنے کی سرتوڑ کوشش کی، مگر آگ کی تپش نے باہر نکلنے کی ہر کوشش ناکام بنادی۔ ان کی چیخیں سن کر اہلِ محلّہ بھی مدد کو آئے، مگر چوروں کو روکنے کے لیے لگائی گئی لوہے کی جالیوں نے ان کی راہیں بھی مسدود کر دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلوں نے اس گھر میں موجود چھوٹے بڑے تمام آٹھ افراد کو نگل لیا۔

اس واقعہ پر نہ صرف اس علاقے ، بلکہ شہر بھر میں کہرام مچ گیا۔ ہر آنکھ اس دردناک واقعے پر اشک بار تھی۔ اخبارات اور میڈیا مختلف اداروں کو اس سانحے کا ذمے دار ٹھہرا رہے تھے۔ جبکہ یہ ادارے روایت کے مطابق حادثے کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالنے میں مصروف تھے۔ ایک ہفتہ کی تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ آگ لگنے کا بنیادی سبب یہ تھا کہ فلیٹ کے مکینوں نے بجلی چوری کر کے دو اے سی لگا رکھے تھے۔ لوڈ زیادہ ہونے کی بنا پر شارٹ سرکٹ ہوا، جس سے لگنے والی آگ نے پورے فلیٹ کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ یوں ٹھنڈی ہوا میں سونے والے تھوڑی ہی دیر میں گرم شعلوں کا لقمہ بن گئے۔

بجلی کی چوری کا یہ واقعہ جو ایک سنگین حادثہ کا سبب بنا، اپنی نوعیت کا تنہا واقعہ نہیں بلکہ ہمارے ہاں بجلی کی چوری ایک معمول بن چکی ہے۔ چوری کا یہ معاملہ اتنا بے ضرر تصور کیا جاتا ہے کہ لوگ بہت اطمینان سے ایک دوسرے کو نہ صرف بجلی چوری کی تلقین کرتے ہیں بلکہ اس مقصد کے لیے نت نئے طریقے، کارِثواب سمجھ کر بتاتے ہیں۔

چوری اور بدعنوانی کا عمل ہر دور اور ہر معاشرے میں ایک برا عمل سمجھا گیا ہے۔ مگر ہمارے ہاں اس کی برائی دلوں سے مٹتی جارہی ہے۔ اس کا سبب حکمرانوں کی بدعنوانی اور کرپشن کا وہ تذکرہ ہے جو ایک عام آدمی کو اصلاح سے مایوس کر دیتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ جب سب لوگ لوٹ مار کر رہے ہیں

تو کیوں نہ وہ بھی اپنا حصہ وصول کرے۔

تاہم یہ رویہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے بالکل غلط ہے۔ یہ طریقہ اصلاح کا نہیں بلکہ فساد کا طریقہ ہے۔ ایک غلط عمل دوسرے غلط عمل کا جواز کبھی نہیں بن سکتا۔ حکمرانوں کا ظلم اور ان کی بدعنوانی ہمارے لیے کسی چوری کا جواز مہیا نہیں کرسکتی۔ اگر اس سوچ کو درست مان لیا جائے تو پوری زمین ظلم و فساد سے بھر جائے گی۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمرانوں کے تمام تر ظلم اور خرابیوں کے باوجود، ان کی اطاعت کو لازمی قرار دیا ہے۔ اس مضمون کی بے گنتی احادیث کتابوں میں آئی ہیں۔ ہم مثال کے طور پر صرف ایک حدیث نقل کر رہے ہیں۔ فرمایا:

''تم پر لازم ہے کہ اپنے حکمرانوں کے ساتھ اطاعت کا رویہ اختیار کرو چاہے تم تنگی میں ہو یا آسانی میں اور چاہے رضا و رغبت کے ساتھ ہو یا بے دلی کے ساتھ اور اس کے باوجود کہ تمہارا حق تمھیں نہ پہنچے۔'' (مسلم، رقم 1836)

بظاہر یہ حکم ہمیں قابل عمل نہیں لگتا اور اس کے بجائے ہم ان لوگوں کی باتوں کو زیادہ درست سمجھتے ہیں جو انسان میں نفرت، غصے اور انتقام کا ذہن پیدا کرتی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کو چھوڑ کر جب ہم ان لوگوں کے پیچھے چلتے ہیں تو حکمرانوں کا محدود ظلم اور بدعنوانی نچلے طبقات میں سرائیت کر جاتی ہے اور پورا معاشرہ فساد سے بھر جاتا ہے۔ اس سوچ اور عمل سے صرف دنیا کے معاملات خراب نہیں ہوتے بلکہ آخرت میں بھی کسی شخص کے لیے برائی کا یہ عذر قابل قبول نہ ہوگا کہ اس کے حکمران برے اور ظالم تھے۔

ضروری ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ چوری کے جس عمل پر ہاتھ کاٹنے کی سزا اس دنیا میں مقرر کی گئی ہے، وہ بہت بڑا جرم ہے۔ دنیا میں چوری کی بجلی سے لگنے والی جو آگ آٹھ افراد کو جلا کر خاکستر کرگئی وہ آخرت میں ایک ایسی آگ میں بدلنے والی ہے، جس کے شعلے کبھی نہیں بجھیں گے۔ اس دن انسان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو جہنم کی اس آگ سے بچالے۔ چاہے اسے اس کے لیے اس دنیا میں مہنگی بجلی خریدنی پڑے۔ چاہے اسے بغیر اے سی کے سونا پڑے۔

It is all about happiness

طارق روڈ کراچی کا ایک بہت بڑا تجارتی مرکز ہے۔ یہاں بڑے بڑے شاپنگ سنٹرز واقع ہیں۔ شہر بھر سے لوگ کپڑے ،زیورات اور دیگر اشیا کی خریداری کے لیے یہاں آتے ہیں۔طارق روڈ کا ایک سرا شہید ملت روڈ اور دوسرا، وسطِ شہر کی سمت جاتے ہوئے، اللہ والی چورنگی پر واقع ہے۔ اللہ والی چورنگی پر جس جگہ طارق روڈ ختم ہوتا ہے، وہیں کونے پر سوسائٹی کا قبرستان ہے۔پچھلے دنوں طارق روڈ کی طرف جانے کے لیے میں اس چورنگی پر پہنچا تو سگنل سرخ ہو چکا تھا۔ میں رک کر اشارہ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ طارق روڈ کے آغاز پر ایک بلند و بالا سائن بورڈ پر نظر پڑی۔ یہ سائن بورڈ ایک بینک کا تھا جس نے اپنے کریڈٹ کارڈ کی تشہیر کے لیے سائن بورڈ پر ایک بہت ہی دلچسپ اور بامعنی جملہ لکھ رکھا تھا۔

It is all about hapiness.

یہ جملہ کوئی سادہ جملہ نہیں ہے۔ یہ دورِ جدید کے انسان کی مکمل کہانی ہے۔خوشی و راحت کا حصول ہر دور میں انسان کا مقصد اور اس کی خواہش رہی ہے۔مگر آج کے انسان کی تمام تر خوشیاں مادی چیزوں کے حصول پر منحصر ہو چکی ہیں۔ دنیا کی نعمتیں حاصل کرنا، اس کی زندگی کا نصب العین بن چکا ہے۔ وہ ان مادی خوشیوں کا ایسا اسیر ہو چکا ہے کہ جیب میں اگر پیسے نہ بھی ہوں تو وہ قرض لے کر ان مادی چیزوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پہلے زمانے میں قرض لینا آسان نہ تھا۔ چنانچہ انسان پیسہ پیسہ جوڑ کر فرج، ٹی وی اور دیگر اشیاء خریدا کرتے تھے۔مگر آج کا بینک، کریڈٹ کارڈ کے ذریعے سے،قرضہ کی یہ سہولت با آسانی فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ جیب میں اگر کریڈٹ کارڈ ہو تو ہر فرمائش اور ہر خواہش کی فوری تسکین کی جا سکتی ہے۔ دلی تمنا کے فوری پورا ہونے کی یہی خوشی، اس جملے میں مراد تھی۔

مگر بینک کا ادارہ کوئی قرضہ فی سبیل اللہ نہیں دیتا۔ وہ اس قرضہ پر سود وصول کرتا ہے۔ یہی سود بینک کی کمائی کا ذریعہ ہے۔ پھر یہ قرضہ ہر کس و ناکس کو ملتا بھی نہیں ہے۔ بینک پہلے تحقیق کر کے اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ جسے قرضہ دیا جارہا ہے وہ قرضہ ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس کے لیے اکثر اوقات کوئی نہ کوئی ضمانت رکھوائی جاتی ہے۔ اگر آپ قرض لے کر رقم واپس نہیں کریں گے تو قانونی کارروائی ہوگی اور بالجبر قرضہ وصول کرلیا جائے گا۔ گارنٹی کی ہر چیز ضبط ہوجائے گی۔ یہاں تک کہ عدم ادائیگی کی صورت میں جیل جانا پڑے گا۔

سگنل پر کھڑے کھڑے چند لمحوں میں میرے ذہن میں یہ سارے خیالات گزر گئے۔ ابھی سگنل بند ہی تھا کہ میری نظر اس سائن بورڈ کے بالکل نیچے پڑی جہاں سوسائٹی کے قبرستان کا منظر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ ایک دوسرا اشتہار ہے جو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جگہ جگہ لگا رکھا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس اشتہار میں بھی، زبان حال سے، ٹھیک وہی سلوگن لکھا ہوا ہے جو بینک کے اشتہار میں تھا۔

It is all about happiness.

قبرستان کا منظر انسان کو یہ یاد دلاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں ابدی نہیں بلکہ عارضی طور پر موجود ہے۔ وہ یہاں اپنے رب سے مہلتِ عمر قرض لے کر آیا ہے۔ روزِ ازل انسان نے زندگی کا یہ کریڈٹ کارڈ اس لیے لیا تھا کہ وہ جنت کی ابدی خوشیوں اور راحتوں کو حاصل کرسکے۔ اس قرضے کے لیے انسان نے اپنا وجود خدا کے پاس گارنٹی رکھا ہوا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ: ہر نفس اپنی کمائی کے عوض رہن ہے۔ (المدثر 38:74)

انسان اس دنیا میں اگر نیک عمل کی کمائی کر لیتا ہے تو نہ صرف جنت کی خوشیوں کو حاصل کرے گا بلکہ جہنم کی سزا سے بھی اپنی ہستی کو بچالے گا۔ اس کے برعکس انسان اس حیات مستعار کو

دنیا کی رنگینیوں کے پیچھے ضائع کر بیٹھا تو نعمت بھری جنت تو ایک طرف رہی، اس کا وجود جہنم کے قید خانے میں ڈال دیا جائے گا۔

انسانوں کی بدقسمتی ہے کہ ان کی اکثریت مہلتِ عمر کے اس قرض کو آخرت کی ابدی خوشیاں سمیٹنے کے بجائے دنیا کی عارضی خوشیوں کے پیچھے لگا دیتی ہے۔ اس رویے سے صرف وہ شخص بچ سکتا ہے جو اپنی خواہشات پر صبر کرنا سیکھے۔ انسان کے اندر خواہش کا پیدا ہونا غلط نہیں، اس کا بے لگام ہو جانا غلط ہے۔ کیونکہ خواہشات کی اندھی پیروی انسان کے پاس یہ موقع نہیں چھوڑتی کہ وہ آخرت کے لیے سرمایہ کاری کرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ جنت کو صبر کا بدلہ قرار دیا گیا ہے۔ آج صبر سب سے بڑھ کر خواہشات کے بارے میں مطلوب ہے۔

سو اَب جب کبھی آپ کسی قبرستان کے پاس سے گزریں تو وہاں ایک سائن بورڈ ضرور دیکھیے گا جس پر جلی حروف میں جنت کی ابدی زندگی کے متعلق یہ لکھا ہوگا۔

It is all about happiness

It is all about patience

آئیڈیل زندگی

''اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اس میں ان کے لیے پاک بیویاں ہوں گی اور ہم ان کو گھنی چھاؤں میں رکھیں گے''۔ (النسا4:57)

عرب کے صحراؤں میں جہاں پانی وسبزہ کمیاب اور دھوپ کی شدت ناقابل برداشت ہے، اللہ تعالیٰ کی عطا اور کرم کا اس سے اچھا بیان ممکن نہیں۔ جنت کا لفظی مطلب 'باغ' ہے۔ صحرا میں رہنے والے لوگوں کے لیے بہترین مقام کا تصور یہی ہے کہ وہ ایک باغ میں مقیم ہوں جس میں نہریں بہتی ہوں۔ یہ باغ اتنا گھنا ہو کہ صحرا کی تپتی دھوپ اور جھلسا دینے والی ہوا، دونوں اس کی چھاؤں میں غیر موثر ہو کر رہ جائیں۔ اس باغ کا پھل ان کی خوارک بنے، اس کے سبزے میں ان کے مویشی چرتے پھریں، اس کے پانی سے ان کی کھیتی سیراب ہو اور وہ ان نعمتوں میں پاکیزہ اہل خانہ کے ہمراہ اپنی زندگی کے دن گزاریں۔ سب سے بڑھ کر انہیں یہ یقین ہو کہ زمانے کی رفتار اور ماہ وسال کی گردش انہیں ان کی اس کائنات سے محروم نہیں کریں گے اور وہ ہمیشہ اس جگہ مقیم رہیں گے۔

یہ عرب کے صحرانشین ہی نہیں، عام انسان کی زندگی بھی حالات کی دھوپ چھاؤں میں کیا جانے والا ایک سفر ہے۔ انسان فطری طور پر سہولت پسند واقع ہوا ہے۔ وہ لذت کو پسند کرتا، آسانی کی خواہش کرتا اور سکون کی تمنا کرتا ہے۔ مگر زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ناگوار واقعات اس کی پرسکون زندگی میں خلل ڈال دیتے ہیں۔ حالات کی تپش اس کے وجود کو جھلسا دیتی ہے۔ محرومی کی آگ اس کے نشیمن کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔

ایسے میں یہ آیت انسان کو یقین دہانی کراتی ہے کہ وہ اپنی جنت کا جو نقشہ چاہے بنا لے، اللہ

تعالیٰ اس نقشے میں زندگی کی روح پھونک کر کل قیامت کے دن اس کے حوالے کر دیں گے۔ یہاں وہ اندیشوں کی ہر دھوپ اور پچھتاووں کی ہر جلن سے محفوظ رہ کر سکون کی چھاؤں میں زندگی گزارے گا۔ وہ زندگی جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔

اس جنت کے خواہش مند انسان کے لیے البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ اس عارضی دنیا کی ہر دھوپ اور ہر چھاؤں میں اپنے رب کی پسند کے اعمال کرتا رہے۔ وہ ایک ایسا درخت بن جائے جس کی ہر شاخ ایمان و اطاعت کے ساتھ رب کے سامنے جھکی رہنے والی ہو، پاکیزہ اخلاق و اعمال کے پھل اس سے پھوٹتے رہیں اور مخلوق خدا کے لیے اپنی ذات میں ایک سایہ دار درخت ہو۔ یہی وہ درخت ہے جسے آنے والے روز، قیامت کے دن، جنت کے باغ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لگا دیا جائے گا۔

ہم وہ سورج ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے جس کے طلوع ہوتے ہی ہر تاریکی چھٹ جاتی ہے۔ ہم تو اپنے حصے کا چراغ، اپنے رب کے بھروسے پر، اس خیال سے جلا رہے ہیں کہ اندھیری رات میں چراغ کی روشنی بھی غنیمت ہے۔

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

پوزیٹو کرکٹ

کرکٹ کا شمار دنیا کے مقبول ترین کھیلوں میں ہوتا ہے۔اس کھیل کی اہمیت کی بنا پر کسی ملک کی قومی ٹیم میں بہترین کھلاڑیوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔مگر بار ہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک باصلاحیت کھلاڑی انٹرنیشنل سطح پر آ کر خود کو منوا نہیں پاتا۔اس کا سبب یہ ہے کہ کرکٹ جسمانی کھیل ہونے کے ساتھ ایک ذہنی کھیل بھی ہے۔ یہاں ہر کھلاڑی خود کو قسمت اور حالات کے رحم و کرم پر پاتا ہے۔ یہ دونوں مل کر ایک دباؤ کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔اس دباؤ میں بہترین کھلاڑی بھی اپنی صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کر پاتا۔ مثلاً کسی وقت اگر ایک ساتھ کئی وکٹیں گر جائیں تو نیا آنے والا بہترین بیٹسمین بھی صرف دباؤ کی وجہ سے آؤٹ ہو جاتا ہے۔

اس وجہ سے کرکٹ کے میدان میں اترنے والے کھلاڑیوں کو اکثر یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ پوزیٹو رہیں۔ کرکٹ میں پوزیٹو ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کھلاڑی صورتحال کا اثر لیے بغیر اپنی صلاحیت کا استعمال کرے۔ وہ دباؤ کو نظر انداز کر کے ایک ایک بال کو میرٹ پر کھیلے۔ روکنے والی گیند کو روکے اور مارنے والی کو مارے۔ یہی کرکٹ میں کامیابی کا راز ہے۔

یہی پوزیٹو رویہ زندگی کے میدان میں بھی کامیابی کا راز ہے۔اس دنیا میں ہر انسان کوئی نہ کوئی صلاحیت لے کر آتا ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں بہت سے ایسے مسائل ہوتے ہیں جو انسان پر دباؤ اور ٹینشن پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسے میں انسان صرف مشکلات، مسائل اور دباؤ پر نظر رکھے گا تو وہ کبھی زندگی میں بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ بڑی کامیابی صرف اس شخص کو ملتی ہے جو حالات کے دباؤ اور پریشانیوں کے باجود ملے ہوئے مواقع کو استعمال کرے، اور جو مسائل کے باجود مواقع کی تلاش میں رہے اور موقع ملنے پر اپنی بہترین صلاحیت کو استعمال کرے۔

اسی طرح زندگی کی کسی ایک اننگز میں ناکامی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان ہر جگہ ناکام ہو گیا ہے۔ اسے زندگی کی اگلی اننگز اور اگلے موقع کا انتظار کرنا چاہیے۔ قدرت اپنے قانون کے تحت اسے یہ موقع لازماً دے گی۔ اسے مایوس ہوئے بغیر اس موقع کا انتظار کرنا چاہیے اور جیسے ہی موقع ملے، اپنی پوری صلاحیت اس میں لگا کر اسے استعمال کرنا چاہیے۔

زندگی کا میدان کرکٹ کے میدان سے زیادہ مختلف نہیں۔ مثبت اندازِ فکر دونوں میدانوں میں کامیابی کا ضامن ہے۔

انسان اور جانور کا فرق

میرے ایک قریبی دوست ہیں۔ان کے سامنے اگر کوئی یہ کہہ بیٹھے کہ اسے مطالعے کی عادت نہیں یا مطالعے کے لیے وقت نہیں ملتا تو وہ پلٹ کر جواب دیتے ہیں ،’’اطمینان رکھیے ! آپ اس معاملے میں تنہا نہیں ہیں۔دیگر جانور بھی کتابیں نہیں پڑھتے ۔‘‘

حقیقت یہ ہے کہ جانور اور انسان دونوں کو بہت سے کام جبلت سکھاتی ہے۔ بہت سے افعال ایسے ہیں جو حواس سے حاصل شدہ علم کی بنا پر ہوتے ہیں۔ بہت سی چیزیں دونوں ماحول سے اخذ کرتے ہیں۔لیکن یہ صرف انسان کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے علم کے خزانے کو الفاظ کی صورت دیتا اور اسے کتاب کی تجوری میں محفوظ کر دیتا ہے تا کہ دوسرے لوگ علم کے اس خزانے سے استفادہ کر سکیں۔قلم و کتاب کی یہی وہ سلطنت ہے جس کی تسخیر ،انسانوں پر، تسخیرِ کائنات کے تمام دروازے کھول دیتی ہے۔

کتاب پڑھنا صرف انسان اور جانور ہی کا فرق نہیں بلکہ ایک قوم اور دوسری قوم کا بھی فرق بن جاتا ہے۔جس قوم میں قلم و کتاب کی حکومت ہو وہ قوم دوسری اقوام پر اسی طرح حکومت کرتی ہے جس طرح انسان جانوروں پر حکومت کرتے ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں میں لکھنے پڑھنے کا ایک غیر معمولی ذوق پیدا کر دیا تھا۔یہ ذوق مذہب کے پس منظر میں پیدا ہوا تھا۔مگر ایک دفعہ پیدا ہو گیا تو صرف مذہب تک محدود نہیں رہا، بلکہ علم کی تمام شاخوں تک پھیل گیا۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزار برس تک مسلمان دنیا پر حکومت کرتے رہے۔ مسلمانوں کا زوال بھی جس واقعہ سے شروع ہوا وہ یہی تھا کہ بغداد اور اسپین میں مسلمانوں کی کتابوں کے ذخیرے یا تو جلا دیے گئے یا پھر مسلمانوں کی شکست کے بعد عیسائیوں کے ہاتھ لگ گئے۔یہی کتابیں یورپ پہنچیں تو وہ آنے والے دنوں میں دنیا کے حکمران بن گئے۔

آج بھی اگر ہم ترقی کی شاہراہ پر قدم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ لوگوں میں پڑھنے کی عادت پیدا کریں۔کیونکہ علم کی فصل قلم و کتاب کی جس زمین پر اگتی ہے اسے پڑھنے کا شوق رکھنے والے لوگ سیراب کرتے ہیں۔اور جس معاشرے سے مطالعے کا ذوق اور عادت ختم ہو جائے وہاں علم کی پیداوار بھی ختم ہو جاتی ہے۔جس قوم میں علم نہ ہو اس کا انجام سوائے مغلوبیت کے کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

جو روپے کے بھی امین نہیں......

کئی برس قبل مجھے کینیڈا اور امریکہ میں تفصیلی قیام کا موقع ملا۔اس عرصے کے دوران میں متعدد قابلِ ذکر مشاہدات پیش آئے۔ان میں سے ایک دلچسپ مشاہدہ یہ تھا کہ میں نے ایک روپے کے پاکستانی کرنسی کے سکے کو کینیڈا میں خرید وفروخت میں استعمال ہوتے دیکھا۔دراصل کینیڈا کی کرنسی کا سب سے چھوٹا سکہ پینی (Penny) ہے۔ایک کینیڈین ڈالر سو پینی کے برابر ہوتا ہے۔پینی کا یہ سکہ اپنے رنگ،ساخت اور جسامت میں بالکل پاکستانی روپے جیسا ہوتا ہے۔جب تک غور سے نہ پڑھا جائے کہ اس پر کیا لکھا ہے۔صرف سرسری نظر ڈال کر یہ بتانا ممکن نہیں کہ یہ پاکستانی روپیہ ہے یا کینیڈین پینی ہے۔

یہ پاکستانی روپیہ کس طرح کینیڈا میں گردش میں آیا؟ اس سوال کا جواب دینا کوئی مشکل نہیں۔حالیہ وقتوں میں پاکستانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کینیڈا منتقل ہوئی ہے۔جانے والوں کے ساتھ ساتھ ان کے اہل خانہ کی بڑی تعداد کو بھی کینیڈین شہریت حاصل ہوئی ہے۔اس طرح کثرت سے پاکستانی کینیڈا آنے جانے لگے ہیں۔یقیناً انھی میں سے کچھ لوگ ہوں گے جن کے ساتھ کچھ پاکستانی سکے کینیڈا پہنچ جاتے ہوں گے۔باقی سکے تو وہاں بالکل بے مصرف ثابت ہوتے ہیں مگر ایک روپے کے سکے کا استعمال وہاں نکل آیا۔چنانچہ ایک پینی کی انتہائی حقیر رقم کی جگہ پاکستانی روپیہ استعمال ہونے لگا۔یوں نہ صرف پاکستانیوں کا ایک روپیہ ضائع ہونے سے بچ گیا بلکہ ایک پینی کا اضافی ''فائدہ'' بھی وہ اٹھانے لگے۔

بہت سے لوگوں کے لیے یہ ایک چھوٹی بات ہوگی جسے ہنسی مذاق میں اڑایا جا سکتا ہے۔بہت سے لوگ اسے پاکستانیوں کی ذہانت کے کھاتے میں ڈالیں گے۔مگر مجھے اس واقعہ پر قرآن کی ایک آیت یاد آ گئی۔اہل کتاب کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''اور ان (اہل کتاب) میں وہ بھی ہیں کہ اگر تم ان کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو

وہ اس وقت تک اس کو لوٹانے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ“

(آل عمران 3:53)

قرآن کی اس آیت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہودی خود کو تمام دنیا سے افضل سمجھتے تھے، لیکن درحقیقت وہ اخلاقی زوال کی کس پستی میں اتر چکے تھے۔ اللہ اور رسول سے لے کر ایک دینار تک، کسی معاملے میں وہ صاحب کردار نہیں رہے تھے۔ اس کے بعد چاہے وہ خود کو کتنا ہی امامت عالم کے منصب پر فائز سمجھتے، خدا کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔

قرآن کی اس آیت سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض چھوٹی چھوٹی باتیں انسان کے کردار کو کھول کر رکھ دیتی ہیں۔ وہ یہ بتاتی ہیں کہ جب کسی انسان کا زندگی کے بارے میں بنیادی نقطۂ نظر ہی غلط ہو جائے تو ضروری نہیں کہ وہ اہم مواقع ہی پر اس کا اظہار کرے۔ انسان بہت معمولی باتوں میں اس کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ وہ معاشرہ جس سے امانت اٹھ جائے، آہستہ آہستہ اس مقام پر آ جاتا ہے کہ ایک روپے اور ایک پینی کی ناقابل تذکرہ رقم میں بھی خرد برد کرنے لگتا ہے۔ آخرت اور ایمان کے مقابلے میں ہر فائدہ بہت حقیر ہے مگر انسان اتنا غیر محتاط ہوتا ہے کہ اپنے کردار و دیانت کو صرف ایک روپے میں فروخت کر دیتا ہے۔

امانت و دیانت انسانی کردار کے اعلیٰ ترین اوصاف میں سے ہے۔ جن لوگوں میں یہ اخلاقی وصف نہیں وہ کسی ذمہ داری اور کسی بھی منصب کے اہل نہیں۔ جو لوگ آج ایک روپے کے بھی امین ثابت نہیں ہوتے، وہ موقع ملنے پر لاکھ روپے کی امانت کا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکیں گے۔ چاہے یہودی ہو یا مسلمان، کوئی گروہ جب زوال کی گھاٹی پر قدم رکھتا ہے تو اسے یہ دن بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کے رہنما اسے دنیا کی امامت کا مژدۂ جانفزا سناتے ہیں اور اس کا کردار یہ ہوتا ہے کہ وہ روپے کی امانت کا بھی تحمل نہیں کر سکتا۔

لوگوں کا جو دل چاہے وہ کہتے اور سمجھتے رہیں، خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ جو لوگ روپے کے بھی امین نہیں، انہیں کبھی امامتِ عالم کے منصب پر فائز نہیں کیا جا سکتا۔

بادشاہوں کا بادشاہ

حضرت سلیمان علیہ السلام ایک مشہور نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے زمانے کا سب سے بڑا بادشاہ بنایا تھا۔ جنوں، پرندوں اور ہواؤں کو بھی ان کا تابع فرمان کر دیا تھا۔ وہ پرندوں یہاں تک کہ چیونٹیوں کی باتیں بھی سمجھ لیتے تھے۔ ان کے دربار میں ایسے باکمال لوگ موجود تھے جو ان کے حکم پر ہزار میل دور موجود ایک چیز کو لمحہ بھر میں ان کے دربار میں پہنچا دیتے تھے۔ مگر اس سب کے باجود وہ لمحہ بھر غافل نہ رہتے اور ہر لمحے رب کا شکر ادا کرتے رہتے۔

قرآن پاک کی سورہ نمل میں یہ ساری تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ اسی سورت میں یہ واقعہ بھی بیان ہوا ہے کہ ان کے لشکر میں موجود پرندے ہدہد نے ایک روز انہیں یہ اطلاع دی کہ یمن کی قوم سبا پر ایک عورت حکمران ہے جو بڑی شان وشوکت کی مالک ہے۔ البتہ وہ اور اس کی قوم شرک کا شکار ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس خدمت پر معمور تھے کہ شرک کو ختم کر دیں، انہیں جب یہ اطلاع ملی تو آپ نے ہدہد کے ذریعے سے اسے ایک خط پہنچوایا کہ فرمانبرداری کے ساتھ فوراً میری خدمت میں حاضر ہو۔

جب ملکہ سبا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ملا تو اس نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا۔ وہ ایک طاقتور قوم کے سردار تھے اس لیے اپنی ملکہ کو جنگ کا مشورہ دیا۔ اس پر ملکہ سبا نے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طاقت سے واقف اور بہت سمجھدار خاتون تھی، اپنا وہ تاریخی جملہ کہا جو انسان کی ہزاروں سالہ سیاسی زندگی کا نچوڑ ہے۔ قرآن نے اس کی بات کو اس طرح بیان کیا ہے۔

''بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں (فتح کے بعد) داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد برپا کر دیتے ہیں اور وہاں کے معززین کو ذلیل کر کے چھوڑتے ہیں۔'' (نمل 34:27)

ملکہ سبا کا یہ جملہ بادشاہوں کے اس رویے کو بیان کرتا ہے جو ہمیشہ سے ان کا معمول رہا ہے۔ بادشاہ جب کسی ملک پر قبضہ کر لیتے ہیں تو ان کی طاقت کو یہ گوارہ نہیں ہوتا کہ کوئی ان کے خلاف اٹھنے کی

جرأت کرے۔اس لیے جوکوئی ایسا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اسے کچل کر رکھ دیتے ہیں اور خاص طور پر وہاں کے عزت دار لوگ،جن کی طرف سے بغاوت کا اندیشہ سب سے بڑھ کر ہوتا ہے، انہیں ذلیل اور بے وقعت بنا کرر کھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس کائنات کے بادشاہ ہیں۔وہ بادشاہوں کے بادشاہ ہیں۔ان کی سنت بھی اس معاملے میں دوسرے بادشاہوں سے کچھ مختلف نہیں۔تاہم اللہ تعالیٰ کو کسی عام بستی کو فتح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔وہ بادشاہ کی حیثیت سے اگر داخل ہوتے ہیں تو دل کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔پھراس کے بعد وہ دل کی اس بستی میں وہی کچھ کرتے ہیں، جو دوسرے بادشاہ اپنے مفتوحہ علاقوں میں کرتے ہیں۔

وہ اس بستی میں ہراس تعمیر کوگرادیتے ہیں جس میں دنیا کی محبت آباد ہوتی ہے۔وہ ہراس عمارت کو مسمار کردیتے ہیں جس میں غیر اللہ کا بسیرا ہوتا ہے۔وہ ان قلعوں اور چھاؤنیوں کو تاراج کردیتے ہیں جو نفس وشیطان کی پناہ گاہ ہوتی ہیں۔وہ خواہشات کے اس محل سرا کو ویران کردیتے ہیں جس میں دنیا پرستی کا ڈیرا ہوتا ہے۔وہ دل کی دنیا کے ہر عزت دار کو اس طرح ذلیل ورسوا کرتے ہیں کہ وہ کبھی سر اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔مال ودولت،عزت وشہرت، جمال وکمال،آسائش وزیبائش کے وہ بت جن کی پرستش ہر دل میں کی جاتی ہے،اس بستی میں خدائے ذوالجلال کی دہشت سے منہ چھپائے پھرتے ہیں۔

اس کے بعد انسان چاہے سلیمان علیہ السلام کی طرح کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، دنیا میں ہر طرف سے گھرا ہی کیوں نہ ہو، اس کا دل خدا کی جاگیر بن جاتا ہے۔اس مفتوحہ دل میں ہر طرف خدا کی عظمت کا راج ہوتا ہے۔اسی کی بڑائی کے نغمے گائے جاتے ہیں۔

یہی تاراج دل ٹوٹا ہوا دل ہے......یہی وہ دل ہے جو آج نایاب ہو چکا ہے۔

آج کے بے ایمان

حضرت شعیب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اہل مدین کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اہل مدین کوئی اور نہیں حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے تھے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ان میں طرح طرح کی برائیاں پیدا ہوگئیں تھیں۔ اس دور کی دیگر اقوام کی طرح یہ لوگ بھی شرک کا شکار تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں بہت سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے۔ آخر کار اس قوم پر زلزلہ کا عذاب آیا اور پوری قوم تباہ کر دی گئی۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے شرک کے علاوہ ان کے ایک اور مرض کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ یہ کہ لوگ ناپ تول میں ڈنڈی مارتے تھے۔ قرآن میں ہے کہ جب حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں اس حوالے سے سمجھایا تو انہوں طنزیہ جواب دیا کہ اے شعیب کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کرسکیں۔ بس تم ہی ایک دانشمند اور استباز رہ گئے ہو؟

یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ منافع کمانے کے ناجائز طریقے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کتنا بڑا جرم ہے۔ اس عمل میں چونکہ انسان جان بوجھ کر دوسرے انسانوں کو دھوکہ دیتا ہے اس لیے اس کا دل سخت ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ وہ وقت کے پیغمبر کا مذاق اڑانے پر اتر آتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اس واقعہ سے سامنے آتی ہے کہ اللہ پر ایمان رکھنے والا اور نماز پڑھنے والا انسان کبھی اس طرح کے بھیانک اخلاقی جرائم کا ارتکاب نہیں کرسکتا۔ یہ اتنی واضح بات ہے کہ قوم شعیب کے کفار بھی اسے سمجھتے تھے۔

بدقسمتی سے آج ہماری مسلمان سوسائٹی میں لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے۔ ہمارے ہاں طرح طرح سے ناجائز طریقے سے منافع کمایا جاتا ہے۔ جن میں ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، جھوٹ بول کر مال بیچنا، ذخیرہ اندوزی وغیرہ بہت عام ہیں۔ یہ کام کرنے والے لوگ حکومت کے دھوکے، جھوٹ اور رشوت کے ذریعے سے دنیا کے قانون کی پکڑ سے بچ سکتے ہیں۔ مگر قوم شعیب کا سبق یہ بتاتا ہے کہ اللہ کی پکڑ سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ جس خدا نے قوم شعیب کے بے ایمان لوگوں پر عذاب نازل کیا تھا، آج کے مسلمان بھی اس کی پکڑ سے ہرگز باہر نہیں ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ قوم شعیب کے مجرمین کو گزرے ہوئے کل میں پکڑا تھا۔ اور آج کے بے ایمان مجرموں کو وہ آنے والے کل میں پکڑے گا۔

Honey Trap

امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین کا شمار دنیا کی پانچ بڑی طاقتوں میں ہوتا ہے۔سوویت یونین کے انہدام سے قبل یہی پانچ ملک تسلیم شدہ ایٹمی طاقت شمار ہوتے تھے۔اس زمانے میں دیگر بعض ممالک نے بھی ایٹمی اسلحہ کے حصول کی کوشش شروع کردی تھی۔ان میں اسرائیل کا نام سرفہرست ہے۔کہا جاتا ہے کہ اسرائیل نے مغربی طاقتوں کی مدد سے سن ساٹھ کی دہائی میں یہ صلاحیت حاصل کر لی تھی، مگر بین الاقوامی دباؤ کے خوف سے اس صلاحیت کا اظہار نہیں کیا۔

1986 میں دنیا کو پہلی بار اسرائیل کی ایٹمی طاقت کے بارے میں اس وقت معلوم ہوا جب صحرائے نقب میں واقع اسرائیلی ایٹمی تنصیب DIMON کے ایک اہلکار مردکائی ونونو نے برطانوی اخبار 'سنڈے ٹائمز' کو ایک انٹرویو دیا۔اس انٹرویو میں اس نے اسرائیل کے خفیہ ایٹمی پروگرام کی تفصیلات سے پہلی دفعہ پردہ اٹھایا۔جس سے دنیا بھر میں کھلبلی مچ گئی۔

چنانچہ اسرائیل کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اس سے قبل یہ اہلکار مزید مسائل پیدا کرے اسے واپس اسرائیل لاکر اس کے خلاف مقدمہ چلنا چاہیے۔لہٰذا اسے پھانسنے کے لیے اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد نے ایک Honey Trap یا دامِ الفت تیار کیا۔موساد کی ایک انتہائی حسین خاتون ایجنٹ نے مردکائی ونونو سے لندن میں دوستی کی۔اسے اپنے حسن کے جال میں پھنسایا۔پھر اسے تفریح کے لیے روم چلنے کی پیشکش کی۔روم کے ایک ہوٹل میں اسے نشہ آور دوا کھانے میں ملا کر دی گئی۔جب اس کی آنکھ کھلی تو سامنے کوئی دلربا حسینہ نہیں، اسرائیل کی عدالت تھی، جس نے اسے غداری کے الزام میں 18 سال قید کی سزا سنادی۔

یہ واقعہ جو ایک فرد پر گزرا، ہر انسان کا حقیقی مسئلہ ہے۔آزمائش کی اس دنیا میں انسان ہر لمحہ

حالت جنگ میں ہے۔اس کے دشمن شیطان نے اس کے سامنے طرح طرح کے Honey Trap بچھا رکھے ہیں۔انسان دنیا کے اس جال کو جال نہیں سمجھتا۔ وہ ساری زندگی دنیا کی ظاہری خوبصورتی اور لذت کے پیچھے بھاگتا ہے۔اس حسن کے پیچھے جہنم کی جو قید چھپی ہے، وہ اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کے فرشتے موت کی بیہوشی لیے اچانک نمودار ہوتے ہیں اور جب آنکھ کھلتی ہے تو جہنم کے قید خانے کے سوا کچھ اور سامنے نہیں رہتا۔

کامیاب انسان وہ نہیں جس نے دنیا میں بہت ترقی کی۔ کامیاب انسان وہ ہے جس نے دنیا کے Honey Trap میں پھنسنے کے بجائے، خدا کی ابدی جنت کی ابدی نعمتیں حاصل کر لیں۔

دعوت دین کے سفر کا میں ہم اپنا بھروسا تنہا صرف اس خدا پر رکھتے ہیں، جس کا سہارا اگر مل جائے تو انسان کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ دینِ حق کے ابلاغ کا یہ کام ہمارا ذاتی کام نہیں، خدا کا کام ہے۔ جو لوگ اس کام میں آگے بڑھ کر دست و بازو بنیں گے، وہ ہمارے نہیں خدا کے مددگار ہوں گے۔ یہی وہ عظیم خطاب ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ یہی وہ خطاب ہوگا جس سے کل روزِ قیامت یہ لوگ سرفراز کیے جائیں گے۔

گندے انڈے

عام طور پر لوگوں کی یہ کوشش اور خواہش ہوتی ہے کہ جب وہ سودا سلف لینے باہر جائیں تو کوئی دکاندار گلی سڑی اور باسی اشیا ان کے حوالے نہ کر دے۔ تاہم دکانوں پر ملنے والی اشیا میں غالباً انڈا واحد چیز ہے جس کی ظاہری حالت دیکھ کر اس کے خراب ہونے کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ انڈے کا خراب ہونا اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب گھر لانے کے بعد انڈے پر چڑھا خول توڑا جائے۔ تب ہی پتا چلتا ہے کہ کھانے کے استعمال میں آنے والی سفیدی اور زردی صحیح حالت میں ہے یا خراب ہوچکی ہے۔

آج کے انسان کا معاملہ بھی کچھ انڈے ہی جیسا ہے۔ آج جس شخص سے بات کی جائے وہ اپنی گفتگو اور ظاہری چیزوں سے اپنے گرد انڈے کی طرح سفید خول چڑھائے ہوئے ملتا ہے۔ خوش اخلاق، باکردار، اصول پرست، معاشرتی خرابیوں سے نالاں اور اخلاقی انحطاط سے پریشان۔ مگر جب معاملہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر لوگ گندے انڈے کی طرح ہیں۔ لوگ صرف اس وقت تک اچھے انڈے ثابت ہوتے ہیں جب تک ان کے مفادات اور خواہشات کے تحت معاملات چل رہے ہوں۔ مگر جیسے ہی ان کی انا کے خول پر ضرب لگے، ان کے مفادات کا گھروندا بکھرنے لگے، ان کی خواہشات کا محل مسمار ہونے لگے، ان کے تعصّبات کا علم سرنگوں ہونے لگے، گندے انڈے کا سفید خول ٹوٹتا ہے اور اس کے اندر سے غلاظت اور بدبو کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

لوگ وعدہ کرتے ہیں مگر پورا نہیں کرتے۔ لوگ بولتے ہیں مگر سچائی سے کام نہیں لیتے۔ لوگ تنقید کرتے ہیں مگر عدل وانصاف کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ لوگ یہ سب کچھ کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ علم واخلاص کے دعوے بھی کرتے ہیں۔ اپنے نیک و صالح ہونے کا ڈھنڈورا بھی پیٹتے ہیں۔ اپنی پاکدامنی کا قصیدہ بھی پڑھتے رہتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ لوگ گندے انڈے ہیں۔ یہ گندے انڈے معاشرے کی اعلیٰ روایات کو ختم کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو کبھی ان کے الفاظ کے ترازو میں نہیں تولنا چاہیے بلکہ عمل کے آئینے میں ان کی تصویر دیکھنی چاہیے۔

میڈیا اور عورتوں کی نمائش

''لوگوں کی نگاہوں میں مرغوبات دنیا: عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے، چوپائے اور کھیتی کھبادی گئی ہیں۔ یہ دنیوی زندگی کا سروسامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے۔ان سے کہو کیا میں تمھیں ان چیزوں سے بہتر چیز کا پتا بتا دوں؟ جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن میں نہریں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوشنودی ہوگی''۔(آل عمران 3:14-15)

قرآن کریم کی اس آیت میں مرغوباتِ دنیا کی جو فہرست بیان کی گئی ہے، اس میں سرِ فہرست عورتوں کی محبت کو بیان کیا گیا ہے۔اس بات کو کسی اور نے سمجھا ہو یا نہیں، میڈیا کے لوگوں نے خوب سمجھا ہے۔

دورِ جدید میں الیکٹرونک میڈیا ایک غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تعلیم، معلومات اور تفریح کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔خاص طور پر تیسری دنیا کے مما لک میں، جہاں مطالعہ کا زیادہ رجحان نہیں اور شرح خواندگی بھی کم ہے، وہاں الیکٹرونک میڈیا ہی لوگوں کی دلچسپی کا اصل مرکز ہے۔مگر بدقسمتی سے یہ دورِ جدید میں عورتوں کی نمائش اور عریانی پھیلانے کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ فلم اور ڈرامہ بنانے والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی فلم اور ڈرامے کو لوگوں کی بڑی تعداد دیکھے۔اسی طرح ٹی وی چینل چلانے والوں کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے چینل کے ناظرین اکثریت میں ہوں۔ ایک ناظر کی توجہ حاصل کرنے کا سب سے سہل اور آسان نسخہ یہ ہوتا ہے کہ خوبصورت خواتین کو میک اپ اور روشنی کے ذریعے سے خوب تر بنا کر اسکرین پر لایا جائے۔ان کی نسوانیت اور صنفی کشش کو ابھار کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ان کے ناز و

انداز اور غمزہ وادا کے ذریعے سے لوگوں کو ان کے شوق میں مبتلا کیا جائے۔ان کے جسم کی نمائش کر کے ویورشپ (Viewership) کو بڑھایا جائے۔ عاشقانہ اور فحش مناظر سے ناظر کی توجہ حاصل کی جائے۔اور ضرورت پڑے تو فنکارہ کو بےلباس کر کے فن کی ''خدمت'' کرائی جائے۔

الیکٹرونک میڈیا کے اس دور میں اب گھر گھر ٹی وی اور کیبل موجود ہے۔ ہر طرح کی فلمیں بازار میں عام ملتی ہیں۔ان کو چلانے کے بہترین آلات، وی سی آر، سی ڈی پلیئر اور ڈی وی ڈی پلیئر کی شکل میں انتہائی کم قیمت پر بازار میں دستیاب ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد صبح و شام الیکٹرونک میڈیا سے استفادہ کرتی ہے۔اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا، میڈیا پر دکھائی جانے والی شے اکثر و بیشتر عورت ہی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ ایک انسان کے اندر سے حیا کے فطری جذبے کو مغلوب کر دیتا ہے۔ انسان کے حیوانی جذبات اس پر غالب آ جاتے ہیں۔آہستہ آہستہ عفت کا احساس ختم ہونے لگتا ہے ۔زنا اور فحاشی انسان کو ایک معمولی عمل لگنے لگتا ہے۔

اس صورتحال کا ایک حل یہ نکالا گیا ہے کہ گھر سے ٹی وی کو نکال دیا جائے۔ یہ بظاہر مکمل حل ہے۔مگر تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ حل اکثریت کے لیے ناقابل عمل ہے اور آئندہ آنے والے دنوں میں مزید ناقابل عمل ہو جائے گا کیونکہ دور جدید میں الیکٹرونک میڈیا کو روک دینا کسی طور پر بھی ممکن نہیں رہا ہے۔

اس صورتحال کا حل وہی ہے جو مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں میں سے باشعور لوگوں نے اپنے بچوں کے حوالے سے اختیار کیا ہے۔یعنی فرد کی تربیت کی جائے ۔ایمان و اخلاق کو اس کے رگ و پے میں اتارا جائے۔اپنی تہذیب، اقدار، روایات اور فطرت میں موجود پاکیزہ جذبات کو ابھارا جائے۔ حیا اور عفت کی اہمیت دل و دماغ میں راسخ کی جائے۔زنا کے

نقصانات اوراس کی شناعت کواجاگر کیا جائے۔ نیز نکاح کے فطری تعلق سے، جتنا جلدی ہوسکے، نوجوانوں کو وابستہ کرنے کی تحریک برپا کی جائے۔

ان سب کے ساتھ لوگوں کو اس حوالے سے تعلیم دی جائے کہ اللہ کی جنت تقویٰ کے بغیر نہیں مل سکتی۔ یہ جنت وہ مقام ہے جہاں انسان ہمیشہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے سائے میں زندہ رہے گا۔ دنیا میں جتنی بھی نعمتیں پائی جاتی ہیں وہ جنت میں کہیں زیادہ بہتر بنا کر انسان کو دے دی جائیں گی۔

انسان ذہنی طور پر بہت طاقتور مخلوق ہے۔ جب وہ کسی شے کے بارے میں ایک نقطہ نظر قائم کرلیتا ہے تو بنیادی جبلی جذبات پر بھی قابو پالیتا ہے۔ اس کا ایک نمونہ رمضان کے روزے ہیں جب لوگ اللہ کے لیے کھانا پینا تک چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ جب انسانوں کی تربیت اس طرح کی جائے گی تو وہ خود کو اور اپنے اہل خانہ کو الیکٹرونک میڈیا کی پھیلائی ہوئی اس آلودگی سے بچانے کے قابل ہوجائیں گے۔

اللہ کے نزدیک محبوب دین اور اعمال

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے جبکہ ایک خاتون ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپ نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ حضرت عائشہ نے بتایا کہ یہ فلاں خاتون ہیں اور ان کی نماز (کی کثرت) کا حال بیان کرنے لگیں۔ آپ نے (نصیحتاً) فرمایا: کہ دیکھو! تم اپنے ذمے اسی قدر اعمال رکھو جن کی (ہمیشہ پابندی کی) تمہیں طاقت ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ (اجر دینے سے) نہیں تھکتا تاوقتیکہ تم (عبادت سے) تھک جاؤ، اور..................

''اللہ کے نزدیک سب سے محبوب وہ دین (دینی عمل اور عبادت) ہے جس پر ہمیشہ پابندی سے عمل کیا جاسکے۔'' (صحیح بخاری)

اللہ کا ذکر اور اطمینان قلب

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کو دلوں کے اطمینان کا ذریعہ بتایا ہے(الرعد 28:13)۔مگر ہمارے ہاں لوگ عام طور پر یہ شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ اللہ کا ذکر کر کے بھی دل بے چین و مضطرب رہتا ہے۔وہ صبح و شام تسبیحات پڑھتے ہیں،مگر پھر بھی زندگی حزن وملال اور بے چینی و انتشار میں گزرتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اس آیت میں اطمینان سے مراد سکون کی وہ کیفیت نہیں ہے جو کسی نشے کو اختیار کرنے کے بعد انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔اور جس کے بعد انسان دنیا و مافیہا کے ہر غم سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہاں اطمینان سے مراد وہ ذہنی کیفیت ہے جس میں انسان کو یہ یقین ہوتا ہے کہ جس ہستی پر وہ ایمان لایا ہے،جس کو اس نے اپنا رب اور اپنا معبود مانا ہے، وہی درحقیقت خالق و مالک ہے۔ اسی کے ہاتھ میں کل کائنات کی بادشاہی ہے۔اور جس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا، اللہ تعالیٰ اسے کبھی رسوا اور محروم نہیں کرے گا۔

تاہم یہ یقین اللہ کے جس ذکر سے پیدا ہوتا ہے وہ محض تسبیح پر انگلیاں پھیرنے کا عمل نہیں بلکہ اس کی یاد میں جینے کا نام ہے۔ یہ محض کچھ اذکار کو زبان سے ادا کرنے کا عمل نہیں ،اس کے ذکر سے منہ میں شیرینی گھل جانے کا نام ہے۔یہ اس کے نام کی مالا جپنے کا عمل نہیں، ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ سمجھنے کی کیفیت کا نام ہے۔ یہ اللہ ھو کا ورد کرنے کا عمل نہیں، رب کی محبت اور اس کے ڈر میں زندگی گزارنے کا نام ہے۔اس یاد کی بڑی خوبصورت تعبیر، اگر فیض کے الفاظ مستعار لیں تو کچھ یوں ہے۔

رات یوں دل میں تری بھولی ہوئی یاد آئی

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

قرآن نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اطمینان قلب کی وہ کیفیت جس میں انسان کو نہ کوئی خوف

ہوتا ہے اور نہ کوئی اندیشہ، اللہ کے دوستوں کو عطا کی جاتی ہے۔ فرمایا:

''سن لو کہ اللہ کے دوستوں کے لیے کوئی خوف ہے اور نہ کوئی اندیشہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے۔ ان کے لیے خوشخبری ہے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہی بڑی کامیابی ہے''۔ (یونس 62-64:10)

یہاں قرآن یہ بھی بیان کرتا ہے کہ اللہ کے یہ دوست کون ہوتے ہیں؟ یہ کوئی ''بزرگ'' قسم کے لوگ نہیں بلکہ وہ سچے اہل ایمان ہیں جو اپنے ایمان کا ثبوت تقویٰ سے دیتے ہیں۔ یعنی رب کی یاد ان کا احاطہ اس طرح کر لیتی ہے کہ زندگی کے ہر کمزور لمحے میں وہ یہ سوچ کر گناہ سے بچتے ہیں کہ اللہ میرے ساتھ ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہی لوگ اللہ کے ولی اور اس کے دوست ہیں۔ اور جو اللہ کا دوست ہو وہ کیسے کسی خوف وحزن کا شکار ہوسکتا ہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں۔ کسی ملک کے صدر یا وزیر اعظم سے جو ملک کا طاقتور ترین شخص ہوتا ہے اگر کسی شخص کی براہِ راست دوستی ہو جائے تو پھر اس ملک کا کوئی سرکاری محکمہ اسے تنگ نہیں کرسکتا۔ کہیں اس کا کام پھنس نہیں سکتا۔ جب ایک فانی انسان کا یہ حال ہے تو جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنا دوست قرار دیدے، ان کے معاملات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایمان وتقویٰ کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور اللہ انہیں ہر خوف وحزن سے محفوظ رکھتا ہے۔ وہ اللہ کی یاد میں جیتے ہیں اور اللہ ان کے دلوں کو اطمینان سے بھر دیتا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں پر تکالیف بھی آتی ہیں، بلکہ اکثر انہی پر آیا کرتی ہیں تو پھر یہ لوگ کس طرح خوف وحزن سے محفوظ ہوئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حزن وخوف دل کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ جو لوگ اللہ کی یاد میں جیتے ہیں، ان کے اردگرد وقتی طور پر پریشان کن حالات پیدا ہوسکتے ہیں، مگر ان کے قلب پر اطمینان کی وہ کیفیت طاری رہتی ہے جس سے انسان ہمیشہ پرسکون

رہتا ہے۔اس کا سب سے اچھا نمونہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی سیرت ہے۔آپ کو اپنی زندگی میں متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور ہجرت کے موقع پر تو خون کے پیاسے لوگ آپ کو تلاش کرتے ہوئے غار ثور تک آ پہنچے۔آپ کے ساتھ سوائے حضرت ابوبکرؓ کے اور کوئی نہ تھا۔مگر آپ اس موقع پر ذرہ برابر بھی خوفزدہ نہ ہوئے بلکہ جب حضرت ابوبکرؓ آپ کی طرف سے فکرمند ہوئے تو آپ نے ان کو اس طرح تسلی دی کہ اے ابوبکر! ان دو کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا رفیق خود اللہ ہے،

(ماظنك يا ابا بكر باثنين الله ثالثهما، رواه بخاری، رقم 3453)۔

ایک بندہ مومن پر جب زندگی کی مشکلات آتی ہیں تو اس کا ایمان اسے بتاتا ہے کہ اللہ چاہے تو باآسانی اسے ان مشکلات سے نکال سکتا ہے۔چنانچہ وہ اپنے رب ہی کو پکارتا اور اسی سے مدد چاہتا ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر اللہ تعالیٰ اسے اس مشکل سے نجات عطا کر دیتے ہیں۔تاہم اسے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ یہ مشکلات، اگر دور نہیں ہو رہیں تب بھی، جنت میں اس کے درجات بلند کرنے کا سبب بن رہی ہیں اور آخرت کے دکھوں سے اسے بچا رہی ہیں۔چنانچہ مشکلات و تکالیف بھی اسے یہ اطمینان فراہم کرتی ہیں کہ اس کی تکلیف کا ہر اک لمحہ جنت میں اس کی راحتوں میں اضافہ کا سبب بنے گا۔جو شخص اطمینان کی اس کیفیت میں جیتا ہو، اس کے سکونِ قلب کے کیا کہنے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے امتحان کی تیاری میں مصروف کوئی قابل طالبعلم رات بھر جاگتا اور نیند کی راحت سے محروم رہتا ہے۔مگر اسے یہ تکلیف اس لیے گوارا ہوتی ہے کہ وہ آنے والے دنوں میں اس کا بہترین نتیجہ دیکھے گا۔یا کوئی کاروباری شخص اپنے کاروبار میں پیسے لگاتا ہے اور مشقت اٹھاتا ہے، اس امید پر کہ آنے والے دنوں میں اسے بھرپور منافع ملے گا۔

یہ ایک حقیت ہے کہ اللہ کی یاد میں بڑا سکون ہے۔مگر اس شخص کے لیے جو ایمان وتقوی کی کیفیات میں جیتا ہو۔نہ اس شخص کے لیے جسے عام حالات میں اللہ یاد رہے نہ آخرت بلکہ اس کی زندگی کا مقصود دنیا کی لذتیں ہوں۔ہاں اسے کبھی تکلیف پہنچ جائے تو اس تکلیف سے نجات پانے کے لیے وہ وظیفے پڑھنا شروع کر دے اور سمجھے کہ یہ اللہ کی یاد ہے جس سے اسے سکون مل جائے گا۔

چڑھائی

گدھا گاڑی پر اتنا سریہ لدا ہوا تھا جس کا وزن گدھے کے وزن سے کئی گناہ زیادہ تھا۔ گدھا اس بوجھ کو اوپر جاتی ہوئی سڑک پر ڈھوتا ہوا، یہاں تک تو آ گیا، مگر اب اس کی ہمت نے جواب دے دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ گدھے کا مالک اترا اور اسے حرکت میں لانے کے لیے ایک موٹے ڈنڈے سے گدھے کو پیٹنے لگا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب میں وہاں پہنچا۔ یہ میرا روز کا راستہ تھا مگر میری مشینی سواری نے مجھے کبھی اس چڑھائی کے بلند ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ مگر آج اس چڑھائی پر، گدھے پر لدے بوجھ اور اس کے مالک کی بے رحمی نے مجھے تمام انسانوں کے مالک کی رحمت کا ایک نیا رخ دکھایا۔

خدا چاہتا تو انسانوں پر اتنے بوجھ ڈال دیتا کہ انسان کی زندگی درد و الم کی ایک داستان بن کر رہ جاتی۔ بوجھ ڈالنا تو دور کی بات ہے اس نے انسان کو زمین کا اقتدار دے دیا۔ سواریوں کو اس کے لیے مسخر کیا۔ مویشیوں کو اس کے لیے حلال کیا۔ مادہ کو اس کے تصرف میں دے دیا۔ سبزہ و فضا، پانی و ہوا کو اس کی دسترس میں دے دیا۔ غرض زندگی اور بادشاہت کے سارے اسباب اکٹھے کر دیے۔ البتہ یہ مطالبہ کر دیا کہ بندہ کو اطاعت کی چڑھائی چڑھنی ہوگی۔ کیونکہ اطاعت کی یہ اونچی سڑک ہی جنت کو جاتی ہے۔

مگر یہاں بھی اس کی رحمت دیکھیے کہ شریعت کی صورت میں وہ متوازن طریقہ دیا جو اس چڑھائی کے لیے کسی مشینی سواری سے کم نہیں ہے۔ جس میں دین و دنیا کی کوئی علیحدگی نہیں۔ جس میں کھانے پینے، گھر بار، شادی بیاہ، زیب و زینت، سیر و تفریح، کمانے اور خرچ کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ ان چیزوں کو مقصودِ زندگی نہ بناؤ۔ اسراف نہ کرو۔ حد سے نہ گزرو۔ اللہ اور بندوں کے حقوق پورے کرتے رہو۔ اور جب تمہارے مالک کے دین کو تمھاری ضرورت ہو تو منہ نہ موڑو۔

مگر کیا کیجیے۔ انسان نے یہ چڑھائی نہ پہلے کبھی چڑھی نہ آج چڑھنے کے لیے تیار ہے۔ ایسے میں گدھے پر ڈنڈا اٹھانے والا یہ بے رحم انسان اگر اطاعت کی چڑھائی مشینی سواری پر بھی چڑھنے کے لیے تیار نہیں تو پھر اسے خدا کے احتساب کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

کیا آپ تیار ہیں؟

''یہ گاڑی کتنی شاندار ہے''۔ ''یہ لڑکی تو بہت خوبصورت ہے''۔ ''اُس کا بنگلہ تو زبردست ہے''۔ ''آج کل یہ فیشن اِن ہے''۔ ''میں تو گرمیوں کی چھٹیاں ملک سے باہر ہی گزارتا ہوں''۔ یہ اور ان جیسے جملوں کے درمیان آج کے انسان کی زندگی گزر رہی ہے۔ یہ جملے بتاتے ہیں کہ آج کے انسان نے اپنے لیے جینے کی وہ سطح متعین کر لی ہے جو جانوروں کی سطح ہے۔

جانور اپنی پوری زندگی خواہشات کے پیچھے گزارتے ہیں۔ مگر ان کے لیے یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل کی نعمت نہیں دی ہے۔ وہ صرف بھوک اور جنس کی بنیادی جبلت کے تحت ہی اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انہیں اس دنیا میں جینا ہے اور یہیں ختم ہو جانا ہے۔

اس کے برعکس انسان ایک ہمیشہ رہنے والی مخلوق ہے۔ اس کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رہے۔ وہ اللہ کی عبادت کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو ایسی نعمتیں عطا کریں گے جو اس کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیں گی۔ اس جنت میں جانے سے قبل یہ ضروری ہے کہ انسان اس دنیا میں رہ کر خدا کی معرفت حاصل کر لے۔ اس دنیا میں خدا مادی آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ ایسے میں انسان کا مشن پردہ غیب میں چھپے رب کو پانے اور اس کی عظمت کے سامنے جھک جانے کا نام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے انسان کو عقل دی ہے۔ غور و فکر کی صلاحیت دی ہے۔ دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان دیے ہیں۔ یہ سب اس لیے دیے گئے ہیں کہ انسان چاند و سورج کی روشنی میں خدا کے نور کو دیکھے۔ سبزے کی ہریالی میں خدا کی ربوبیت کا اندازہ کرے۔ آسمان کی بلندی میں اس کی عظمت کو پہچانے۔ ستاروں کی چمک میں وہ اس کی قدرت کے جلوے دیکھے۔ ساون کی برسات میں رب کی رحمت کو دیکھے۔ وہ کائنات میں پھیلی نشانیوں کو دیکھے اور رو رو کر اپنے رب کو پکارے۔ اس کی جنت کا طلبگار بنے اور اور اس کے عذاب سے پناہ مانگے۔

مگر انسان کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اپنی عقل اور بصیرت کو خواہش کے اندھے کنویں میں پھینک دیتا ہے۔ پیٹ، جنس اور انا کے بتوں کو معبود بنا کر ساری زندگی ان کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ موت آجاتی ہے۔ ابدی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ مگر اب اس کے پاس سوائے ندامت کے کچھ نہیں رہتا۔

یہ وقت بہت لوگوں پر آچکا ہے۔ آپ پر آنے والا ہے۔ سو کیا آپ خود کو بدلنے کے لیے تیار ہیں؟ آپ اپنی عقل و بصیرت کو تسکینِ خواہش کے بجائے معرفتِ رب کا مشن دینے کے لیے تیار ہیں؟

مچھر اور انسان

انسانوں کو اذیت دینے والے حشرات میں مچھر کا نام بہت نمایاں ہے۔ یہ نہ صرف انسانوں کا خون چوستے ہیں بلکہ اس عمل میں انسانوں کو ایک غیر معمولی تکلیف بھی پہنچاتے ہیں۔ خون چوسنے اور تکلیف پہنچانے کے علاوہ مچھر بعض جان لیوا بیماریوں کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ جیسے ملیریا، زرد بخار اور ڈینگی کی بیماریاں وغیرہ۔

ہمارے ملک پاکستان میں جہاں عوامی مسائل کو حل کرنا، صاحب اقتدار لوگوں کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے، ایک عام آدمی کے پاس صرف یہی راستہ بچتا ہے کہ وہ مضر صحت دھواں اور بو پیدا کرنے والی پروڈکٹس سے مچھروں کو گھر سے بھگانے کی کوشش کرے۔ یہ کوشش اکثر ناکام ہی جاتی ہے اور مچھر بلا خوف وخطر رات بھر انسانوں کو کاٹتے رہتے ہیں۔

مچھر انسانوں کو سوتے ہوئے ہی نہیں، جاگتے ہوئے بھی کاٹ لیتے ہیں۔ مچھر یہ کام اتنی آہستگی سے کرتے ہیں کہ انسان کو اس وقت اس واردات کا پتہ چلتا ہے جب مچھر، دانے اور جلن کی نشانی پیچھے چھوڑ کر اڑ چکا ہوتا ہے۔ ان میں اس قدر پھرتی ہوتی ہے کہ آدمی اگر ہاتھ مار کر انہیں مارنے کی کوشش کرے تو وہ پلک جھپکنے میں اس حملے کی پہنچ سے دور نکل جاتے ہیں۔ تاہم کوئی مچھر اگر خون پی پی کر بہت موٹا ہو جائے یا خون چوسنے کے عمل میں بالکل غافل ہو جائے تو انسان کا تیز رفتار حملہ اسے کچل کر رکھ دیتا ہے۔ خون چوسنے میں حد سے زیادہ انہماک اور غفلت جس طرح مچھر کی موت کا سبب بن جایا کرتا ہے اسی طرح دنیا کمانے میں حد سے زیادہ انہماک اور غفلت انسان کی بربادی کا سبب بن جاتا ہے۔

اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی آزمائش کے لیے بنایا ہے۔ اسبابِ دنیا اس کی زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ لیکن جب انسان آخرت کو بھول کر دنیا کے حصول کو اپنا مقصد بنا لیتا ہے تو پھر غفلت کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اسباب زندگی کا ایک حد سے زیادہ انسان کے پاس اکٹھا ہو جانا اسے شیطان کے لیے تر نوالہ بنا دیتا ہے۔ رزق حرام، لالچ، تکبر، بخل، اسراف اور ان جیسے ان گنت ہتھیار شیطان اپنے ہاتھوں میں لیے انسان کا شکار کرنے کو بیٹھا ہے۔ دنیا کو مقصود بنا لینے والا غافل انسان شیطان کا سب سے آسان ہدف ہوتا ہے۔ اور مچھر جیسا یہ غافل انسان شیطان کے پہلے حملے ہی میں اپنی آخرت گنوا بیٹھتا ہے۔

Idiot Box

آج کل یہ بات عام طور پر کہی جا رہی ہے کہ ٹیلیوژن کے آنے کے بعد کتاب اور قلم کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ عصرِ حاضر میں الیکٹرونک میڈیا کے عام ہونے کے بعد مطالعے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ یہ بات ہماری سوسائٹی کے اعتبار سے ٹھیک ہے مگر اہلِ مغرب کے ہاں آج بھی کتاب علم سیکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ان کے ہاں الیکٹرونک میڈیا خبر، کھیل اور تفریح (Infotainment) کے معاملے میں تو یقیناً بہت زیادہ موثر ہو گیا ہے مگر علم کی دنیا میں آج بھی کتاب و قلم کی حکمرانی ہے۔ان کے ہاں ٹیلیوژن کو Idiot Box کہا جاتا ہے۔اس یقین کی بنا پر کہ بہت زیادہ ٹیلیوژن دیکھنا انسان کی ذہنی سطح کو کم تر کر دیتا ہے۔

Watching too much television causes stupidity.

یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ کیونکہ ٹیلیوژن دیکھنے کے عمل میں انسان اپنی عقل کو، جو اس کا اصل شرف ہے، بہت کم استعمال کرتا ہے۔ جبکہ مطالعہ کرنا ایک بھرپور ذہنی ورزش ہے جس میں انسان کی علمی و عقلی صلاحیتیں بے پناہ بڑھ جاتی ہیں۔

ٹیلیوژن دیکھنے والے شخص کے مقابلے میں کتاب پڑھنے والا شخص اپنے ذہن کا بہت زیادہ استعمال کرتا ہے۔ جب وہ الفاظ پڑھتا ہے تو ان کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔اگر بات سمجھ میں نہ آئے تو دو تین دفعہ رک کر دیکھتا ہے۔اپنے تخیل کو استعمال کر کے وہ ان کو تصورات میں تبدیل کرتا ہے۔ان کا تجزیہ کرتا ہے۔الفاظ نئے ہوں تو ڈکشنری سے ان کے معنی دریافت کرتا ہے۔اس طرح نہ صرف اس کا علم بڑھتا ہے بلکہ اس کی تخیلاتی طاقت (Imagination Power) اس عمل سے مضبوط ہوتی ہے۔اس کی تجزیہ (Analysis) کرنے کی صلاحیت بڑھتی ہے۔ چیزوں کو سمجھنے اور اخذ کرنے کی استعداد میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

جبکہ مطالعہ نہ کرنے اور صرف ٹیلیوژن پر انحصار کرنے والا کبھی اس عمل سے نہیں گزرتا۔ وہ اس

Idiot Box پر ہر چیز اپنے سامنے مجسم دیکھتا ہے۔ ہر پیغام اور ہر واقعہ آواز، تصویر، رنگ اور روشنی کی مدد سے اس طرح اس کے سامنے برہنہ ہو کر آجاتی ہے کہ عقل کا استعمال کرنے کی ضرورت بہت کم ہو جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی ذہنی صلاحیت کو زنگ لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور آخر کار وہ اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ اور وہ حق و باطل اور صحیح و غلط کے درمیان فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی زندگی بس سنی سنائی باتوں میں گزرنے لگتی ہے۔

یہ ہماری قوم کی بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں مطالعے کی روایت جو پہلے ہی بہت کمزور تھی اب کم و بیش ختم ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ اول تو اپنی معاشی اور معاشرتی مصروفیات ہی سے وقت نہیں نکال پاتے۔ اور جو وقت انہیں ملتا بھی ہے وہ ٹیلیوژن کے چینل بدلتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ لوگ بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ ان کے پاس مطالعے کا وقت نہیں ہے یا پھر مطالعہ کرنا انہیں بہت مشکل لگتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص بڑے فخر سے بتائے کہ وہ ورزش نہیں کرتا۔ ایسے شخص کا جسم بے ڈول اور دل کمزور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مطالعہ نہ کرنے والے اور کیبل کے چینل بدلتے رہنے والے افراد ذہنی طور پر اسمارٹ نہیں رہتے۔ ذہنی طور پر پسماندہ ہو جاتے ہیں۔ ذہنی پسماندگی کی اس سے بڑی نشانی کیا ہو سکتی ہے کہ لوگ خود اپنی جہالت کو فخریہ طور پر بیان کرنے لگیں۔

اجتماعی طور پر جس قوم کے افراد میں مطالعہ کی عادت ختم ہو جائے وہاں علم کی روایت کمزور ہو جاتی ہے۔ علم کی مضبوط روایت کے بغیر دنیا کی کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری قوم اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود دنیا میں بہت پیچھے ہے۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے ٹیلیوژن کے سامنے کتاب کو شکست ہو رہی ہے۔ یہ شکست زندگی کے ہر میدان میں ہماری شکست کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ نوشتہ دیوار Writing of Wall ہے۔ مگر کیا کیجیے اسے پڑھنے کے لیے بھی مطالعے کی عادت ہونی چاہیے جو بدقسمتی سے ہم میں نہیں۔

ایسے میں ہر باشعور شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ مطالعے کی عادت کو فروغ دینے کے لیے کوشش کرے۔ آج اس سے بڑی کوئی قومی خدمت ممکن نہیں۔

آرنلڈ شیوازنگر کا سبق

آرنلڈ شوازنگر کا شمار ہالی وڈ کے مقبول ترین فنکاروں میں ہوتا ہے۔آسٹریا سے تعلق رکھنے والے آرنلڈ 30 جولائی 1947 میں پیدا ہوئے۔عملی زندگی کا آغاز ایک باڈی بلڈر کے طور پر کیا اور کئی بین الاقوامی اعزازات حاصل کیے۔1968 میں وہ امریکہ آئے۔ باڈی بلدنگ کے ساتھ انہوں نے فلموں میں آنے کی تگ و دوشروع کردی ۔ 1970 میں انہیں ایک فلم Hercules in New York میں کام کرنے کا موقع ملا۔تاہم ان اصل شہرت 1984 میں منظر عام پر آنے والی فلم The Terminator کے ذریعے سے ہوئی۔ پھر اس میدان میں انہوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

فلمی دنیا میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے بعد انہوں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ یہاں بھی تقدیر ان پر مہربان رہی اور فلم کا ہیرو سیاست کے میدان میں بھی ہیرو بن گیا۔ اکتوبر 2003 میں امریکہ کی ریاست کیلیفورنیا کی گورنری کا تاج ان کے سر سج گیا۔اس وقت وہ کیلیفورنیا کے گورنر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور 2007 میں ہونے والے انتخابات میں بھی اس عہدے کے لیے میدان میں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

حال ہی میں آرنلڈ کے حوالے سے یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ آرنلڈ نے موٹر سائیکل کا لائسنس بنوانے کا ارادہ کیا۔وہ آخر کار اس مقصد میں کامیاب ہو گئے مگر اس کے لیے انہیں چھ مہینے تک مختلف عملی اور تحریری امتحانات سے گزرنا پڑا۔

اہل پاکستان کے لیے یقیناً یہ ایک انتہائی عجیب وغریب خبر ہے۔اس لیے کہ ہمارے ملک میں کسی گورنر کو اول تو کسی قسم کے لائسنس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر ضرورت پیش آ جائے تو امتحان سے گزرنا تو دور کی بات ہے، متعلقہ ڈپارٹمنٹ کا اعلیٰ ترین افسر اس کی خدمت میں پیش ہو کر لائسنس اس کے قدموں میں رکھ دے گا۔ معاملہ صرف لائسنس بنوانے تک محدود نہیں ، زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو، حکمران طبقے کے لیے ہمارے ملک میں کوئی قانون نہیں ہوتا۔ان کے لیے ہر جگہ ہر قانون

معطل کر دیا جاتا ہے۔تاہم معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں حکمرانوں نے اپنے لیے یہ انداز پسند کرلیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں قانون کی حکمرانیRule of Law کو کبھی ایک معاشرتی قدر کے طور پر پیش ہی نہیں کیا گیا۔یہی سبب ہے کہ بظاہر لوگ اس طرح کے واقعات پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں مگر جیسے ہی انہیں موقع ملتا ہے وہ خود بھی اسی طرح قانون کو پامال کرتے ہیں۔آپ دیکھ لیجیے کہ عوام کی خدمت کا نعرہ لگانے والے لوگوں سے لے کر اسلام کے نام پر منتخب ہونے والے لوگ جب اقتدار میں آتے ہیں تو ان کے لیے اسی طرح قانون معطل ہوجاتا ہے جس طرح ایک فوجی حکمران کے لیے ہوجاتا ہے۔

یہی معاملہ عوام الناس کا ہے۔انفرادی طور جب کبھی اور جتنا کبھی انہیں اختیار ملتا ہے وہ یہی پسند کرتے ہیں کہ انہیں قانون کی پاسداری نہ کرنی پڑے۔چونکہ حکمران قانون نافذ کرنے والے اداروں پر اختیار رکھتے ہیں اس لیے ان کے لیے بڑا آسان ہوتا ہے کہ وہ قانون کو جب چاہیں اپنے لیے معطل کردیں۔عوام کو یہ اختیار کم کم ملتا ہے مگر جب کبھی ملتا ہے ان کا رویہ حکمرانوں سے قطعاً مختلف نہیں ہوتا۔یہی وہ رویہ ہے جسے ہم قانون کی حکمرانی کا ایک قدر کے طور پر نہ ہونے سے تعبیر کررہے ہیں۔

دنیا میں کوئی قوم قانون کی پاسداری کے بغیر ترقی نہیں کرسکتی۔قانون کی حکمرانی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب فیصلہ فرد کی حیثیت کے بنیاد پر نہیں ہوگا بلکہ اصول اور ضابطہ پر ہوگا۔قانون کی حکمرانی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب کمزور بھی طاقتور کے برابر کا مقام رکھتا ہے۔یہی وہ چیز ہے جو معاشرے میں فساد کو پھیلنے سے روکتی ہے۔اس لیے کہ فساد اصل میں طاقتور لوگ پھیلاتے ہیں۔قانون کی حکمرانی ان کی طاقت کو محدود کردیتی ہے۔

زندہ قومیں جس قدر کو معاشرے میں سب سے پہلے عام کرتی ہیں وہ یہی رول آف لا ہے۔ہمیں اگر اپنے ملک میں سے ظلم اور ناانصافی کو ختم کرنا ہے تو اس کے لیے رول آف لا کو سب سے بڑا مقام دینا ہوگا۔اس کے بغیر امن اور انصاف کا خواب کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

نظام اور شعور

امریکہ یورپ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں لائن بنانا روزمرہ زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ وہاں لوگ بس کا انتظار کر رہے ہوں، کھانے پینے کی اشیاء خرید رہے ہوں یا عام ضرورت کی کسی اور شے کو استعمال کر رہے ہوں، جہاں چند آدمی اکٹھے ہوتے ہیں لائن بنا لیتے ہیں۔

ہمارے جیسے ترقی پذیر ممالک کے شہری جب مغربی ممالک میں جاتے ہیں تو ان لوگوں کی قطار پسندی سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ وہ ان کے نظام کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ پاتے۔ تاہم مسلمانوں کے پاس اس ڈسپلن کا ایک زیادہ متاثر کن نمونہ دنیا کو دکھانے کے لیے موجود ہے۔ دن میں پانچ دفعہ مسلمان تکبیر شروع ہونے کے بعد چند لمحوں میں، ایک بے ترتیب گروہ سے صف در صف منظّم اجتماع میں بدل جاتے ہیں۔ ایک امام کی پکار پر وہ انتہائی منظّم طریقے سے نماز ادا کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک قابل دید نظارہ ہوتا ہے۔ یہ کسی عام نماز کا ذکر نہیں جس میں چند مسلمان شریک ہوں، جمعہ میں سیکڑوں، عید پر ہزاروں اور حرم میں لاکھوں کے اجتماع میں بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف منظر نہیں ہوتا۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی مسلمان جب مسجد سے نکلتے ہیں تو قدم قدم پر اپنے عمل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ گویا لائن بنا کر کھڑا ہونا ایک جرم ہے۔ کسی تقریب میں کھانا شروع ہوتے وقت ہلڑ بازی اور رش کے اوقات میں بسوں میں چڑھتے وقت کی دھکم پیل ہماری ثقافتی اقدار بن چکی ہیں۔ جن جگہوں پر مجبوراً لائن بنانا پڑتی ہے وہاں بھی لوگ لائن سے باہر ہی کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں تاکہ دامن تہمتِ قطار سے آلودہ نہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ مسلمان جن کے پاس نماز جیسا اعلیٰ تربیتی نظام موجود ہے، ایسا طرزِ عمل کیوں اختیار کرتے ہیں، جبکہ اہلِ مغرب جو اقامت صلوٰۃ کے تصور سے بھی واقف نہیں ہیں، اس درجے ڈسپلن کیسے قائم کر لیتے ہیں؟ جن لوگوں نے مغرب کا سفر کیا ہے اور وہ پاکستانی جو مغرب

میں مقیم ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ ان کے نظام کی خوبی ہے، مگر میں اس تجزیئے سے اتفاق نہیں کر سکا۔ میں نے مغرب میں اپنے قیام کے دوران میں ایسا کوئی نظام نہیں دیکھا جو لوگوں کو لائن بنانے پر مجبور کرتا ہو۔ یہ دراصل ان کے شعور کی پختگی ہے جو انہیں بتاتی ہے کہ لائن بنانے میں سب کا فائدہ ہے۔ لائن نہیں بنے گی تو سب کو تکلیف ہوگی۔ خاص طور پر ضعیف، بزرگ، معذور، عورتیں اور بچے محروم رہ جائیں گے۔ چنانچہ وہ اپنے اس شعور کی وجہ سے لائن بناتے ہیں نہ کہ کسی نظام کی وجہ سے۔ دوسری طرف مسلمان نماز جیسی اعلیٰ تربیتی عبادت بھی بے شعوری کے عالم میں ادا کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اس سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھ پاتے۔ دورانِ نماز میں آخری درجے کا ڈسپلن قائم کرنے والے نماز سے باہر ابتدائی درجے کا بھی ڈسپلن قائم نہیں کر پاتے۔

اصل میں یہ عمدہ نظام نہیں ہوتا جو اعلیٰ شعور دیتا ہے، یہ اعلیٰ شعور ہوتا ہے جو عمدہ نظام دیتا ہے۔ اور وقت اور حالات کے اعتبار سے یہ نظام اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ مغرب کی کامیاب زندگی میں اس بات کا بڑا عمدہ سبق ہے۔ اس بات کو ایک اور مثال سے سمجھیں۔ امریکہ کینیڈا کے بڑے شہروں میں پبلک ٹرانسپورٹ، بس اور زمین دوز ریلوے پر مشتمل ہوتا ہے، جسے ''سب وے'' کہتے ہیں۔ یہ لوگ بس میں ہمیشہ لائن بنا کر چڑھتے ہیں البتہ سب وے میں کبھی لائن نہیں بنائی جاتی۔ کیونکہ وہاں ٹرین چند لمحے کے لیے رکتی ہے۔ اگر لائن بنائی جائے گی تو اکثر لوگ ٹرین میں سوار ہونے سے رہ جائیں گے۔ لہٰذا وہاں کا اصول یہ ہے کہ سب وے پر لوگ بکھر کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ٹرین آنے پر پہلے اترنے والوں کو اترنے دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد لوگ تیزی سے اپنے سامنے کھڑی بوگی کے خالی دروازے سے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔

اپنے نتائج و اثرات کے اعتبار سے یہ انتہائی غیر معمولی بات ہے۔ اس بات کو سمجھنے کی بڑی اہمیت ہے کہ نظام سے لوگ باشعور نہیں ہوتے، شعور سے نظام تشکیل پاتا ہے، اسی سے

پروان چڑھتا اور اسی سے برقرار رہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اجتماعی زندگی میں انسان کے اندر شعور جب باہر اپنا اظہار کرتا ہے تو نظام کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مغرب کا نظام صدیوں کے تجربات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شعور سے تشکیل پایا ہے۔ اب بھی اس نظام کو کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے تو اس کا اجتماعی شعور حرکت میں آجاتا ہے اور اس صورتِ حال کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لیتا ہے۔

مسلمانوں کی اپنی تاریخ بھی اس سے کچھ مختلف سبق نہیں دیتی۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ اس شعور کی بنیادیں الہامی تھیں، جنہیں کسی قسم کے تجربے سے گذرنے کی ضرورت نہیں پڑی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید و آخرت کے اسلامی شعور کی بنیاد پر لوگوں کو اٹھایا اور جب ان لوگوں نے ایک معاشرہ تشکیل دیا تو اس کے اندر اپنے تمدن و حالات کے اعتبار سے ایک بہترین نظام کو جنم دیا۔

آج اگر کرنے کا کوئی کام ہے تو یہی ہے کہ توحید و آخرت کی بنیاد پر مسلمانوں کے اجتماعی شعور کی تربیت کی جائے۔ اس کے جو نتائج نکلیں گے ان میں سے ایک یہ بھی ہوگا کہ اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ایک نظام دنیا کے سامنے آجائے گا۔ جس کے فیوض و برکات سے ایک عالم فیض یاب ہوگا۔

''کیا تم نے اُس شخص کو دیکھا جس نے خواہشِ نفس کو معبود بنا رکھا ہے۔''،
(فرقان:43)

''بھلا تم نے اُس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے بوجھنے کے (گمراہ ہو رہا ہے تو) خدا نے (بھی) اس کو گمراہ کر دیا۔''، (جاثیہ:23)

ایسا نہ ہو کہ......

یہ پرانے زمانے کا کوئی وحشیانہ سماج نہیں پاکستان میں مسلمانوں کا سماج ہے جہاں ایک پولیو زدہ پیروں سے معذور عورت کو اغوا کیا جاتا ہے۔ دس دن تک اس کو قید میں رکھ کر اجتماعی آبرو ریزی کی جاتی ہے اور پھر سڑک پر پھینک دیا جاتا ہے۔

یہ کوئی غیر مسلم ملک نہیں مملکت خداداد پاکستان ہے جہاں نسائیت کی منزل سے بہت دور ایک معصوم بچی کو اغوا کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے اور پھر قتل کر کے گندے نالے میں پھینک دیا جاتا ہے۔

ایک حساس دل شخص یہ سب کچھ پڑھ کر اور سن کر تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ ایسے مجرموں کی سر عام پھانسی کا مطالبہ کر کے دل کو مطمئن کرتا ہے۔ مگر لوگ یہ نہیں سوچتے کہ معاشرے کے دامن پر لگے یہ داغ اس گندگی سے پیدا ہو رہے ہیں جو میڈیا فحاشی اور عریانی کی شکل میں معاشرے میں پھیلا رہا ہے۔ آج کے ڈرامے اور فلمیں اپنے اندر سوائے شہوانیت اور تشدد کے انسان کو اور کوئی ذوق نہیں دیتے۔ یہ ذوق کچھ لوگوں کے ذہنوں تک محدود رہتا ہے۔ کچھ کی نگاہوں تک اور کچھ بدنصیب لوگوں میں یہ ایک ایسی وحشت میں تبدیل ہوتا ہے جہاں انسان، انسان نہیں رہتا، درندہ بن جاتا ہے۔

یہ درندگی بڑھتی رہے گی جب تک ہم اپنے اپنے بیڈ روم میں بیٹھ کر ٹی وی کے چینل بدلتے رہیں گے۔ تفریح کے نام پر گندگی سے خود کو آلودہ کرتے رہیں گے۔ ہم اخباروں میں ایسی خبریں پڑھ کر کانوں کو ہاتھ لگائیں گے اور ذہن کے تاریک گوشوں اور نظر کی بے حجاب گلیوں میں لذتِ نفس کی دکان سجاتے رہیں گے۔

ہم معاشرے میں پھیلے ہوئے گند کو صاف نہیں کر سکتے۔ مگر اپنے آپ کو اس گند سے

ضرور بچا سکتے ہیں۔ ہم معاشرے سے ایسے درندوں کا خاتمہ نہیں کر سکتے، مگر اپنے اندر موجود وحشی کو لگام ضرور دے سکتے ہیں۔

آیئے! اپنے جذبات کا رخ دائرہ احتجاج سے نکال کر دائرہ عمل کی طرف موڑتے ہیں۔ جو ممکن نہیں اسے چھوڑ کر، اُس کی کوشش کرتے ہیں جو عین ممکن ہے۔ اس لیے کہ عنقریب ہمارا واسطہ ایک ایسی ہستی سے پڑنے والا ہے جو نگاہوں کی خیانتوں کو بھی جانتی ہے اور سینوں میں چھپے خیالات کو بھی۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارے اندر کے وحشی کو وہی سزا دے ڈالے، جو ہم دوسروں کو دینا چاہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ، لَااِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ، خَلَقْتَنِیْ وَ اَنَا عَبْدُكَ وَ اَنَا عَلٰی عَھْدِكَ وَ وَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَیَّ وَ اَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِیْ، اِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ۔

’’اے اللہ، تو میرا پروردگار ہے؛ تیرے سوا کوئی الہ نہیں؛ تو نے مجھے پیدا کیا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں اور اپنی استطاعت کے مطابق تیرے عہد اور وعدے پر قائم ہوں؛ میں اپنے اعمال کی برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں؛ اپنے اوپر تیری نعمتوں کا اعتراف اور اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں؛ تو مجھے بخش دے، اِس لیے کہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو معاف نہیں کرتا۔‘‘، (بخاری، رقم: 6306)

دل کا قبرستان

ساون کی رت آئی اور آسمان نے بادلوں کی رِدا اوڑھ لی۔ ہوا کی خنکی نے پیاسی زمین کو پیام زندگی بھیجا اور ابر رحمت نے برسنا شروع کر دیا۔ تپتی ہوئی دھرتی کا آنچل تر ہو گیا۔ نرم زمین کا سینہ شق کر کے کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ پھر یہ مٹیالا آنچل سبز ہو گیا۔ مردہ زمین زندہ ہو گئی۔

وہ کہتا ہے کہ میں ایسے ہی ایک روز ہر مردہ کو زندہ کر دوں گا۔ پھر ہر نفس کے ایک ایک لمحہ زندگی کا حساب کروں گا۔ وہ غلط نہیں کہتا۔ جو مردہ زمین کو زندہ کر سکتا ہے، وہ مردہ انسانوں کو بھی اٹھا سکتا ہے۔ جو بارش کے ہر قطرہ اور درخت کے ہر پتے کو گن سکتا ہے، وہ زندگی کے ہر لمحہ کا حساب بھی کر سکتا ہے۔

بندے نے سرسبز زمین کو دیکھا، نظر اٹھائی اور کہا، ''تجھے معلوم ہے کہ مردے صرف زمین ہی میں دفن نہیں ہوتے۔ ایک قبرستان اور بھی ہوتا ہے۔ یہ خواہشوں کا قبرستان ہے جو بندۂ مومن کے سینے میں جنم لیتا ہے۔ اس قبرستان میں کتنی امنگیں، کتنی خواہشیں، کتنے خواب اور کتنی رنگینیاں صرف تیرے لیے دفن کی جاتی ہیں۔ کیا تو اُس دن اِن کو بھی زندہ کرے گا؟''

''تمھارے سینے کی ہر خلش کو ہم کھینچ لیں گے'' (الاعراف 43:7)۔ آسمان کی جگہ قرآن نے جواب دیا۔ کیونکہ اب قیامت تک قرآن ہی نے بولنا ہے۔ شیطان نے دیکھا کہ بات بن رہی ہے تو وہ بات بگاڑنے آ گیا۔ سوالات کا ایک انبار اس کے سامنے رکھ دیا۔ بندہ پھر بندہ ہے۔ سوالات کے طوفان میں اس کی کشتی ڈولنے لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کی جنت خدا بنائے گا۔ بہت خوب بنائے گا، مگر اپنی خواہش اور اپنی مرضی سے بنائے گا۔ تو پھر میری مرضی اور میری خواہش کا کیا ہوگا۔ دیر تک جواب نہ ملا تو خاموشی سے سر جھکا کر آگے بڑھ گیا۔

''مگر اسی لمحے ایک جھونکا آیا اور اپنے نرم لمس میں یہ پیغام چھوڑ گیا۔ جنت ہماری ہوگی، مگر مرضی تمھاری ہوگی۔ ہمیں اپنے بندوں کو نہ کہنے کی عادت نہیں۔ اور ہماری راہ میں کسی اگر اور مگر کی دیوار بھی نہیں آ سکتی۔ وہاں جو تمھارا جی چاہے گا، ملے گا اور جو مانگو گے، پاؤ گے''۔(29:89,32:41)۔

بندے نے سنا اور دل کے قبرستان میں مزید قبریں بنانے کا حوصلہ پیدا ہو گیا۔

بچہ اور ماں

موٹر سائیکل ایک بڑی خطرناک سواری ہے۔ یہ گاڑی کی طرح تیز رفتار ہوتی ہے مگر صرف دو پہیوں کی بنا پر اس کا توازن برقرار رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ موٹر سائیکل چلانے والے سے زیادہ اس کے پیچھے بیٹھی خواتین خطرے کی زد میں ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ موٹر سائیکل پر ایک طرف رخ کر کے بیٹھتی ہیں اور ہیلمٹ بھی نہیں پہنتیں۔ بعض اوقات خاتون کی گود میں کوئی شیر خوار بچہ بھی ہوتا ہے۔ خاتون ایک ہاتھ سے خود کو اور دوسرے ہاتھ سے اپنے معصوم بچے کو سنبھالتی ہے۔

سڑک پر جاتے ہوئے مجھے یہ منظر ہمیشہ اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اس لیے کہ ان تینوں میں سب سے زیادہ غیر محفوظ یہی بچہ ہوتا ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہی غیر محفوظ بچہ سب سے زیادہ بے فکر بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے باپ نے موٹر سائیکل کا اور اس کی ماں نے اس کا سارا بوجھ اپنے اوپر لے کر اسے ہر فکر سے آزاد کر رکھا ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جب یہ بچہ بڑا ہوگا تو اسے اپنے ماں باپ کی مہربانیوں کا احساس ہوگا اور وہ اپنی بساط کی حد تک ان کے احسانات کا جواب دینے کی کوشش کرے گا۔

اس منظر کو دیکھ کر ساتھ ہی مجھے یہ خیال بھی آتا ہے کہ تمام انسان ایک دوسری سواری پر بھی سوار ہیں۔ یہ زمین ہے جو بغیر پہیوں کے خلا میں معلق ہے اور موٹر سائیکل کی رفتار سے ہزاروں گنا زیادہ تیزی سے حرکت کر رہی ہے۔ مگر ایک تھامنے والا اس پر سوار انسانوں کو تھامے ہوئے ہے۔ لاکھوں برس سے یہ سواری اس طرح ہموار چلی جا رہی ہے کہ وہ نہ سواریوں کو جھٹکے دیتا اور نہ انہیں گرنے ہی دیتا ہے۔

مگر یہ انسان جو اخلاقی حس رکھتا ہے، ماں باپ کا حق پہچانتا ہے، اُس مہربان کی دیگر تمام نعمتوں کی طرح اِس نعمت سے بھی منہ پھیر لیتا ہے۔ وہ زمین کی اس سواری کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ اسے یہ کوئی احسان محسوس نہیں ہوتا۔ اسے بتا بھی دیا جائے کہ وہ ستر ماؤں سے بڑھ کر تمھیں چاہتا ہے۔ اس لیے تم پر لازم ہے کہ تم بھی ماں سے ستر گناہ زیادہ اس سے محبت کرو۔ اس کا شکر کرو۔ مگر انسان اس کے لیے صبح و شام شکریے کے دو لفظ کہنا گوارا نہیں کرتا۔ حالانکہ اس کا شکریہ تو جان دے کر بھی ادا نہیں ہو سکتا۔

کتنا عجیب ہے وہ مہربان اور کتنا عجیب ہے یہ انسان۔

اصل خبر

یہ حادثے کے شکار ایک ہوائی جہاز کی تصویر تھی۔طیارے کا ملبہ اور ہلاک شدگان کی لاشیں جائے حادثہ پر بکھری پڑیں تھیں۔آگ بجھانیوالا عملہ شاید کچھ جلدی آ گیا تھا۔اس لیے ان لاشوں کے جھلسنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔لیکن آگ بجھنے سے قبل ان کے لباس کے علاوہ سر کے بال اور اور جسم کی کھال کو بھی چٹ کر چکی تھی۔

یہ ایک بہت بھیانک تصویر تھی۔مگر اس تصویر میں ایک یاددہانی بھی تھی۔ یہ یاددہانی جہنم کی اُس آگ کی تھی جو اللہ تعالیٰ نے مجرموں کے لیے تیار کر رکھی ہے۔سورہ معارج میں ہے کہ یہ وہ آگ ہے جس کی لپیٹ ہی چمڑی ادھیڑ ڈالے گی۔ وہ پکار پکار کر ان لوگوں کو بلائے گی جو حق کو نظر انداز کرتے اور مال کو جمع کرتے ہوں گے۔

عام طور پر جہاز میں آسودہ حال لوگ سفر کرتے ہیں۔ عام لوگوں کے لیے مالداروں کے طبقے میں شامل ہونا زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ حلال وحرام کی پرواہ کیے بغیر مال جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ مال اور اس سے ملنے والی راحتیں اور آسانیاں ان کی کھال کو موٹا کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ وہ بے حس ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔انہیں خدا یاد رہتا ہے اور نہ روز قیامت۔ وہ ان سے بے نیاز ظلم و عدوان کی زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ زندگی کا جہاز ایک روز اچانک بغیر کسی اطلاع کے زمیں بوس ہو جاتا ہے۔

پھر انسان رہ جاتا ہے اور وہ آگ جس کی پسندیدہ غذا یہ موٹی کھال ہوتی ہے۔اور آج تو سائنس نے یہ بتا دیا ہے کہ آگ کی جلن کا سارا عذاب صرف یہ کھال محسوس کرتی ہے۔اسی لیے جب جب یہ کھال جھلس جائے گی اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ پیدا کر دیں گے۔(النساء 56:4)

قرآن نازل ہی اس لیے ہوا تھا کہ حرام کھا کر مال اکٹھا اور کھال کو موٹا کرنے والوں کو اس آگ کی خبر دیدے۔ جب لوگ قرآن نہیں پڑھتے تو کوئی طیارہ گر جاتا ہے تاکہ یہ خبر اخبار میں آ جائے۔مگر افسوس کہ لوگ اخبار میں بھی سب کچھ پڑھتے ہیں، اصل خبر نہیں پڑھتے۔

گیلی لکڑیاں

ہوا، آگ، پانی اور مٹی زندگی کے بنیادی عناصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کیا ہے کہ کرہ ارض پر زندگی کے یہ تمام بنیادی عناصر کثرت سے موجود رہیں۔ تاہم ان عناصر میں سے آگ ایک ایسا عنصر ہے جو حرارت کی شکل میں تو سورج سے تمام جانداروں کو براہِ راست ملتا رہتا ہے، مگر آگ کی شکل میں یہ عام دستیاب نہیں ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے وہ ایندھن بافراط اس دھرتی پر رکھ دیا ہے جس سے انسان آگ حاصل کر سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں قدرتی گیس آگ کے حصول کے لیے سب سے زیادہ سستے ایندھن کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ تاہم اس سے قبل انسانی تاریخ کے تمام عرصے میں آگ کے لیے ایندھن کے طور پر لکڑیاں ہی استعمال ہوتی رہی ہیں۔ ہزاروں سال تک انسان جنگلات اور درختوں سے لکڑیوں کو کاٹتے اور ان سے اپنے گھر اور چولہے گرم رکھتے رہے ہیں۔ آج بھی ان علاقوں میں جہاں گیس موجود نہیں یہی ایندھن آگ کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔

جن لوگوں نے لکڑی کو ایندھن کے طور پر استعمال ہوتے دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ لکڑی پر پانی کا پڑنا اسے ایندھن کے طور پر استعمال کے قابل نہیں رہنے دیتا۔ لکڑی جتنی خشک ہوگی، اتنی ہی جلدی اور تیز آگ پیدا کرنے کا سبب بنے گی۔ لکڑی گیلی ہو جائے تو وہ جلتی نہیں۔ جل بھی جائے تو آگ کم اور دھواں زیادہ دیتی ہے۔

دورِ جدید کے مسلمانوں کی دینداری کا معاملہ بھی گیلی لکڑیوں سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کر رکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک گروہ اسلام کا علمبردار بن کر دنیا میں رہے۔ اسلام کے چمن میں مسلمانوں کی فصل درختوں کی شکل میں پیدا ہوتی رہے۔ یہ لوگ اپنے وجود کو ایندھن کی طرح جلا کر ہدایت کی روشنی برقرار رکھیں۔ مگر بدقسمتی سے آج کا مسلمان اپنا مقصدِ حیات بھول گیا ہے۔ اس نے اپنے وجود میں خواہشات اور تعصّبات کی نمی کو اس طرح جذب کر لیا ہے کہ اب وہ خدا کے کام کے لیے ایک گیلی لکڑی بن چکا

ہے۔ اور ایسی لکڑی اول تو ایندھن کے طور پر استعمال ہونے کے قابل رہتی نہیں اور اگر کی بھی جائے تو اس سے آگ کے بجائے دھواں نکلتا ہے۔

ایمان کی آگ، عمل صالح کی حرارت اور اخلاقِ حسنہ کی روشنی صرف اس وجود سے پھوٹتی ہے جس نے مفادات، خواہشات اور تعصّبات کی ہر نمی سے خود کو پاک کرلیا ہو۔ یہ پاک وجود دنیا میں رہتا اور اس سے استفادہ کرتا ہے، مگر اسے اپنا مقصود نہیں بناتا۔ وہ خواہشات نفسانی کو اپنا معبود نہیں بناتا۔ وہ حیوانی جذبات کو زندگی کا محور نہیں بناتا۔ وہ مادی لذات کو زندگی کا مرکز نہیں بناتا۔

ایسا بندۂ مومن دنیا کو سرائے سمجھ کر زندگی بسر کرتا ہے۔ دنیا کی رنگینیاں اسے اپنی جانب کھینچتی ہیں، مگر وہ ان کے عارضی حسن کے لیے جنت کی ابدی بادشاہی کا نقصان اٹھانا گوارا نہیں کرتا۔ اس کے ہر لمحے، پیسے اور صلاحیت کا بہترین مصرف یہ ہوتا ہے کہ اس سے جنت حاصل کی جائے۔ ایسا شخص تارک الدنیا تو نہیں ہوتا۔ وہ شادی کرتا، گھر بناتا اور معاش کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ مگر وہ جانتا ہے کہ اسے حدود میں جینا ہے، ہوس میں نہیں۔ ضرورت میں جینا ہے خواہش میں نہیں۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ہی اس کے امتحان کا پرچہ ہے۔ یہ پرچہ اگر نہیں دیا تو آخرت کی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ مگر وہ جانتا ہے کہ بہر حال یہ دنیا کمرۂ امتحان ہے، کمرۂ آرام نہیں۔ یہی یقین اسے خدا کے کام کے لیے خشک لکڑی بنا دیتا ہے۔

دوسری طرف جو لوگ آخرت کو مقصود کے مقام سے ہٹا دیں، وہ جتنی بھی دینداری اختیار کرلیں، ان کی دینداری سے آگ کے بجائے دھواں پیدا ہوتا ہے۔ وہ دھواں جس سے حرات پیدا ہوتی ہے نہ روشنی۔ یہ لوگ انفاق کرتے ہیں، مگر ریا کاری کے ساتھ، یہ لوگ عبادت کرتے ہیں، مگر غفلت کے ساتھ، یہ لوگ نصرت دین کے لیے اٹھتے ہیں، مگر تعصّبات کے ساتھ۔ ان کی تمام تر دینداری ان کی خواہشات اور جذبات کے تابع ہی ہوتی ہے۔

ایسی گیلی لکڑیاں دنیا میں ایندھن نہیں بن پاتیں۔ البتہ قیامت کے دن وہ ضرور ایندھن بنیں گی، مگر یہ ایندھن جہنم کا ہوگا۔ وہ جہنم جہاں انسان اور پتھر ایک ساتھ جلائے جائیں گے۔

نیا آدمی نئی قوم

’’آج دنیا بھر میں مسلمانوں کے خلاف ظلم ہورہا ہے۔ یہود وہنود، امریکہ روس، مغربی میڈیا سب اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مشغول ہیں۔آپ دیکھیے کہ کشمیر سے بوسنیا اور فلسطین سے چیچنیا تک ہر جگہ مسلمان جبر کی زد میں ہیں۔ساری دنیا کی طاقتیں مسلمانوں کی دشمن بنی ہوئی ہیں۔ ہر جگہ وہ ظلم کا شکار ہیں۔اس کا تازہ ترین نمونہ افغانستان اور پھر عراق پر امریکہ کے مظالم ہیں۔‘‘

یہ صاحب بے تکان بول رہے تھے اور میں خاموشی سے بیٹھا سن رہا تھا۔ جب وہ بول چکے تو میں نے ان کی بارگاہ میں عرض کیا: کبھی آپ نے غور کیا کہ جتنے مظالم غیر مسلم کررہے ہیں، مسلمان خود مسلمانوں کے ساتھ اس سے زیادہ ظلم کررہے ہیں۔ایران وعراق کی آٹھ سالہ جنگ آپ کے پڑوس میں لڑی گئی۔ قیام بنگلہ دیش کے وقت جان، مال اور آبرو کی بربادی کی داستانیں تاریخ کے خونی ورق پر آج بھی رقم ہیں۔ پھر یہ بتایئے کہ آپ کے جاگیردارانہ نظام میں جان مال اور آبرو کے خلاف ہونے والا کون سا ظلم ہے جو نہیں ہوتا۔ چوری، رہزنی، ڈاکہ، زنا بالجبر اور قتل کی وارداتیں آپ کے شہروں کے معمولات میں شامل ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ آپ کے ہاں انسانوں کو زندگی گزارنے کی بنیادی انسانی ضروریات بھی میسر نہیں۔صاف پانی، تعلیم، روزگار، علاج ومعالجہ اور انصاف جیسی چیزیں جو معاشرے کے لیے ناگزیر ہیں، آپ کے ہاں ایک غریب آدمی کی پہنچ سے باہر ہیں۔آپ غریب ہیں تو اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم نہیں دلا سکتے۔ سفارش نہیں ہے تو ملازمت نہیں مل سکتی۔کوئی بڑی بیماری ہوجائے تو مرنے والا تو مرتا ہے مگر پورے خاندان کا دیوالیہ کرا دیتا ہے۔کوئی پوچھنے نہیں آتا۔آپ پر اگر کوئی ظلم ہوجائے تو پولیس کا تصور ہی دہشت زدہ کردیتا ہے۔ برسوں کچہری عدالت کے چکر لگا کر بھی انصاف نہیں مل پاتا۔ پھر ان سب کے ساتھ رشوت، ملاوٹ، کرپشن اور ان جیسے کتنے ہی مسائل ہیں جنھوں نے ایک عام آدمی کی زندگی کو مسائل کا جہنم بنا رکھا ہے۔

اگر آپ ایک کیلکو لیٹر اٹھائیں اور مسلمانوں کے مسائل کو شمار کرنا شروع کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جو مسائل و مصائب ہم غیر مسلموں کے ہاتھوں جھیل رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ مسائل وہ ہیں جو آج مسلمانوں نے خود اپنے لوگوں کے لیے پیدا کر رکھے ہیں۔

انہوں نے میری بات پوری نہیں ہونے دی اور کہنے لگے۔ یہ سارے مسائل جو تم نے گنوائے ہیں دراصل امریکی اور مغربی سازشوں کا نتیجہ ہیں۔امریکہ اور اس کے حواریوں کا صرف ایک علاج ہے۔ان کے خلاف جہاد ہونا چاہیے۔جب امریکہ کا ناپاک وجود مٹ جائے گا تو ہمارے سارے مسائل بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔

میں نے ان سے کہا کہ پہلے دنیا بھر کے مسلمانوں پر برطانیہ مسلط تھا۔اس کے خاتمے کے بعد بھی ہمارے مسائل ایسے ہی رہے۔پھر سوویت یونین مسلط ہوا۔اس کے خاتمے کے بعد بھی ہمارے مسائل ایسے ہی رہے۔اب اگر امریکہ بھی ختم ہو جاتا ہے تو ہمارے مسائل پھر بھی ختم نہیں ہوں گے۔

آپ سوچیے کہ آپ جن طاقتوں کی بات کر رہے ہیں اگر وہ ظلم کر بھی رہی ہیں تو تنہا آپ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجھے بتائیے کہ آپ امریکہ، روس، ہندوستان اور مغرب کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔جبکہ آپ اگر فیصلہ کر لیں کہ آپ اپنے معاشرے کی اصلاح کر لیں تو کم از کم اپنے اردگرد آپ کئی درجے اعلیٰ سیرت و اخلاق کے لوگ پیدا کر سکتے ہیں جو نہ جانے کتنے بندگان خدا کی مشکلات دور کریں گے۔ کتنے معذوروں، بیواؤں، یتیموں، مسکینوں اور ضعیفوں کا سہارا بنیں گے۔کتنے بیماروں کا علاج کرا کر ان کی زندگی بچائیں گے۔کتنی بے آسرا لڑکیوں کی شادیاں کرا کے ان کا خاندان بسائیں گے۔ کتنے نوجوانوں کو تعلیم دلا کر ان کی زندگی سنواریں گے۔کتنے لوگوں کو جنت کے راستے تک پہنچا دیں گے۔

ہمیں اپنی تعمیر کرنی ہے۔یہ تعمیر نفرت اور تخریب کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔اٹھیے اور اپنے اردگرد محبت پھیلانا شروع کیجیے۔لوگوں کی اخلاقی تربیت کیجیے۔انہیں اچھا انسان بنائیے۔زندگی میں کم از کم ایک انسان کی زندگی میں اجالا کر دیجیے۔آپ دیکھیں گے کہ پھر اس چراغ سے کتنے چراغ جلیں گے۔

وہ کچھ نہ بولے اور سر جھکا دیا۔ایک نیا آدمی پیدا ہو گیا۔ایک نئی قوم پیدا ہو گئی۔

ہر کرسی پر فرعون بیٹھا ہے

ہمارے ملک میں عرصے سے کرپشن کا شور ہے۔ بالخصوص سیاست دان اور اعلیٰ فوجی اور سول افسران اس حوالے سے کافی بدنام ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ ایسے نہیں ہوں گے۔ ان میں یقیناً ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ہر اعتبار سے کرپٹ اور بے ایمان ہیں۔ انہوں نے ملک و قوم کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے۔ کچھ نے اس صفائی سے لوٹا کہ کوئی نشان تک نہیں چھوڑا اور کچھ نے اس دھڑلے سے لوٹا کہ بڑے بڑے بے ایمانوں نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔

تاہم یہ کہنا کہ پوری قوم آج صرف ان لوگوں کی بداعمالیوں کو بھگت رہی ہے، صحیح نہیں ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یہاں جس کرسی پر جو شخص بیٹھا ہے، وقت پڑنے پر وہ اپنی جگہ ایک فرعون ثابت ہوتا ہے۔ یہ صرف کسی اونچی حیثیت کے حامل شخص کی بات نہیں، ہمارے ہاں ایک کلرک، ایک کانسٹیبل، ایک ٹھیلہ لگانے والا بھی درحقیقت وہی سب کچھ کرتا ہے، جس کی وجہ سے اعلیٰ عہدے دار بدنام ہیں۔ کرپشن، بددیانتی اور اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی جتنی بڑے لوگ کرتے ہیں اتنی ہی وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو عوام الناس میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔

ضروری نہیں کہ اس بات کو مثالوں اور دلیلوں سے واضح کیا جائے۔ ہم میں سے ہر شخص اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے اور دن رات ایسے تجربات سے گذرتا ہے جب اسے اسی کی طرح کا عام آدمی ستاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جو آدمی جس جگہ صاحبِ اختیار ہے، وہ اس جگہ خود کو حاکمِ مطلق سمجھتا ہے۔ اپنے فرائض ایمان داری سے ادا نہیں کرتا اور حرام کھاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عام لوگوں کا واسطہ زیادہ تر اپنے ہی جیسے عام لوگوں سے پڑتا ہے اور وہ انہی کے ہاتھوں ستائے جاتے ہیں۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ ایک آدمی جو اپنے اختیار سے باہر کی

جگہ پر مظلوم ہوتا ہے، اپنے اختیار کے دائرے میں ظالم بن جاتا ہے۔ایک کلرک ظالم اور خائن بن کر رشوت لیتا ہے اور پھر مظلوم بن کر یہ مال اس بد دیانت تاجر کو دے آتا ہے جو جھوٹ بول کر سستی چیز اسے مہنگے داموں بیچتا ہے۔ پھر یہ مظلوم تاجر حرام منافع کی رقم اس ظالم حکومتی عہدے دار کو دے دیتا ہے جو اس سے رشوت طلب کرتا ہے۔اس طرح ایک چکر چل رہا ہے، جس میں سب ایک دوسرے کو تنگ کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے تنگ بھی ہوتے ہیں۔اس نہ ختم ہونے والے چکر میں سب پریشان ہیں اور سب ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔

اس مسئلہ کا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے دوسروں کی بے ایمانی کو اپنی بے ایمانی کا جواز بنالیا ہے۔عام لوگوں میں یہ ذہن خود پیدا نہیں ہوا، اس ذہن کو پیدا کرنے والے ہمارے وہ قائدین ہیں جو ملت کو لاحق ہر مسئلے کا سبب اسلام دشمنوں کی سازشوں کو قرار دیتے ہیں۔وہ سیاسی لیڈر ہیں جو ملک کو درپیش ہر پریشانی کا ذمہ دار مخالف سیاست دانوں کو ٹھیراتے ہیں۔وہ اخباری دانشور ہیں جو قوم کے ہر مرض کی وجہ فوج، سیاستدان اور افسر شاہی کو قرار دیتے ہیں۔وہ علما ہیں جو ہر برائی کے پیچھے مقتدر قوتوں کا ہاتھ دیکھتے اور لوگوں کو دکھاتے ہیں۔

جب ہر طرف سے یہی آواز اٹھ رہی ہو کہ ساری خرابی بس دوسروں میں ہے اور اصلاح بھی انھی کی ہونی چاہیے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ یہ باتیں جن لوگوں کو سنائی جارہی ہیں ان میں اپنی اصلاح کا کوئی احساس پیدا ہو۔الزام تراشی کا یہ طریقہ کار چونکہ اصلاً غلط ہے، اس لیے اس سے حالات سدھرنے کے بجائے بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ایسے میں عوام الناس جن کی آنکھوں پر صرف دوسروں کی برائیاں دیکھنے والا چشمہ لگا ہوتا ہے، انہیں عذر بنا کر خود بھی برائی کا ارتکاب کرنا شروع کردیتے ہیں۔پھر وہ نہ ختم ہونے والا چکر شروع ہوجاتا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

بات یہیں پر نہیں رکتی بلکہ قومی زندگی کی ہر ناکامی کی ذمہ داری بھی دوسری اقوام پر ڈالنا ہمارا

وطیرہ بن گیا ہے۔ ہمارا دعویٰ یہ نہیں کہ دنیا میں کوئی ہمارا دشمن نہیں یا وہ ہمارے خلاف کوئی سازش نہیں کرتے۔ بلکہ ہم صرف اس بات کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ اس طرح سوچتے رہنے سے انسان کا ذہن منفی رخ پر چل پڑتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کے ذہن کو مثبت سوچ اور عمل دینے کے لیے قرآنِ مجید دشمنوں کے ایسے رویے کے جواب میں مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ اگر تم صبر کرو گے اور خدا سے ڈرو گے تو دشمنوں کی کوئی چال تمہارے خلاف کارگر نہ ہوگی، (آل عمران 3:120)۔ لہٰذا دشمنوں کی سازش کا اعلان کرنا ہمارا کام نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا کام صبر اور تقویٰ ہے۔ مگر یہ دونوں کام چونکہ بہت مشکل ہیں اس لیے ہم دشمنوں کو برا بھلا کہنے کے زیادہ آسان کام کو ترجیح دیتے ہیں۔

ہمارے حالات اُس وقت تک نہیں بدلیں گے جب تک ہم لوگوں کی آنکھوں سے یہ چشمہ نہیں اتاریں گے۔ اس سلسلے میں کرنے کے تین کام ہیں۔ اول ان لوگوں کی غلطی کو واضح کیا جائے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہر بگاڑ کا الزام دوسروں پر رکھنے سے حالات میں کوئی بہتری پیدا ہوسکتی ہے۔ دوم یہ چیز بار بار واضح کی جائے کہ دوسرے کی برائی ہماری برائی کا جواز کبھی نہیں بن سکتی۔ یہ چیز ہماری آخرت بھی تباہ کرے گی اور دنیا بھی۔ سوم یہ واضح کیا جائے کہ برائی کے اس ماحول میں جو شخص برائی سے بچ گیا اسے عام حالات کے مقابلے میں خدا نہ صرف بہت زیادہ اجر دے گا بلکہ اس کی دیگر خطاؤں پر بھی درگذر سے کام لے گا۔ ہمارے لیے یہی راہِ عمل ہے اور یہی راہِ نجات۔

اپلائیڈ فار رجسٹریشن

بینکوں کی فائننس اسکیموں کی بناپر آج کل نئی گاڑیوں کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے۔ جو شخص اپنی آمدنی میں سے چند ہزار بچا سکتا ہے، وہ اگلے دن ایک نئی گاڑی کا مالک بن سکتا ہے۔ یوں ہر روز شہر کی سڑکوں پر اَن گنت گاڑیاں چلتی ہوئی نظر آتی ہیں جن پر اپلائیڈ فار رجسٹریشن لکھا ہوتا ہے۔ یہ جملہ ایسی نئی گاڑیوں پر لکھا ہوتا ہے جن کی قیمت دے کر اس کا مالک اسے شوروم سے خرید چکا ہوتا ہے، مگر حکومت کے پاس رجسٹر ہونے سے قبل ہی، نئی گاڑی چلانے کے شوق میں، اسے سڑک پر لے آتا ہے۔

میں شہر کی سیاہ تارکول سڑکوں پر جب چمکتی دمکتی اپلائیڈ فار رجسٹریشن والی گاڑیوں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ کیا سبب ہے کہ لوگ نئی گاڑیاں اتنے شوق سے خریدتے ہیں۔ اس سوال کا جواب ان نئی گاڑیوں کے رنگ اور چمک، ان کے انجن کی کھنک اور ان کے اے سی کی ٹھنڈک سے واقف ہر آدمی جانتا ہے۔ انسان کا ذوق جمال، اس کی حس لطیف، سہولت و آسائش کی خواہش، آرام وسکون کی طلب، دوسروں سے آگے نکلنے کا جذبہ، ان سے داد سمیٹنے کا شوق یہ سب انسان کو مجبور کرتے ہیں اور وہ تھوڑے ہی عرصے میں ایک ایسی گاڑی میں بیٹھا ہوتا ہے جس کے پیچھے اپلائیڈ فار رجسٹریشن لکھا ہوتا ہے۔

آہ مگر یہی انسان خدا کی جنت کے حسن، اس کے سکون، اس کے عیش، اس کی لذت، اس کی خوشبو سے ایسا بے نیاز ہے کہ اس کی Wish List میں دور دور تک جنت کا کوئی نام ونشان نہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہر مسلمان اپنے کردار، اپنے اخلاق، اپنی شخصیت اور اپنے مال سے جنت کی بھرپور قیمت دیتا اور پھر بارگاہ خداوندی میں سراپا التجا بن کر دعا کرتا کہ رب کریم اسے جنت کے باسیوں میں رجسٹر کرلے۔ وہ رب سے محبت کرتا، اس کی اطاعت کرتا، لوگوں سے عدل کرتا، بندوں کی خدمت کرتا، محروموں پر احسان کرتا اور زبانِ حال سے اپنے وجود پر لکھ دیتا کہ میں جنت کی قیمت دے رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جنت میں ابدی طور پر بسا دیا جاؤں۔ مگر افسوس کہ دنیا کی اپلائیڈ فار رجسٹریشن گاڑیوں کے اس دور میں، جنت کے اپلائیڈ فار رجسٹریشن انسان ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔

گھوڑا، اژدھا اور رمضان

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی وجود کے دو بنیادی حصے ہیں۔ ایک اس کا روحانی وجود جس میں خیر وشر اور خدا اور آخرت کے تصورات ودیعت کیے گئے ہیں۔ دوسرا انسان کا حیوانی وجود جو انسان کے مادی جسم، شکل وصورت اور جبلی تقاضوں پر مشتمل ہے۔ یہی حیوانی وجود اور اس کے تقاضے ہیں، جن کے لیے عام زبان میں نفس کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس نفس کو ایک گھوڑے کی طرح بنایا ہے جو انسان کے لیے ہر طرح کی مشقت اٹھاتا ہے۔ جس طرح گھوڑا جنگ وامن ہر طرح کے حالات میں انسانوں کا سب سے کارآمد اور وفادار ساتھی رہا ہے، اسی طرح یہ نفس بھی انسان کی سواری ہے، جس کے ذریعے سے وہ مادی دنیا میں ہر طرح کی سعی وجہد کرتا ہے۔ تاہم یہ نفس اکثر حالات میں گھوڑا نہیں رہتا بلکہ ایک اژدھے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

یہ اس وقت ہوتا ہے جب شیطان، جسے قدیم صحیفوں میں سانپ کہا گیا ہے، اپنا زہر اس میں منتقل کرتا ہے۔ ضروریات، خواہشات، جذبات اور شہوات کی وہ وادیاں جو نفس کے گھوڑے کی جولاں گاہ ہیں، ابلیسی سانپ کی پناہ گاہ بھی ہوتی ہیں۔ وہیں یہ اپنا نافرمانی کا زہر نفس میں انڈھیلتا ہے، جس کے بعد اس گھوڑے کی ٹانگیں ختم ہوجاتی ہیں، اور اس کا دھڑ ایک اژدھے میں بدل جاتا ہے۔ یہ اژدھا شیطان سے بڑھ کر انسان کو نقصان پہنچاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ یہ انسان کے روحانی وجود کو سالم نگل جاتا ہے۔ رمضان کا مہینہ اسی اژدھے کو دوبارہ گھوڑا بنانے کا مہینہ ہے۔

اس مہینے میں اللہ تعالیٰ ایک طرف تو ابلیس کے تمام سانپوں کو بند کردیتے ہیں اور دوسری طرف نفس پر زبردست مشقتیں ڈال کر اس کا آپریشن کیا جاتا ہے۔ اس گھوڑے کی ضروریات، خواہشات، جذبات اور شہوات پر پابندی لگادی جاتی ہے۔ جس کے بعد یہ اژدھا دوبارہ گھوڑا بن جاتا ہے۔

تاہم بہت سے انسان اس آپریشن کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ وہ روزے کی رسمی پابندیوں کو قبول تو کرلیتے ہیں، مگر دل سے بدلنا نہیں چاہتے۔ ایسے لوگوں کا نفس رمضان سے پہلے بھی اژدھا بنا رہتا ہے اور رمضان کے بعد بھی اس کی طاقت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ قیامت کے دن ایسے اژدھوں کا مقام جنت کی پرفضا وادی نہیں ہوگی، بلکہ انہیں ان کے آقا ابلیس کے ساتھ جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

زہریلا نشہ

کہتے ہیں کہ اخبار کے مطالعہ کی عادت ایک نشے کی طرح ہوتی ہے۔ جسے یہ لت ایک دفعہ لگ جائے وہ مرتے دم تک اس سے پیچھا نہیں چھڑا پاتا۔ بعض لوگ تو اس عادت کے ایسے اسیر ہو جاتے ہیں کہ بستر چھوڑنے سے قبل، حوائج ضروریہ سے فارغ ہوئے بغیر، ناشتہ کرنے سے پہلے ہی اخبار کو چاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ الیکٹرونک میڈیا کے اس دور میں بھی اخبارات اتنے ہی مقبول ہیں جتنے پہلے ہوا کرتے تھے۔

اخبارات کا بنیادی کام معلومات فراہم کرنا ہے اور لوگوں کو دنیا بھر کے حوادث و واقعات سے باخبر رکھنا ہوتا ہے۔ تاہم صحافت کا اصول ہے کہ خبر یہ نہیں کہ کتے نے آدمی کو کاٹ لیا ہے بلکہ خبر یہ ہے کہ آدمی نے کتے کو کاٹ لیا ہے۔ یعنی زندگی کے عام معاملات کے برعکس جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے وہی زیادہ اہم ہوتا ہے اور اسی سے وہ قارئین کو مطلع کرتے ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ انسان عام طور پر معمول کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی توجہ صرف وہی چیزیں حاصل کر پاتی ہیں جن میں کوئی غیر معمولی بات ہو۔ جن کے ذریعے سے لوگوں میں زیادہ سے زیادہ سنسنی پھیلے۔ ہمارے ہاں اخبارات مکمل طور پر کمرشل مقاصد کے تحت چلتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ بک جانا ان کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے، اس لیے اخبار والے زیادہ سے زیادہ سنسنی خیز انداز میں اخبار و واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ جرائم، حادثات، اسکینڈلز اور اسی نوع کی دیگر منفی چیزیں چونکہ اپنے اندر اسی پس منظر کی نیوز ویلیو رکھتی ہیں، اس لیے اخبارات والے انہیں نمایاں کر کے شائع کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ سیاسی معاملات کو حد سے زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے۔ چنانچہ اخبارات بھی سب سے بڑھ کر سیاسی نوعیت کی خبروں کو اہمیت دیتے ہیں۔ ہمارے

ہاں سیاست چونکہ خود منفی نوعیت کی چیز ہے اس لیے اس کے حوالے سے بھی زیادہ تر خبریں منفی انداز میں سامنے آتی ہیں۔

اخبارات کے کالم نگار حضرات انھی چیزوں کو اٹھاتے ہیں اور انھی پر اپنے مضامین کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یہ کالم نگار حضرات زیادہ تر صحافیانہ پس منظر ہی رکھتے ہیں، اس لیے جب یہ کالم لکھتے ہیں تو غیر محسوس طریقے پر یہ ٹھیک وہی منفی رپورٹنگ شروع کر دیتے ہیں جو اخبارات کا طریقہ ہوتا ہے۔ان کی دلچسپی کا موضوع سیاست کا وہ میدان ہوتا ہے جہاں سے اچھی خبریں نہیں آتیں یا پھر معاشرے کے وہ منفی واقعات جو تعداد کے اعتبار سے کم اور نیوز ویلیو کے اعتبار سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ چن چن کر معاشرے کے تاریک اور منفی پہلوؤں کو اٹھاتے ہیں اور حال اور مستقبل کا ایسا بھیانک نقشہ کھینچتے ہیں کہ پڑھنے والا بے پناہ ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے دنیا میں صرف تاریکی اور اندھیرا نظر آتا ہے۔ اس کی ہر امید ختم ہو جاتی ہے۔ یہ قاری ایک منفی انسان بن جاتا ہے اور عملی زندگی میں جب لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے تو منفی سوچ ہی کے ساتھ کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج اخبار کا مطالعہ ایک زہریلا نشہ بن گیا ہے۔

حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ تجربے کے طور پر ایک قاری اخبار پڑھنے کے بعد اپنے آپ سے سوال کر لے کہ جن منفی چیزوں کا اس نے اخبار میں ذکر پڑھا ہے، ان سے وہ خود کتنا متاثر ہوا ہے۔ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد وہ جان لے گا کہ وہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں گھرا ہوا ہے۔ وہ جان لے گا کہ وہ بیوی بچوں اور گھر والوں کے درمیان باسلامت بیٹھا ہے، اس کی جان ، مال اور آبرو محفوظ ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں سلامت ہیں۔ پھر یہ تنہا اس کا ہی معاملہ نہیں بلکہ ارد گرد پھیلے ہوئے تمام لوگوں کا معاملہ ہے۔ یعنی ان کی غالب ترین اکثریت روزگار، تعلیم اور صحت کی حامل ہے۔

یہ سوچ اور یہ رویہ اسے رب کی شکرگزاری پر ابھارے گا۔ شکرگزاری کی یہ سوچ اسے آمادہ کرے گی کہ وہ اپنے دائرے میں بندگان خدا کے لیے مفید بنے۔ ان کے کام آئے۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہو۔ اگر کسی کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تو کم ازکم دعا ہی کردے۔ وہ کسی کا مسئلہ حل نہیں کرسکتا تو کم ازکم دوسرے کے لیے خود مسئلے پیدا نہ کرے۔

اس کے ساتھ اگر وہ صبح سویرے قرآن پاک کا مطالعہ کرلے تو اس پر واضح ہوجائے گا کہ اصل خبر اخبار میں نہیں بلکہ قرآن کریم میں موجود ہے۔ وہ قیامت کے دن رب کے حضور پیشی اور حساب کتاب کی خبر ہے۔ یہ خبر اسے دن بھر کے معمولات میں محتاط بنادے گی۔ اس سے کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہوگا جو خالق یا مخلوق کے حقوق تلف کرنے والا ہو۔

آج کے اخبارات کا غیر شعوری مطالعہ زہریلا نشہ بن گیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ لوگ قرآن پڑھ کر اور فجر کی نماز میں اپنے اوپر ہونے والی نعمتوں کا شکرادا کر کے اخبار کا مطالعہ کریں۔

’’اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لیے سچی گواہی دو خواہ (اس میں) تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔ اگر کوئی امیر ہے یا فقیر تو خدا اُن کا خیر خواہ ہے۔ تو تم خواہشِ نفس کے پیچھے چل کر عدل کو نہ چھوڑ دینا۔‘‘ (نساء4:135)

’’اے ایمان والو! خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہوجایا کرو۔ اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے اور خدا سے ڈرتے رہو۔‘‘ (مائدہ5:8)

عذر اور اعتراف

قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ بیان ہوا ہے۔اس واقعے کی جو تفصیلات قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں بیان ہوئی ہیں ان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو زمین پر خلیفہ بنایا۔ پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کریں۔فرشتوں نے سجدہ کیا۔مگر اس موقع پر موجود ایک جن نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ ابلیس تھا جو بعد میں شیطان کے نام سے مشہور ہوا۔

جب اللہ تعالیٰ نے شیطان سے پوچھا کہ کس چیز نے تجھے میرا حکم ماننے سے روکا تو اس نے ایک خوبصورت عذر پیش کر دیا۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خود اسے ایک برتر حیثیت میں پیدا کیا ہے۔یعنی اس کی پیدائش آگ سے ہوئی جبکہ جس ہستی کے سامنے اسے سجدے کا حکم دیا گیا ہے، اس کی پیدائش ایک کم تر مادے یعنی مٹی سے کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو اسے برتر بنایا گیا اور دوسری طرف اسے ایک کم تر مخلوق کے سامنے جھکنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔اس لیے خرابی اس کے انکار میں نہیں بلکہ اس حکم میں ہے جس میں بظاہر ایک غلط مطالبہ کیا گیا ہے۔

یہ شیطان کا مقدمہ تھا جو بظاہر بہت مضبوط اور مدلل تھا۔مگر وہ کسی اور کے سامنے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے موجود تھا، جو دلوں کے بھید تک جانتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کی اصل حالت کو بیان کر دیا کہ تو دراصل تکبر کا شکار ہو چکا ہے۔اور اس تکبر نے تجھے اس طرح اندھا کیا ہے کہ تو میرے سامنے بغاوت پر تیار ہو گیا ہے۔اس لیے اب تجھے راندۂ درگاہ کیا جاتا ہے۔

شیطان اس موقع پر بھی سرکشی سے باز نہ آیا۔اس نے اپنی گمراہی کا الزام یہ کہہ کر اللہ تعالیٰ پر ڈالنے کی کوشش کی کہ جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں آدم اور اس کی اولاد کو گمراہ کروں گا۔اس طرح یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ اس عزت کے مستحق نہ تھے جو انہیں دی گئی ہے۔بس تو مجھے قیامت کے دن تک کی مہلت دے دے۔اللہ تعالیٰ شیطان سے سخت ناراض تھے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے مہلت دے دی تا کہ اس کی بدی اس طرح واضح ہو جائے کہ خدا کی رحمت جیسی بلند صفت بھی اس کے کام نہ آ سکے۔

دوسری طرف حضرت آدم کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنی بیگم کے ہمراہ ایک باغ میں قیام کریں۔البتہ ایک

خاص درخت سے دور رہیں۔اور انہیں یہ بھی بتا دیا کہ یہ ابلیس ان کا دشمن ہے۔لہٰذا وہ اس کے دھوکے میں نہ آئیں۔حضرت آدم وحوا کچھ عرصہ تو اللہ کے حکم کے پابند رہے،مگر آہستہ آہستہ شیطان نے وسوسہ انگیزی شروع کردی۔اس نے ان دونوں کو قسم کھا کر یہ یقین دلا دیا کہ وہ اس درخت کا پھل کھالیں تو انہیں ہر طرح سے فائدہ ہوگا۔وہ دونوں اس کی باتوں میں آ گئے اوراس درخت کا پھل کھا بیٹھے۔مگر اس کے نتیجے میں فوراً وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے محروم ہوگئے۔یوں بظاہر شیطان اپنے اس چیلنج میں کامیاب ہوگیا کہ وہ یہ ثابت کرکے رہے گا کہ آدم اس مقام کے مستحق نہیں ہیں جو انہیں دیا گیا ہے۔

مگر آدم وحوا کا کیس شیطان والا نہیں تھا۔انہوں نے اس کا پہلا ثبوت یہ دیا کہ جیسے ہی انہیں احساس ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم نہیں رہ سکے، دونوں رب کی بارگاہ میں معافی کے خواستگار ہوگئے۔اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کیا میں نے تمھیں منع نہیں کیا تھا۔یہ دوسرا موقع تھا جب حضرت آدم نے شیطان سے مختلف ہونے کا ثبوت دیا۔انہوں نے شیطان کی طرح اپنے عمل کی کوئی تاویل کرنے کی کوشش نہیں کی۔حالانکہ وہ دونوں یہ کہہ سکتے تھے کہ ہمیں شیطان نے دھوکا دیا ہے۔مگر انہوں نے کوئی عذر پیش نہ کیا اور یکطرفہ طور پر ساری غلطی قبول کرلی۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کردیا۔

آج بھی ابن آدم اور ابن شیطان میں ایک ہی بنیادی فرق ہوتا ہے۔آدم کے بیٹے اعتراف کی نفسیات میں جیتے ہیں جبکہ شیطان کے پیروکار عذر کی نفسیات میں۔پہلوں سے جب کوئی غلطی ہوتی ہے تو وہ کسی توجہ دلانے سے قبل ہی غلطی مان لیتے ہیں۔دوسروں سے جب کوئی غلطی ہوتی ہے تو وہ فوراً کوئی تاویل سوچتے ہیں۔پہلوں سے کوئی بھول ہوتی ہے تو اپنے اس عذر کو بھی استعمال کرنے میں جھجکتے ہیں جو وہ بجا طور پر پیش کر سکتے ہیں۔دوسرے اپنے ہر جرم کا الزام دوسروں پر ڈال کر مطمئن ہوجاتے ہیں۔

ان دوگروہوں کا رویہ اگر اپنے اپنے پیش رو جیسا ہے تو ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا رویہ بھی وہی ہے۔ابن آدم کی ہر بھول اور ہر غلطی معاف کردی جاتی ہے۔ جبکہ شیطان کا رویہ اختیار کرنے والے انسانوں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوجاتے ہیں۔ پہلوں کو جنت کی بادشاہی میں اعلیٰ مقام دیا جائے گا۔ دوسروں کو جہنم کی آگ کا ایندھن بنا دیا جائے گا۔

رمضان کا مہینہ......حاصل کیا کرنا ہے؟

رمضان قمری تقویم کا نواں مہینہ ہے۔ یہ مہینہ مسلمانوں ہی کے لیے نہیں، انسانوں کے لیے بھی بہت اہم ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جب گمراہی کے صحرا میں بھٹکتی انسانیت کی صدائے العطش ،آسمان نے سنی اور باران ہدایت کو عرب کے بیابانوں پر برسنے کا حکم دیا۔ پھر اس سرزمین سے ہدایت کے وہ چشمے ابلے جن سے پوری انسانیت سیراب ہوگئی۔ یہ وہ مہینہ ہے جب ظلم کی چکی میں پستی اور سسکتی ہوئی انسانیت کی صدائے العدل کا جواب کائنات کے بادشاہ نے عدل سے نہیں، احسان سے دیا۔اس طرح کہ قیامت تک کے لیے قرآن کو وہ فرقان بنا کر زمین پر اتارا کہ جس کی ہدایت نے دھرتی کو امن وسکون سے بھر دیا۔

ماہ رمضان ایک دفعہ پھر اہل زمین کے سروں پر سایہ فگن ہے۔اس حال میں کہ آج ہر طرف ظلم اور گمراہی کا دور دورہ ہے۔انسانیت کے مصائب کا علاج آج بھی یہی ہے کہ قرآن کی ہدایت لوگوں کے سامنے رکھی جائے اور لوگ اسے قبول کر لیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن اور رمضان کا تعلق اس طرح بیان کیا ہے۔

’’رمضان کا مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، لوگوں کے لیے رہنما بنا کر اور نہایت واضح دلیلوں کی صورت میں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے سراسر ہدایت بھی ہیں اور حق و باطل کا فیصلہ بھی‘‘۔(البقرہ2:185)

قرآن کی ہدایت کیا ہے؟ اگر اسے ایک جملے میں بیان کیا جائے تو یہ انسانوں کو اس مسئلے سے آگاہ کرنے آیا ہے جو انھیں ان کی موت کے بعد درپیش ہوگا۔یعنی ان کے مالک کے حضور پیشی کا مسئلہ۔اپنے اعمال کی جوابدہی کا مسئلہ۔ جنت سے محرومی اور جہنم کی آگ کا مسئلہ۔ابدی ذلت یا دائمی عیش کا مسئلہ۔مگر بڑی عجیب بات ہے کہ یہ ہدایت جس کا تعلق دنیا سے نہیں آخرت سے ہے؛ زندگی

سے نہیں موت سے ہے، انسانوں کی زندگی اوران کی دنیا کے سارے مسائل کا واحد ممکنہ حل ہے۔

اس دنیا میں انسان کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ یہ کہ وہ ایک فانی دنیا میں ابدی قیام کے اسباب ڈھونڈتا ہے۔ یہ کہ وہ ایک سرائے میں رہ کر کسی دائمی مستقر کے آرام ڈھونڈتا ہے۔ اقبال نے جو بات فرنگ کے لیے کہی تھی وہ ہر فرزندِ زمیں کے بارے میں درست ہے۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام

وائے تمنائے خام وائے تمنائے خام

اس عیش اور آرام کی تلاش میں انسان خدا و آخرت کو بھول جاتا ہے۔ وہ فانی دنیا کو اپنا مقصد بناتا اور ہر اخلاقی قدر کو فراموش کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان نوع انساں کا شکاری بن جاتا ہے۔ پھر ظلم اور گمراہی کی وہ ساری اقسام وجود میں آتی ہیں جن سے بحر و بر میں فساد پھیل جاتا ہے۔ انسانوں کی جان، مال، عزت و آبرو انھی جیسے انسانوں کے ہاتھوں پامال ہوتی ہے۔ انسان کا اخلاقی وجود اس کی حیوانی خواہشات کے سامنے ڈھیر ہو جاتا ہے۔

اس صورتحال کا واحد حل وہ قرآنی ہدایت ہے جو پوری قوت کے ساتھ قیامت کے ہولناک زلزلے سے انسانوں کو ڈراتی ہے۔ وہ اس روز سے انسانوں کو خبردار کرتی ہے جب زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی اور حسن و زینت کے تمام آثار مٹا کر زمین ایک چٹیل میدان بنا دی جائے گی۔ وہ دن کہ جب لوگ اپنے سوا ہر چیز کو بھول جائیں گے۔

''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ بے شک قیامت کی ہلچل بڑی ہی ہولناک چیز ہے۔ جس دن تم اسے دیکھو گے، اس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ اپنا حمل ڈال دے گی اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہے ہی بڑی ہولناک چیز''۔ (الحج 22:1 تا 2)

جو لوگ قرآن کی اس پکار پر توجہ دیتے ہیں اور آخرت کی کامیابی کو اپنی منزل بنا لیتے ہیں قرآن ان کے سامنے ایک واضح نصب العین رکھتا ہے۔ فرمایا۔

''بے شک فلاح پا گیا وہ شخص جس نے پاکیزگی اختیار کی''۔ (الاعلیٰ 87:14)

''اور نفس گواہی دیتا ہے، اور جیسا اسے سنوارا۔ پھر اس کی نیکی اور بدی اسے سجھا دی کہ فلاح پا گیا وہ، جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے آلودہ کیا''۔ (الشّمس 91:6 تا 10)

یہ آیات کھول کر بتاتی ہیں کہ آخرت کی کامیابی کا تمام تر انحصار اس بات پر ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنا تزکیہ کرتا ہے یا نہیں۔ یہ تزکیہ رہبانیت جیسی کوئی چیز نہیں بلکہ ایمان و اخلاق کی آلائشوں سے خود کو بچانے کا عمل ہے۔ ان آیات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ نفس انسانی میں خیر وشر کا پورا شعور شروع دن ہی سے موجود ہے اور اسی علم کی بنیاد پر انسان یہ جانتا ہے کہ اسے اپنے آپ کو کن آلائشوں سے بچانا اور کن چیزوں کو اختیار کرنا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں انسان اخلاق سے عاری نہیں بلکہ فطرت کا عطا کردہ پاکیزہ لباس پہن کر آتا ہے۔ اس لباس فطرت کے دامن میں شرک کا کوئی داغ اور الحاد کا کوئی دھبہ تک نہیں ہوتا۔ اس پر ظلم کا میل اور ہوس کی گندگی نہیں لگی ہوتی۔ مگر دنیا میں موجود شیطانی ترغیبات، حیوانی خواہشات اور ماحول کے اثرات انسان کو گمراہی کے راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ وہ فطرت میں موجود خیر وشر کے تصورات کو بھول کر خواہش نفس کی پیروی اختیار کرتا ہے۔ جیسے جیسے وہ اس راہ پر آگے بڑھتا ہے، یہ گرد آلود راستہ دامن دل اور لباس فطرت کو غلیظ سے غلیظ تر کرتا چلا جاتا ہے۔ غفلت کی دھول اور سرکشی کی کالک فطرت کے حسن کو نری غلاظت میں بدل دیتی ہے۔ انسان پہلے پہل خیر وشر کی تمیز کھوتا ہے اور پھر معاشرے میں ہر شر خیر اور ہر خیر شر بن جاتا ہے۔ فطرت

میں پیدا ہوجانے والی اس کجی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں پیغمبر بھیجے، کتابیں اتاریں، بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اتارا۔ قرآن نہ صرف تزکیہ کے نصب العین کو انسانوں کے سامنے رکھتا ہے بلکہ ایمان و اخلاق اور فکر و عمل کی آلائشوں کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔

قرآن کی اس ہدایت کی روشنی میں ہر بندۂ مومن کی زندگی کا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو فطرت میں موجود اور قرآن میں بیان کردہ ان آلائشوں سے بچائے۔ انسان جیسے ہی یہ عمل شروع کرتا ہے۔ اس کا براہِ راست نتیجہ اس کے اخلاقی وجود پر مرتب ہوتا ہے۔ شرک والحاد کی گندگی کو دھونے کے بعد انسان اپنے جیسے انسانوں کو خدا بناتا ہے نہ خواہش نفس کو اپنا معبود ٹھہراتا ہے۔ آخرت کی کامیابی کا نصب العین تقاضا کرتا ہے کہ انسان کی جان، مال، وقت اور صلاحیت کا ایک حصہ لازماً ذاتی مفادات سے بلند ہوکر صرف کیا جائے۔ ایسے پاکیزہ لوگوں کے معاشرے میں نہ طاقتور کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں اور نہ اہل ثروت غربا سے بے نیاز اپنی خر مستیوں میں مگن رہتے ہیں۔ انسان اپنے ابنائے نوع کے ساتھ اس یقین کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں کہ کل روزِ قیامت ہر معاملہ رب العالمین کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ وہ عدالت جہاں فیصلے مادی نہیں بلکہ اخلاقی قانون کی بنیاد پر ہوں گے۔ چنانچہ دھوکہ، فریب، بددیانتی، خیانت، جھوٹ اور معاشرے میں پائی جانے والی ان جیسی تمام اخلاقی گندگیاں اوصاف حمیدہ کے لیے جگہ چھوڑ دیتی ہیں۔ یوں دھرتی نورِ ایمان سے چمک اٹھتی ہے۔

فلاح آخرت اور اس کے لیے پاکیزگی کے حصول پر انسان کو متحرک کرنے والی سب سے بڑی چیز خدا کے حضور پیشی کا خوف، اس کی پکڑ کا اندیشہ، اس کے عذاب کا ڈر اور اس کا تقویٰ ہے۔ یہ تقویٰ ہی وہ چیز ہے جو روزوں کی فرضیت کا اصل مقصود ہے۔ ارشاد ہوا:

''ایمان والو، تم پر روزے فرض کئے گئے تھے، جس طرح تم سے پہلوں پر فرض کئے گئے تھے تا کہ تم اللہ سے ڈرنے والے بن جاؤ۔''، (البقرہ 183:2)

یہ تقویٰ کیسے پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح کہ رمضان میں قرآن کی بار بار تلاوت انسان کو جہنم کے عذاب اور خدا کی پکڑ سے بے خوف نہیں رہنے دیتی۔ دوسری طرف روزے میں کھانے پینے سے رکنا انسان کو نہ صرف پرہیز گاری کے آداب سکھاتا ہے بلکہ اسے اس مضبوط قوت ارادی سے آگاہ کرتا ہے جسے استعمال کر کے وہ ہر اخلاقی ناپاکی سے بچ سکتا ہے۔

سو اب جب کہ رمضان آچکا ہے، آیئے...... رمضان کے صحیح مصرف کا عزم کرتے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں قرآن صرف ثواب کے لیے پڑھا جاتا ہے، آیئے...... قرآن کو ہدایت کے لیے پڑھنے کا عزم کرتے ہیں۔ یہ عزم کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھیں گے۔ یہ جاننے کے لیے پڑھیں گے کہ قرآن جس دن کی مصیبت سے خبردار کرنے آیا ہے وہ کون سا دن ہے۔ فکر و عمل اور اخلاق و عقیدہ کی ان گندگیوں کو جاننے کے لیے پڑھیں گے جن سے بچے بغیر جہنم کی آگ سے نہیں بچا جا سکتا۔

رمضان ثواب کا مہینہ ہے۔ آیئے...... اسے ہدایت کا مہینہ بنا دیں۔ یہ بھوک پیاس سے رکنے کا مہینہ ہے۔ آیئے...... اسے تقویٰ حاصل کرنے کا مہینہ بنا دیں۔ یہ قمری تقویم کا نواں مہینہ ہے۔ آیئے...... اسے ایمانی تقویم کا پہلا مہینہ بنا دیں۔

اپنا چراغ جلالیں

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کا مفہوم ہے کہ اگر قیامت آ جائے اور کسی کے ہاتھ درخت کی ایک قلم ہو اور اسے مہلت ہو تو وہ ضرور یہ قلم لگا دے''۔ (مسند احمد۔83:3)۔

یہ روایت ہمیں ایک تعمیری سوچ دیتی ہے۔ اس سوچ کا حامل انسان بدترین حالات میں بھی مایوسی اور بے عملی کا شکار نہیں ہوتا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ قیامت ایک ایسی تباہی کا نام ہے جس میں درخت لگانا بظاہر بے فائدہ کام ہے۔ کیوں کہ درخت لگانا ایک ایسا عمل ہے جس کی نفع بخشی کے لیے کئی برس چاہییں۔ جبکہ قیامت کا زلزلہ لمحہ بھر میں ہر چیز کو تباہ کر دے گا۔ لیکن یہ روایت بتاتی ہے کہ انسان کو مثبت ذہن کے ساتھ کام کرنا چاہیے، چاہے اسے یقین ہو کہ اس کے کسی کام کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنے والا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک بندہ مومن آخرت کے اجر کے لیے کام کرتا ہے اور یہ اجر اصلاً اس کی نیت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ جیسے ہی وہ کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہے، اس کے لیے ایک اجر ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ اس کام کو کر دیتا ہے تو دوسرا اجر ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کام سے کوئی نفع ہونا شروع ہوتا ہے تو تیسرے اجر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ انسان کے کسی عمل کا نتیجہ اگر نہیں بھی نکلتا تب بھی تین میں سے دو اجر تو بہر حال انسان کو مل جاتے ہیں۔ وہ صرف ایک اجر سے محروم رہتا ہے۔

عام حالات میں لوگ معاشرے کے بگاڑ سے پریشان ہو کر مایوس ہو جاتے ہیں اور مایوسی کی بنا پر صرف منفی چیزوں کو دیکھتے ہیں اور پھر وہ ان چھوٹے چھوٹے اچھے کاموں کو بھی چھوڑ دیتے ہیں جنہیں وہ با آسانی کر سکتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر معاشرے میں بگاڑ بڑھتا رہتا ہے۔ مگر

جب لوگ حالات کی خرابی سے بے پرواہ ہوکر اپنے حصے کا اچھا کام کرتے رہتے ہیں تو آہستہ آہستہ برائی کم ہونا اور خیر پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی اپنے حصے کا درخت لگاتا ہے اور کچھ عرصے میں ایک چمنستان وجود میں آجاتا ہے۔

اس بات کو ایک اور مثال سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ جب رات آتی ہے تو سورج کی روشنی ختم ہو جاتی ہے۔ ہر طرف اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ ایسے میں کسی ایک فرد کا چراغ جلانا سارے اندھیرے کو دور نہیں کرسکتا اور نہ اس کا چراغ ہی سورج کا نعم البدل ہوسکتا ہے۔ مگر لوگ ان چیزوں سے بے پرواہ ہوکر اپنا اپنا چراغ جلاتے ہیں۔ دنیا بھر سے قطع نظر ان کے اردگرد روشنی پھیلنا شروع ہو جاتی ہے۔ اور جب سارے لوگ اپنے اپنے چراغ جلاتے ہیں تو ہر جگہ روشنی پھیل جاتی ہے۔ اندھیرے دور ہو جاتے ہیں۔

تو اب آیئے، ماحول کے اندھیرے سے بے پرواہ ہوکر ہم اپنا چراغ جلالیں۔ ہم اپنا درخت لگالیں۔

''خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔ اور بے حیائی اور نامعقول کاموں سے اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔''، (سورۂ نحل 16:90)

''اے ایمان والو! خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو۔ اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے اور خدا سے ڈرتے رہو۔ کچھ شک نہیں کہ خدا تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے۔''، (سورۂ مائدہ 5:8)

''مؤمنو! خدا سے ڈرا کرو اور بات سیدھی کہا کرو۔''، (سورۂ احزاب 33:70)

خدا کی محفل

خدا کی طرف بلانے والے نے اردگرد نظر کی، اپنی تنہائی کو دیکھا اور پھر خدا سے کہا۔ یہاں کسی کو تیری ضرورت نہیں۔ یہاں لوگوں کو اپنی مشکلات کے حل کے لیے وظیفے چاہئیں۔ سیاسی تحریکیں برپا کرنے والے لیڈر چاہییں۔قوم پرستانہ جذبات بھڑکا کر غیر مسلموں کے خلاف نفرت پیدا کرنے والے مقرر چاہییں۔ چند ظاہری اعمال کی بنیاد پر جنت دلانے والے اہل علم چاہییں۔ تیری طرف بلانے والے، ربانی انسان بنانے والے، جس طرح پہلے تنہا تھے، آج بھی تنہا ہیں۔ یہاں کوئی ان کا ہم نفس نہیں۔ یہاں کوئی ان کا ہم سخن نہیں۔

یہاں کے لوگوں کے لیے دنیا اور اس کے مسائل اہم ہیں۔ وہ انہی کے لیے روتے اور انہی کے لیے ہنستے ہیں۔ شادی بیاہ، تنگدستی و بیماری، اولاد اور روزگار، گھر اور خاندان، یہی لوگوں کی جنت اور یہی لوگوں کی جہنم ہیں۔ تیری جنت کے لیے تڑپنے والا کوئی نہیں۔ تیری جہنم کے خوف میں لرزنے والا کوئی نہیں۔لوگوں کی مجلسوں میں، ان کی باتوں میں، تیری فردوس اور تیری سعیر ناقابل تذکرہ ہیں۔

مالک! جس طرح تو کافروں میں تنہا تھا، آج مسلمانوں کی بھیڑ میں بھی تنہا ہے۔کوئی نہیں جو تیرے شوق میں روئے، جو تیرے خوف میں لرزے۔کوئی نہیں جو تیری جنت کے لیے زندگی کی ہر آزمائش پر صبر کرے۔کوئی نہیں جو تیری امید پر خواہشات، مفادات اور تعصّبات کی دیواروں سے ٹکرا جائے۔ہاں تیرے نام پر دھوم مچانے والے، تیرے دین سے دنیا کمانے والے بہت ہیں۔ کیا اسی فصل کے لیے تو نے یہ کھیتی اگائی تھی؟

پکارنے والا جب پکار چکا تو اس نے اردگرد نظر کی اور دیکھا کہ وہ خدا کی دنیا میں کھڑا ہے۔ یہ وہ محفل ہے جہاں کائنات کا ذرہ ذرہ پروردگار کی تسبیح کر رہا ہے۔ کتابِ زندگی کے ہر ورق اور صفحہ

ہستی کی ہر سطر پر خدائے ذوالجلال کی حمد لکھی جارہی ہے۔ وقت کے ہر ہر لمحے میں رب کائنات کی کبریائی کی صدا بلند ہورہی ہے۔ اس محفل کی رونق دیکھ کر وہ اپنی تنہائی کا غم بھول گیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہی وہ محفل ہے جو کل فردوس کی ابدی بادشاہی میں بدل جائے گی۔ مگر اُس روز اِس بادشاہی میں صرف وہی داخل ہوگا جو آج ہی اس محفل میں شامل ہوگیا۔ آج ہی تنہا ہوگیا۔

اس نے سوچا کہ اگر لوگ نہیں آتے تو کیا ہوا میں نے تو اس راز کو پالیا ہے۔ کیوں نہ جینے کے لیے اسی محفل کا انتخاب کرلیا جائے۔ اس نے قدم اٹھائے اور پھر تیزی سے انسانوں کی دنیا سے نکل کر خدا کی محفل میں داخل ہوگیا، اس بات سے بے پرواہ کہ کون اس کے پیچھے آرہا ہے اور کون نہیں۔ مگر وہ اس سے بے خبر رہا کہ وہ تنہا نہیں، بہت سے لوگ اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، اس کے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔

''اور (متقین) وہ (لوگ ہیں) کہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق میں کوئی اور برائی کر بیٹھتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور خدا کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے؟ اور جان بوجھ کر اپنے افعال پر اڑے نہیں رہتے۔''، (آل عمران 135:3)

''اور جو شخص کوئی برا کام کر بیٹھے یا اپنے حق میں ظلم کرلے پھر خدا سے بخشش مانگے تو خدا کو بخشنے والا (اور) مہربان پائے گا۔''، (النساء 110:4)

''اگر تم بڑے ممنوعہ گناہوں سے پرہیز کرتے رہو تو ہم تمھاری (چھوٹی) کوتاہیوں کو مٹادیں گے اور ایک عزت والی جگہ میں داخل کردیں گے۔''، (النساء 31:4)

''اور دن کے دونوں سروں (یعنی صبح و شام) کے اوقات میں اور رات کی چند (پہلی) ساعات میں نماز پڑھا کرو۔ کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کردیتی ہیں۔ یہ ان کے لیے نصیحت ہے جو نصیحت قبول کرنے والے ہیں۔''، (ھود 114:11)

کھوئی ہوئی بھیڑ

حضرت داؤدعلیہ السلام بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر ہیں۔ان کا شماران چند پیغمبروں میں ہوتا ہے جوصاحب کتاب بھی تھے اورصاحب اقتدار بھی۔ان پر نازل ہونے والی کتاب زبور کو الہامی کتابوں میں ایک غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب دعا کی زبان میں نازل ہوئی اور بندہ اور رب کے تعلق کا ایک بہت اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ پروردگار سے بندوں کی دعا و مناجات،اس کے حضور فریاد وزاری اوراس کی حمد وتسبیح کا ایسا خوبصورت مجموعہ ہے،جس کی مثال مذہبی ادب میں کم ہی ملتی ہے۔زبور کی عظمت یہ ہے کہ قرآن کی سورہ فاتحہ جو ہر مسلمان کو زبانی یاد ہوتی ہے اور جس کے بغیر نماز ادا نہیں ہوسکتی،زبور ہی کے اسلوب میں نازل ہوئی ہے۔زبور کی ایک آیت اس طرح سے ہے:

’’میں کھوئی ہوئی بھیڑ کی مانند بھٹک گیا ہوں،اپنے بندہ کو تلاش کر۔‘‘،(176:119)

اللہ تعالیٰ کی رحمت اوراس کی جنت تک پہنچنے کا واحد راستہ اللہ کی عطا کردہ صراط مستقیم ہے۔مگر زندگی میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ انسان اس صراط مستقیم سے بھٹک جاتا ہے۔نفس انسانی کی کمزوریاں، شیطانی طاقتوں کے حملے،ماحول کے تقاضے اور دیگر عناصر انسان کے لیے یہ ناممکن بنادیتے ہیں کہ وہ صراط مستقیم کی طرف لوٹ جائے۔

ایسے مرحلے پر بعض اوقات بندہ یہ محسوس کرلیتا ہے کہ وہ غلط راستے پر جارہا ہے،مگر وہ خود میں اتنی طاقت نہیں پاتا کہ وہ اپنے آپ کو غلط راہ پر چلنے سے روک سکے۔ ایسے میں زبور کی یہ آیت انسان کو ایک مکمل لائحہ عمل دیتی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ بندہ کمزور ہے بھٹک سکتا ہے مگر خدا کی رحمت جب چاہے اسے دوبارہ صراط مستقیم پر لاسکتی ہے۔انسان گناہ کے راستے پر پڑسکتا ہے مگر رب کی مغفرت انسان کے ہر گناہ کو ڈھانک سکتی ہے۔شرط یہ ہے کہ بندہ اپنے گناہ کا اعتراف کرکے رب کو پکارتا رہے۔ایسے شخص کے لیے رب کی رحمت اور ہدایت کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ایسے بھٹکے ہوئے شخص کو اللہ تعالیٰ خود تلاش کرلیتے ہیں۔

خدا کو ہدایت کے لیے سچے دل سے پکارنا کوئی معمولی بات نہیں۔اس پکار پر آقا خود بندے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔اور جسے حاضر وغائب کا جاننے والا ڈھونڈنے نکل آئے، وہ کبھی گمراہی کے اندھیروں میں نہیں بھٹک سکتا۔

الحمد للہ رب العالمین

میرے ایک شناسا کی دعا کا پہلا جملہ کچھ اس طرح ہوتا ہے:

''یا اللہ! جس طرح مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر نعمت جو مجھے یا کسی کو بھی ملی، اس کا دینے والا صرف تو ہے، اسی طرح مجھے اس بات کا بھی کامل یقین ہے کہ جس کو جو ملا وہ اس کی کسی خوبی کی بنا پر نہیں ملا بلکہ صرف تیری خوبیوں کی بنا پر ملا ہے۔ میں تیری ہر نعمت پر تیرا شکر ادا کرتا ہوں اور تیری ہر خوبی پر تیری حمد بیان کرتا ہوں۔''

بلاشبہ یہ الفاظ معرفت کے الفاظ ہیں۔ یہ اس عظیم حقیقت کا اعتراف ہیں جو عالم میں چار سو پھیلی ہے۔ یہ توحید کی مکمل تعریف ہے۔ خدا کو ایک ماننا جتنا اہم ہے اتنا ہی اہم یہ ہے کہ اسے ہر نعمت، خوبی اور بھلائی کا سرچشمہ مانا جائے۔ پہلی بات سے پہلو تہی کے نتیجے میں شرک پیدا ہوتا ہے تو دوسری بات کو فراموش کر کے انکارِ خدا یا کم از کم اعراضِ خدا کا ذہن جنم لیتا ہے۔ شرک والی بات سے تو اکثر لوگ واقف ہیں مگر دوسری بات کا شعور عام نہیں اس لیے آج کل اکثر لوگ اس میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

انسان جب اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو وہ خود کو ان گنت نعمتوں کے درمیان پاتا ہے۔ یہ نعمتیں اس قدر ہیں کہ انسان ساری زندگی انہیں گنتا رہے تو زندگی ختم ہو جائیگی مگر نعمتیں ختم نہیں ہونگی۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اس کی زبان سے مذکورہ بالا الفاظ نکلیں۔ مگر انسان کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ وہ صرف ان نعمتوں کو نعمت شمار کرتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی۔ گویا نعمت کا مفہوم اس کے نزدیک یہ ہے کہ وہ بھلائی جو دوسروں کو پہنچی مگر اسے نہ پہنچی۔ یہ سوچ لازماً ایسے اعمال کو جنم دے گی جن کی توقع کسی خدا پرست سے نہیں کی جا سکتی۔ بلاشبہ یہ رویہ اختیار کرنا انسان کی بدقسمتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کے پاس ہر حال میں کھونے کے لیے اتنا کچھ ہوتا ہے جس کے مقابلے میں نہ ملی ہوئی یا مل کر چھن جانے والی چیزوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر آج کل کا اہم ترین مسئلہ مالی تنگی ہے۔ لوگوں کے اخراجات آمدنی کے مقابلے میں اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ زندگی گزارنا مشکل ہو چکا ہے۔ ایسے میں لوگ شکوے

شکایات کرنا شروع ہوجاتے ہیں۔ مزاج میں چڑچڑا پن آجاتا ہے۔ دوسروں اور خصوصاً زیردستوں سے وہ بداخلاقی سے پیش آنے لگتے ہیں۔آسمان والے سے بھی انہیں رنجش ہوجاتی ہے۔ان کے مطابق اس نے انہیں دیا ہی کیا ہوتا ہے۔وہ اس سے بے پرواہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔اس کی شکرگزاری سے منہ موڑ لیتے ہیں۔اس کی بندگی سے بے رغبت ہوجاتے ہیں۔

ایسے میں کوئی ان سے دریافت کرے کہ اگر آسمان والا انہیں ساری دنیا کے خزانے دیدے اورصرف ان کی آنکھیں چھین لے۔کیا وہ یہ سودا پسند کریں گے؟ کیا وہ چاہیں گے کہ گاڑیوں میں بیٹھیں لیکن بیساکھیوں کے سہارے؟ کیا وہ لاکھوں روپے کے ایسے بینک اکاؤنٹ رکھنا پسند کریں گے جن کی چیک بکس تو ان کے پاس ہوں مگر ان پر سائن کرنے والے ہاتھ نہ ہوں؟ کیا وہ چاہیں گے کہ انہیں محل و جائیداد مل جائے لیکن اولاد لے لی جائے؟ کوئی یہ نہیں چاہے گا۔ پھر لوگوں سے یہ پوچھنا چاہیے کہ کیا وہ پچاس سال تک عیش وعشرت کی ایسی زندگی گزارنا پسند کریں گے جس کے بعد، زیادہ نہیں صرف پچاس ہزار سال تک جو آخرت کے ایک دن کے برابر ہیں، آگ میں جلنا پڑے؟

اگر جواب ’’نہیں‘‘ میں ہے تو پھر ایسے لوگوں کی خدمت میں یہ عرض کیا جائے گا کہ آپ ایک مہربان کی ناقدری مت کیجیے۔اس کریم کی احسان فراموشی مت کریں جو آپ کو ستر ماؤں سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔جس نے بلا جبر اور بلا استحقاق ہمیں اتنا کچھ دیا ہے جو کسی نے دیا ہے نہ دے سکتا ہے۔اس دنیا میں جس کو اچھی اولاد ملے وہ خوش نصیب گنا جاتا ہے۔ جسے اچھا شوہر یا بیوی ملے، اچھا استاد ملے، اچھا دوست ملے، اچھا افسر ملے، اچھا ہمسایہ ملے وہ خوش قسمت شمار ہوتا ہے۔ قرآن کی پہلی آیت بتاتی ہے کہ انسان بڑا خوش نصیب ہے کہ اسے اچھا رب مل گیا ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ انسانوں کا واسطہ ایک ایسی ہستی سے ہے جس کی طرف سے انہیں ہر حال میں بھلائی ہی پہنچے گی۔اور یہ بھلائی وہ لوگوں کو ان کی خوبیوں کی بنا پر نہیں دیتا، اپنی خوبیوں کی بنا پر دیتا ہے۔

زندگی میں اور کچھ نہیں کیا تو قرآن کی صرف اس ایک آیت کو سمجھ لیں۔ یہی ایک آیت ہدایت کے لیے کافی ہے۔یہی ایک آیت نجات کے لیے کافی ہے۔

یہ کیسی بری قناعت ہے

قناعت اعلیٰ ترین انسانی صفات میں سے ہے۔قناعت کرنے والاشخص اپنی خواہشات کو اپنی ضروریات اور حالات کے تابع کر دیتا ہے۔وہ زیادہ کی دوڑ میں شامل ہونے کے بجائے صبر کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔وہ لوگوں سے مقابلہ کرنے کے بجائے اپنے آپ سے مقابلہ کرنا پسند کرتا ہے۔بلاشبہ ایک قانع شخص بڑا ہی قابل تحسین ہوتا ہے۔

مگر قناعت کی ایک اور قسم ہے جو بہت بری ہوتی ہے۔اس قناعت میں بھی آدمی کم پر صابر وشاکر ہونا پسند کرتا ہے۔وہ دولت وثروت،شان وشوکت اور مقام ومرتبے میں دوسروں سے پیچھے رہنا گوارا کر لیتا ہے۔وہ نعمت وعزت کی اس سطح کو پسند کرتا ہے جو بلاشبہ ایک کم تر سطح ہے۔قناعت کی یہ قسم انسان اس دنیا اور اس کی نعمتوں کے لیے نہیں، بلکہ رب کی بنائی ہوئی جنت کے لیے اختیار کر لیتے ہیں۔

انسان کا وجود خواہشات کا اتھاہ سمندر ہے۔یہ سمندر اس قدر بڑا ہے کہ زمین وآسمان کی وسعت اس کے سامنے ہیچ ہے۔خواہشات کے اس اس لامحدود صحرا اور اس بحر ناپید کنار کی سمائی اگر کہیں ہے تو فردوس کی وہ حسین وبے مثل بستی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام تر قدرت کے ساتھ بنایا ہے۔کوئی شخص اگر خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو دوسری بات ہے، وگرنہ جس نے جنت کو مان لیا، اسے پہچان لیا، اس کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس بستی میں بلند مرتبے کی خواہش نہ کرے۔

جنت چونکہ آخرت میں آنے والی چیز ہے اس لیے اس کی حقیقی نوعیت کو سمجھانا اس دنیا میں ممکن نہیں ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسانی تصورات کے پس منظر ہی میں اس کی وضاحت کی ہے۔جس کے مطابق اس جنت میں کوئی دوسری اور تیسرے درجے کی چیز نہیں ہوگی۔اس میں صرف اور صرف دو مقامات ہیں۔ایک وہ مقام ہے جس میں اس دنیا اور انسانی تصور میں آنے والی بہترین نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اکٹھی کر دیں ہیں۔ان نعمتوں پر کسی قسم کی روک ٹوک ہوگی اور نہ کبھی اللہ تعالیٰ ان کو منقطع کریں گے۔

دوسرا مقام وہ ہے جہاں مندرجہ بالا تمام نعمتوں کے ساتھ وہ نعمتیں بھی جمع کر دی جائیں گی جو نہ اس دنیا میں دستیاب ہیں اور نہ جن کا خیال بھی کبھی کسی انسان کے دل میں گزرا ہوگا۔اس میں خواہش کی تسکین کا

سامان بھی ہوگا اور لطف وسرور کی ان نئی سطحوں سے بھی انسان کو متعارف کرایا جائے گا، جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ اس مقام میں نعمتوں کی اس سطح کے ساتھ اللہ تعالیٰ بادشاہی کا عنصر جمع کر دیں گے۔

اس کو دنیا کے لحاظ سے اس طرح سمجھیں کہ ہر معاشرے میں ایک طبقہ امرا ہوتا ہے۔ جن کے پاس اس معاشرے میں دستیاب ہر نعمت میسر ہوتی ہے۔ تاہم اسی سوسائٹی میں ایک محدود طبقہ حکمرانوں کا بھی ہوتا ہے۔ جن کے پاس نہ صرف یہ تمام نعمتیں بھی ہوتی ہیں بلکہ وہ اپنے اختیارات اور طاقت کی بنا پر دنیا بھر سے اپنے لیے سہولت جمع کر لیتے ہیں۔ پھر حکمرانی کی انسانی جبلت کی تسکین بہر حال انہی میں سب سے زیادہ پوری ہوتی ہے۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی جنت میں کوئی مقام حقیر اور کمتر نہیں۔ یہاں یا تو اعلیٰ مقام ہے یا پھر بہت اعلیٰ مقام۔ اسی لیے وہ قرآن میں اس جنت کے متعلق کہتے ہیں کہ محنت کرنے والو تمھیں اگر محنت کرنی ہے تو اس جنت کے لیے کرو۔ مقابلہ کرنے والو اگر مقابلہ کرنا ہے تو میرے اس شاہکار کے لیے کرو۔ قرآن تو آیا ہی اسی لیے ہے کہ دنیا کی حقیر پونجی کے پیچھے بھاگنے والوں کو جنت کی خبر دے۔ فانی دنیا کی فانی نعمتوں سے نکال کر جنت کی ابدی بادشاہی کی خبر دے۔ مگر بدقسمتی سے لوگوں نے اپنی قناعت کے اظہار کے لیے کوئی مقام چنا ہے تو وہ جنت کا مقام ہے، جہاں کوئی درجہ کم تر نہیں ہوتا۔

اصل بات یہ ہے کہ لوگ جنت کے لیے محنت نہیں کرنا چاہتے۔ وہ اس کو اپنی زندگی کا مقصود نہیں بنانا چاہتے۔ وہ اس کی قیمت نہیں دینا چاہتے۔ چنانچہ وہ بغیر محنت کے جنت میں کوئی چھوٹا موٹا مقام چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جان لینا چاہیے کہ بغیر محنت کے آدمی کو اگر کچھ ملے گا تو وہ جہنم کی آگ ہوگی، جنت میں چھوٹا موٹا مقام نہیں۔

جنت کا وعدہ حقیقت ہے کوئی قصہ کہانی نہیں۔ اس کے لیے انسان کو سر توڑ جدو جہد کرنی ہوگی۔ قربانی کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ اعلیٰ ترین اخلاقی اعمال کرنے ہوں گے۔ یہ نہ ہوسکے تو رب کے حضور اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر کے اپنی غلطیوں کی تلافی کرنی ہوگی۔ عمل صالح کی کوشش کرنا ہوگی۔ جنت کے دو مقامات میں جانے کے یہی دو راستے ہیں، تیسرا کوئی راستہ نہیں۔

پاکستان کے امکانات

مغربی تہذیب کے موجودہ غلبہ سے قبل دنیا بھر میں مسلمان ایک غالب تہذیب کے طور پر موجود تھے۔اس وقت مسلمانوں کی تین بڑی سلطنتیں قائم تھیں۔ایران کی صفوی، ہندوستان کی مغلیہ اورترکی کی عثمانی حکومت۔انہوں نے دنیا کے تینوں متمدن براعظموں پر اپنا اقتدار قائم کررکھا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز تک مغربی طاقتیں دنیا بھر پر غالب ہوگئیں۔دیگر مسلم حکومتوں کی طرح انہوں نے مغلیہ سلطنت اوراس کے زیرنگین اس پورے علاقے پر قبضہ کرلیا جوآج دنیا میں جنوبی ایشیاکے نام سے جانا جاتا ہے۔دیگراسلامی ریاستوں کے برعکس مغلیہ سلطنت میں مسلمان ایک اقلیت میں تھے۔مغلیہ حکمران مسلمان ضرور تھےمگران کی سلطنت میں ہندومسلمان سب شامل تھے۔جب انگریزوں نے یہاں کےلوگوں کوشکست دی تو یہ محض مسلمانوں کی شکست نہیں تھی بلکہ اس علاقے کےتمام لوگوں کوشکست دے کراپنا اقتدار قائم کیا تھا۔

تاریخ میں یہ سوال بڑا اہم رہا ہے کہ ہزاروں میل دور سے آئے ہوئے گنتی کے غیرملکی تاجر، اس وسیع وعریض ملک پرکس طرح قابض ہوگئے۔خاص کراگر یہ ذہن میں رہے کہ مقامی آبادی بہت زیادہ تھی اوردولت وثروت کی کوئی کمی نہ تھی۔

اس سوال کے بہت سے جوابات دیے گئے ہیں۔مگر غالباً تاریخی اعتبار سے سب سے زیادہ درست جواب یہ ہے کہ ہندوستان کی دولت وثروت، وسائل کی فراوانی اور اسباب کی بہتات مقامی لوگوں کی سب سے بڑی کمزوری ثابت ہوئے۔یہ پانچ ہزارسال تک نہ صرف غیرملکی حملہ آوروں کو دعوت دیتے رہے بلکہ مقامی لوگوں کوبھی اتنا کمزورکردیا کہ زمانہ قبل از تاریخ کےآریوں سے لے کر دورجدید کےانگریزوں تک ہرغیرملکی حملہ آور کے مقابلے میں مقامی لوگوں کوشکست ہوئی۔

اناج،سبزیاں،پھل،کپاس،کپڑا،شکر،سونا چاندی،لوہا،مصالحہ جات اوردیگراسباب زندگی ہندوستان میں کثرت کے ساتھ پیدا ہوتی تھیں۔ملک کی وسعت،معتدل اورمتنوع آب وہوا، زرخیز زمین سونے چاندی کی فراوانی اور ہرطرح کے ہنرمندوں کی کثرت کی بنا پر یہ ملک ہمیشہ

سونے کی ایک چڑیا بنا رہا۔ غیر ملکی حملہ آور ان کے لیے یہاں آتے اور ان کے اسیر ہو کر یہیں کے ہو جاتے۔ یہ نعمتیں چند نسلوں میں ان کی طاقت سلب کر لیتیں۔ زندگی میں ان کے لیے کوئی چیلنج نہیں رہتا، اس لیے اس کا مقابلہ کرنے کی عادت بھی ختم ہو جاتی۔ وہ کمزور ہونے لگتے اور جب کوئی نیا حملہ آور یہاں آتا تو سامان اور فوج کی کثرت کے باجود وہ سخت جان اور جفاکش دشمن کا سامنا نہ کر پاتے۔

آج اہل پاکستان، جو اس خطے میں عظیم مسلم اقتدار کے وارث ہیں، طرح طرح کے مسائل کا شکار ہیں۔ عظیم امکانات کی سرزمین ہونے کے باجود یہاں کا عام آدمی مسلسل تکلیف کے عالم میں ہے۔ یقیناً اس صورتحال کے بہت سے داخلی اور خارجی اسباب ہیں اور بلاشبہ یہ ایک انتہائی ناپسندیدہ صورتحال ہے۔ مگر اس کے نتیجے میں اہل پاکستان کی کو مسلسل چیلنجز کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ چیلنجز دراصل اہل پاکستان کے لیے قدرت کی طرف سے طاقت کا بیش بہا خزانہ ثابت ہو رہے ہیں۔ انہی کی وجہ سے پاکستانی قوم اپنی صلاحیتیوں میں دنیا کی دیگر اقوام سے بہت بہتر ہے۔

اقوام عالم میں پاکستانی قوم اگر پیچھے ہے تو اس کا سبب صلاحیتوں یا وسائل کی کمی نہیں بلکہ اس لیڈر شپ کا نہ ہونا ہے جو صحیح رخ پر ان صلاحیتوں کو موڑ سکے۔ ہماری لیڈر شپ اس وقت قوم کو صرف اور صرف ٹکراؤ کا سبق دے رہی ہے۔ وہ انہیں صرف اور صرف نفرت کی زبان سکھائی رہی ہے۔ ان کے نزدیک ہر مسئلہ صرف بندوق کی گولی سے یا سیاست کے میدان میں ٹھیک ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ آج کے دور میں قوموں کی زندگی کا فیصلہ تعلیم کرتی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ اخلاقی تربیت کے بغیر قومیں بام عروج کی سیڑھیاں طے نہیں کرتیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ صبر و اعراض کے بغیر کبھی طاقت حاصل نہیں کی جا سکتی۔

آج اگر اہل پاکستان صرف اپنی قیادت کا درست انتخاب کر لیں تو ان کے لیے ترقی اور عزت و سرفرازی کی نئی راہیں کھل جائیں گی۔ آج اہل پاکستان کے پاس سب کچھ ہے، صرف اچھے قائدین نہیں۔ اہل پاکستان اپنے قائدین بدل لیں، خدا ان کی تقدیر بدل دے گا۔

زندگی کا سفر

ہوائی جہاز میں سفر کرنے والے مسافروں کی نشستوں کو عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ایک Economy Class اور دوسری First Class۔اکانومی کلاس میں سفر کرنے والوں کو جو سہولیات دی جاتی ہیں وہ بہت محدود ہوتی ہیں۔انہیں سہولیات سے زیادہ ضروریات کہنا مناسب ہوگا۔بیٹھنے کی نشستوں سے لے کر کھانے پینے کی اشیا تک ہر چیز ''کام چلاؤ'' کے اصول پر فراہم کی جاتی ہے۔

جبکہ فرسٹ کلاس میں ہر ضرورت،سہولت اور لگژری کے ساتھ فراہم کی جاتی ہے۔فرسٹ کلاس کی نشستیں وسیع اور کشادہ ہوتی ہیں۔بعض اوقات ان میں لیٹ کر سو جانے تک کی سہولت ہوتی ہے۔یہ جہاز کے اگلے حصے میں واقع ہوتی ہیں تاکہ اترنے اور چڑھنے میں مسافروں کو اولیت اور سہولت حاصل رہے۔ان کی خدمت کے لیے مقرر کردہ اسٹاف عموماً خوش شکل ہوتا ہے اور بہت پر جوش رویے کا مظاہرہ کرتا ہے۔انہیں کھانے پینے کی اشیا زیادہ مقدار میں اور زیادہ تنوع کے ساتھ دی جاتی ہیں۔یہ ساری سہولتیں فرسٹ کلاس والوں کا سفر بہتر بنانے کے لیے دی جاتی ہیں۔لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سفر اکانومی کلاس میں ہو یا فرسٹ کلاس میں بہرحال گزر جاتا ہے۔دونوں قسم کے مسافر اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں اور یہ سفر ماضی کی ایک یاد بن جاتا ہے۔

زندگی کا سفر بھی جہاز کے سفر سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔یہ سفر اکانومی کلاس میں بھی کیا جاسکتا ہے اور فرسٹ کلاس میں بھی۔دنیا میں ہر شخص یہ سفر فرسٹ کلاس میں کرنا چاہتا ہے۔اس میں کوئی حرج نہیں کہ یہ سفر فرسٹ کلاس میں کیا جائے،مگر زندگی میں اکثر اوقات فرسٹ کلاس میں سفر کی قیمت رزق حرام سے مال کما کر دی جاتی ہے۔یہ نہ بھی ہو تب بھی یہ فرسٹ کلاس زندگی آخرت کی ابدی نعمتوں سے انسان کو غافل کر دیتی ہے۔وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ زندگی بہرحال ایک سفر ہے، جسے کچھ دیر بعد ختم ہو جانا ہے۔اس سفر کی ہر خوشگوار بات عنقریب ماضی کی ایک یاد بن کر رہ جائے گی۔اصل زندگی تو موت کی منزل کے بعد شروع ہوگی۔مزہ یہ ہے کہ آدمی اس زندگی میں فرسٹ کلاس مقام حاصل کرے۔ کیونکہ آخرت کی زندگی کسی سفر کا نہیں ابدی قیام کا نام ہے۔

درخت اور انسان

قرآن پاک کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اعلیٰ اخلاقی کردار ہی دین کا مطلوب ومقصود ہے۔کوئی انسان اگر اس کردار کے مطابق زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اسے درخت کو اپنا آئیڈیل بنانا چاہیے۔درخت کے دو پہلو اس معاملے میں انسان کے لیے بہترین رہنما ہیں۔

ایک درخت کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو ہر قسم کے تعصب سے خالی ہونا ہوتا ہے۔ درخت ایک آفاقی پروڈکٹ ہے جس کی نشو ونما میں پوری کائنات حصہ لیتی ہے۔ درخت اپنے وجود کو بڑھاتا ہے اور اس عمل میں وہ کسی سے تعصب نہیں برتتا۔وہ ایک دوسرے درخت کے بیج سے جنم لیتا ہے، مگر اس کے بعد وہ بلاتعصب سورج سے روشنی قبول کرتا ہے۔وہ بغیر کسی تعصب کے آسمان اور بادلوں سے پانی وصول کرتا ہے۔وہ بغیر کسی تعصب کے فضا سے ہوا کو جذب کرتا ہے وہ بغیر کسی تعصب کے زمین سے اس کی زرخیزی اور مٹی اخذ کرتا ہے۔ان سب چیزوں کی مدد سے وہ اپنے وجود کو بڑھاتا ہے اور ایک چھوٹے سے بیج سے، ایک طاقتور اور سایہ دار درخت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اگر وہ تعصب کا مظاہرہ کرتا تو کبھی کوئی بیج درخت نہ بن پاتا۔

درخت کی زندگی میں ہمارے لیے ایک دوسرا نمونہ اس اعتبار سے ہے کہ جب اس کے ساتھ برائی کا معاملہ ہوتا ہے، تب بھی وہ بھلائی کا معاملہ ہی کرتا ہے۔اس کی زندگی کے آغاز ہی پر اسے زمین میں دبا دیا جاتا ہے، لیکن وہ شکایت نہیں کرتا۔ بلکہ شکایت کیے بغیر وہ کوشش اور جدو جہد کرتا ہے اور زمین سے باہر نکل آتا ہے۔ جب وہ باہر نکلتا ہے تو یہ فضا اسے کاربن ڈائی آکسائیڈ دیتی ہے، لیکن وہ انسانوں کو پلٹ کر آکسیجن دیتا ہے۔اس کے وجود کو زمین بدشکل جڑ اور بے روپ تنے کی شکل میں جنم دیتی ہے۔ لیکن وہ پلٹ کر لوگوں کو سبزے، پھول اور پھل کی بہاریں دیتا ہے۔لوگ اسے پتھر مارتے ہیں، لیکن وہ اپنے پھل ان پر نچھاور کر دیتا ہے۔اسے

دھوپ ملتی ہے، لیکن وہ انسانوں کو سایہ دیتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک وقت آتا ہے کہ اسے کاٹ دیا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی یہ لوگوں کے فائدے کے لیے ان کے گھر کا فرنیچر، ان کے بیٹھنے کا صوفہ اور ان کے لیٹنے کی مسہری بن جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب اسے آگ میں جلا دیا جاتا ہے تب بھی وہ لوگوں کو روشنی اور حرارت دیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ درخت کی طرح جو انسان ہر طرح کے تعصب سے پاک ہو اور یکطرفہ طور پر مخلوق خدا کا خیر خواہ ہو، کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے اس کے صبر کا بہترین بدلہ دینگے اور اسے جنت کے ابدی باغوں میں ہمیشہ کے لیے بسا دیا جائے گا۔

حلال و حرام اور مشتبہ امور

''حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں (یعنی جن کا حلال یا حرام ہونا صاف واضح نہیں ہے)۔ تو جس شخص نے اس چیز کو ترک کر دیا جس میں اس کو گناہ (حرام ہونے) کا شبہ ہو تو وہ اس چیز کو بھی چھوڑ دے گا جو صاف، صریح اور کھلا ہوا گناہ ہو۔ اور جو شخص ایسے مشتبہ امر (کو ترک کرنے کے بجائے اس) پر جری ہوگا (یعنی اس کا ارتکاب کرے گا) تو عنقریب وہ صریح اور واضح گناہ میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔ اور معاصی (گناہ) اللہ تعالیٰ کی چراہ گاہیں ہیں جو جانور اس چراگاہ (گناہ و معصیت) کے گرد چرے گا تو عنقریب وہ اس چراہ گاہ میں بھی پہنچ جائے گا (یعنی بالآخر گناہوں میں مبتلا ہو کر رہے گا)۔ (بخاری، کتاب البیوع)

بڑی بی کا مسئلہ

اسحاق ناگی صاحب ہمارے بزرگوں میں سے ہیں۔پچھلے دنوں انہوں نے مجھے فون کرکے ایک مسئلہ میرے سامنے رکھا۔وہ مسئلہ صرف ان کا یا میرا مسئلہ نہیں ہے، ہم سب کا مسئلہ ہے۔اس لیے میں اسے اپنے قارئین کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

ایک بزرگ خاتون ناگی صاحب کے پاس تشریف لائیں۔انہوں نے ناگی صاحب سے کہا کہ وہ دودھ بیچنے کا کام کرتی تھیں۔انہوں نے کبھی اپنے کام میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں کی۔لوگوں سے اگر دودھ کے پیسے لیے تو انہیں خالص دودھ ہی بیچا۔لیکن اب انہیں یہ خیال ہوتا ہے کہ لوگوں کو دودھ دیتے وقت ناپ تول میں جو کمی بیشی ان سے ہوگئی ہوگی- اور ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے تو اس کا کیا ہوگا۔کہیں خدا کے ہاں اس کا حساب کتاب تو نہیں ہوگا۔یہ کہہ کر وہ بزرگ خاتون بہت روئیں۔یہاں تک کہ ناگی صاحب کو بھی اس نے رلا دیا۔

جس وقت ناگی صاحب نے مجھے لاہور سے فون کرکے یہ بات بتائی میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ ہسپتال میں موجود تھا۔ایک مہینے سے میں ہسپتال، لیبارٹریوں اور ڈاکٹروں کو بھگت رہا تھا۔میں نے ان میں سے ہر شخص کو پیسے لینے کے معاملے میں اتنا حساس پایا کہ اس کی کوئی حد نہیں ہے۔مگر اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے معاملے میں بیشتر لوگوں کا معاملہ یہ تھا کہ گویا مفت میں اس سے کوئی بیگار لیا جا رہا ہے۔

ہماری سوسائٹی میں برسوں سے صرف حقوق کی نفسیات پیدا کی جا رہی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص صرف لینے کے معاملے میں حساس ہو چکا ہے۔دینے کے معاملے میں کم ہی لوگ حساس رہ گئے ہیں۔حالانکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں اپنا فیصلہ اس طرح سنا دیا ہے۔

''تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے، یہ جو دوسروں سے لیتے ،تو پورا لیتے ہیں، اور جب ان کے لیے ناپتے یا تولتے ہیں تو اس میں ڈنڈی مارتے ہیں۔کیا یہ گمان نہیں رکھتے کہ ایک دن اٹھائے جائیں گے؟ ایک بڑے دن کی حاضری کے لیے۔اس دن جب لوگ

رب العالمین کے حضور پیشی کے لیے اٹھیں گے۔'' ،(المطفّفین 1-6:83)

قرآن پاک کی یہ آیت صاف طور پر بتاتی ہے کہ قرآن ناپ تول میں ڈنڈی مارنے والوں کے لیے ہلاکت کا فیصلہ سناتا ہے۔ناپ تول میں یہ ڈنڈی عام سوچ کے مطابق صرف دکان داروں تک محدود نہیں، بلکہ اس کا اطلاق ہر ایسے معاملے پر ہوتا ہے جہاں لوگ،اس معاہدے پر دوسروں سے کچھ لیتے ہیں، کہ وہ اس کے عوض لوگوں کو کچھ دیں گے بھی۔ چاہے دینے والا کوئی دکان دار ہو جو لوگوں کو سامان ضرورت دیتا ہو، چاہے دینے والا اپنا وقت دینے کا پابند ہو یا دفتروں میں ڈیوٹی کرنے والا کوئی ملازم۔جس شخص نے پورا لینے کے بعد پورا نہ دیا وہ بلاشبہ ہلاک ہوگا۔

ناپ تول میں کمی اگر انسان سے ہوجائے، جیسا کہ ان بڑی بی سے زندگی میں کبھی ہوئی ہوگی،تو قرآن پاک کے مطابق (الانعام 153:6) یہ قابل معافی ہے۔مگر جہاں لوگ لینے اور دینے کے پیمانے مکمل طور پر بدل دیں۔ جہاں یہ طے ہوجائے کہ دودھ بہر حال خالص نہیں دیا جاسکتا، پیٹرول بہر حال پورا نہیں دیا جاسکتا، دفتر میں پورا کام کرنا بہر حال ممکن نہیں ہے تو ایسی قوم کی ہلاکت کے لیے خدا کو قیامت کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ہماری سوسائٹی میں بدقسمتی سے ایک سانحہ اور ہوگیا ہے کہ اب یہاں لینے کے بعد پورا نہ دینا، کچھ افراد کا معاملہ نہیں رہا ہے، بلکہ اب یہ سوسائٹی کا معروف طریقہ بن گیا ہے۔جو شخص دفتر میں اپنا کام محنت سے کرتا ہے وہ بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔حالانکہ ایسا کرنے والا سب سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے۔ کیونکہ قیامت کے دن وہ بالیقین اپنے آپ کو خدا کے احتساب سے بچا رہا ہوتا ہے۔کیونکہ لینے کے بعد دینا تو ہر حال میں پڑے گا۔دنیا میں نہیں دیا تو کوئی بات نہیں خدا قیامت کے دن دلوا دے گا۔مگر اس روز انسان کے پاس دینے کے لیے سوائے اپنی نیکیوں کے اور کچھ نہیں ہوگا۔اس روز اپنی غلطی پر رونے والی بڑی بی کو تو جنت میں بلند درجات مل جائیں گے،،مگر جان بوجھ کر دھوکہ دینے والوں کے لیے جہنم کی وہ وادی ہوگی جس سے خود جہنم بھی پناہ مانگتی ہے۔

لیجیے انقلاب آ گیا

ہمارے ذرائع ووسائل ایک طویل عرصے سے انقلاب کا انتظار جاری ہے۔اس انتظار کا پس منظر یہ ہے کہ ہمارے ملک کے ذرائع وسائل پر، دیگر بہت سے ترقی پذیر مما لک کی طرح،استحصالی طبقات کا قبضہ ہے۔فوج، جا گیردار، سیاستدان ، سر مایہ داراور بیورو کریسی میں پایا جانے والا استحصالی عنصر اس ملک کی سیاسی اور معاشی شہہ رگ پر قابض ہے۔دوسری طرف عوام کو بنیادی سہولیات بھی میسر نہیں ہیں۔غریب ہر دور میں چاہے وہ فوجی دور ہو یا عوامی سیاسی دور، یکساں طور پر پستا رہا ہے۔حکومتیں بدلنے سے عوام کی تقدیر کبھی نہیں بدلی۔ ہر آنے والا پچھلے پر لعنت کرتا ہے،نئی روشنی اور ترقی کی نوید دیتا ہے اور جب جاتا ہے تو صورتحال پہلے سے زیادہ خراب ہو چکی ہوتی ہے۔عوام کے کچلے جانے کا یہ عمل کئی دہائیوں سے جاری ہے۔

اس عرصے میں ہمارے مذہبی اور غیر مذہبی دانشور قوم کو ایک عظیم انقلاب کی نوید دیتے رہے ہیں۔ان کا یہ خیال ہے کہ جس طرح روس ،فرانس اور ایران میں انقلاب آیا تھا،اسی طرح پاکستان میں بھی عوامی انقلاب کی لہر استحصالی طاقتوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جائے گی۔انقلاب کی لہر کو پیدا کرنے کا جو طریقہ انہوں نے ٹھیک سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ وہ استحصالی طبقات کے خلاف غصے کی وہ آگ بھڑکائیں کہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی تپش آتش فشاں بن کر دہکنے لگے۔قلم کے جوش اور لہجے کی گرمی سے عوامی جذبات کو برانگیختہ کریں۔اپنے فکر ونظر کے ہر سوتے کو صرف لوگوں میں ردعمل کی نفسیات کے فروغ کے لیے وقف کردیں۔

چنانچہ اس پس منظر میں ہر قلمکار اور ہر مقرر کوشش کرتا ہے کہ وہ ان طبقات کے خلاف لوگوں کے ذہن میں نفرت کا زہر انڈیلتا رہے۔ ان کے ظلم ، بدعنوانیوں ، ریشہ دوانیوں سے عوام کو لمحہ بہ لمحہ آگاہ کرتا رہے۔اس مقصد کے لیے صاحب اقتدار شخص کو عام طور پر ان استحصالی طبقات کا نمائندہ بنا کر سامنے لایا جاتا ہے۔پھر یہ لوگ عوام کو بتاتے ہیں کہ ان کا ہر حکمران اصل میں حکمران نہیں بلکہ شیطان ہے۔اس کے دور میں کوئی خیر نہیں اوراس کی ذات سے کسی کا بھلا نہیں ہوسکتا۔چنانچہ اس قوم کی تاریخ

یہی ہے کہ جو شخص حکومت میں آجاتا ہے اس کی برائیاں لوگوں کو ازبر ہو جاتی ہیں اور اس کا ہر اچھا کام اس کا ذاتی مفاد ہی لگنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عوام ہر سیاسی اور فوجی حکومت سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ سن ستتر تک عوامی تحریک کی مدد سے اور اس کے بعد عوام کی خاموش رضامندی کے ساتھ ہر حکومت بدل جاتی ہے۔ لیکن حکومتی تبدیلی چونکہ عوامی انقلاب کے مترادف نہیں ہوتی اس لیے وہ ایک دفعہ پھر نئے آنے والے پر اپنی توپوں کے دہانے کھول دیتے ہیں۔

لیکن ان مفکرین اور دانشوروں کو یہ نہیں معلوم کہ لوگوں کے ذہنوں میں منفی سوچ کا جو بیج انہوں نے لگایا تھا، وہ اب برگ و بار لانے لگا ہے۔ انقلاب آگیا ہے۔ مگر یہ ایک بہت برا انقلاب ہے۔ لوگوں نے اپنے معاملات خود ٹھیک کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ مگر اس کا طریقہ یہ نہیں کہ استحصالی طبقات کے خلاف وہ اٹھیں، بلکہ وہ خود استحصالی طبقات میں شامل ہو گئے ہیں۔ ملازمت پیشہ لوگوں نے رشوت اور بدعنوانی کے ذریعے سے جبکہ تاجروں نے ملاوٹ اور گرانی کے ذریعے سے اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔ مڈل کلاس کے ان دو نمایاں طبقات کے بعد جو غریب غربا رہ گئے تھے، انہوں نے اسٹریٹ کرائم کو اپنے ہر مسئلے کا حل بنا لیا ہے۔ سوسائٹی کے باقی لوگوں کے پاس سوائے صبر اور خودکشی کے کوئی اور چارہ نہیں بچا۔ سو سارے مفکرین اور دانشوروں کو مبارک ہو، انقلاب آگیا ہے۔

مگر یہ راستہ تباہی کا راستہ ہے۔ ہم اس راستے کے ہر موڑ اور ہر رہگذر پر کھڑے ہو کر لوگوں کو یہ بتائیں گے کہ یہ غلط راستہ ہے۔ نفرت نہیں بلکہ محبت، بدلہ نہیں بلکہ درگزر، برائی نہیں بلکہ بھلائی، یہی طریقہ ہے جو قوم کی نجات کا راستہ ہے۔ ساری دنیا میں اگر برائی پھیل جائے تب بھی ہمیں نیکی کرنی ہوگی اس لیے کہ ہمیں اپنا بدلہ اپنے رب سے لینا ہے، انسانوں سے نہیں۔ ہمیں آخرت چاہیے، دنیا نہیں۔ ہمیں حبیب خداؐ کے راستے پر چلنا ہے، کمیونسٹوں کے طریقے پر نہیں۔

اسی سے اصل انقلاب آئے گا۔ اسی سے اصل خیر پھوٹے گی۔ اسی سے صبح طلوع ہوگی۔

شام کا پیغام

یہ سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی شام تھی۔میں مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا تو سرد ہوا کے جھونکوں نے میرا استقبال کیا۔میں نے سر اٹھایا۔آسمان پر ایک ایسا منظر تھا جس کے حسن نے مجھے مسحور کر کے رکھ دیا۔سردیوں کی اس گلابی شام میں آسمان کے مغربی افق پر گویا شعلے بھڑک رہے تھے۔سورج تو ڈوب چکا تھا مگر اپنے پیچھے شفق کی وہ لالی چھوڑ گیا،جس نے نیلے آسمان کو دلہن کے سرخ لباس کی طرح سجا دیا تھا۔

سرد ہوا میں انگاروں کی طرح دہکتے آسمان کا یہ منظر اتنا حسین تھا کہ پوری کائنات اس کے مشاہدے میں مصروف تھی۔پرندے اس آسمانی دلہن کی بارات کا دیدار کرتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔فضا میں بکھرے بادلوں کو کوئی جلدی نہ تھی۔وہ اپنی جگہ ٹھہر کر اس حسین منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔بلند قامت درخت بھی بادلوں کی دیکھا دیکھی،حسن فطرت کے اس نظارہ سے محظوظ ہونے لگے۔حد تو یہ ہے کہ شب کی سیاہی بھی اس منظر کو دیکھنے نکل آئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ فطرت کی ہر شے اس بے حد حسین منظر کو دیکھ کر خالق کائنات کی حمد و تسبیح کرنے لگی ہے۔مگر جس ہستی کو زمین کا بادشاہ بنایا گیا تھا،وہ بالکل بے پروا اپنے دھندوں میں لگا تھا۔شاپنگ سنٹر سے نکلتے،گاڑیوں میں بیٹھتے،سڑکوں پر چلتے یہ لوگ سب سے بڑھ کر اس کے اہل تھے کہ یہ منظر دیکھتے اور خدا کی حمد اور تعریف کے نغمے گاتے۔مگر آہ یہ انسان،اس کے پاس ہر چیز کا وقت ہے۔خدا کی صناعی کو دیکھ اس کی ثنا اور تعریف کا وقت نہیں ہے۔

وہ جو اپنی ذات میں محمود ہے اس سے بالکل بے نیاز ہے کہ اس کی حمد کی جائے۔وہ تو اس جیسے نہ جانے کتنے جلوے صبح و شام ویرانوں میں بکھیرتا رہتا ہے۔جبریل و اسرافیل جس کی حمد کرتے ہوں ،اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ جن و انس میں سے کون اس کی شکر گزاری کرتا ہے اور کون نہیں۔

افق پر سیاہی بڑھتی جارہی تھی اور شام کی سرخی، گزرتی عمر کی طرح تیزی سے ڈھل رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ ڈوبتی شام ایک پیغام دے رہی ہے۔ وقت کم ہے۔ خدا کی حمد کر کے، اس شام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے نام کرلو۔ خدا کی بادشاہی قائم ہونے کو ہے۔ جنت دلہن کی طرح سجائی جارہی ہے۔ اُس کی ہر شام، اِس شام سے زیادہ حسین ودل نشین ہوگی۔ اسے مانگ لو۔ خدا اپنی حمد کے ساتھ کی گئی دعا رد نہیں کرتا۔ اس سے فردوس کی ابدی بادشاہی مانگ لو۔ جو جبریل واسرافیل کو نہیں مل سکتا، وہ مانگ لو۔

اس شام کا یہ پیغام، باقی انسانوں کا مجھ پر قرض تھا، جو یہ تحریر لکھ کر میں نے اتار دیا۔

اسلام کے **ستون** اور **ایمان کی شاخیں**

”سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنھما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمارتِ اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر اٹھائی گئی ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا اور ماہِ رمضان کے روزے رکھنا۔“

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان کی ساٹھ سے اوپر کچھ شاخیں ہیں اور حیا (شرم ولحاظ) ان میں سے ایک (اہم ترین) شاخ ہے۔“

”سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنھما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ سے پوچھا کہ کون سا اسلام بہتر ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھانا کھلاؤ اور جان پہچان رکھنے والوں اور نہ رکھنے والوں سب کو سلام کرو۔“

(بخاری)

دو قسم کی مکھیاں

شہد انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔انسان ہر دور میں اسے دوا، غذا اور ذائقے کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔شہد جس طرح انسانوں کو ملتا ہے وہ بھی ایک بڑی دلچسپ و عجیب شے ہے۔شہد فطرت کی دیگر نعمتوں کے برعکس قدرتی طور پر دستیاب نہیں ہوتا بلکہ ایک خاص قسم کی مکھی کی ذہانت، صلاحیت اور محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ عمل اتنا غیر معمولی ہے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہ بیان کیا ہے کہ:

''ہم نے شہد کی مکھی پر اس پورے عمل کو وحی کیا ہے''۔(النحل 16:67)۔

اس عمل میں شہد کی مکھی فطرت کے دسترخوان سے ان گنت پھولوں کا رس چوستی ہے اور پھر اسے شہد میں تبدیل کر کے انسانوں کے لیے فراہم کرتی ہے۔

شہد کی مکھی کے برعکس گھروں وغیرہ میں پائے جانے والی ایک دوسری مکھی بیماریوں کا باعث بنتی ہے۔ یہ مکھی عام طور پر گندی اور غلیظ چیزوں پر بیٹھتی ہے اور وہیں سے مختلف جراثیم انسانوں کے کھانے پینے کی اشیا میں منتقل کر دیتی ہے۔یوں یہ انسانوں کو شہد کے بجائے بیماری کا تحفہ دیتی ہے۔

مکھیوں کی ان دو اقسام کی طرح انسانوں کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ایک انسان وہ ہوتے ہیں جو شہد کی مکھی کی طرح پھولوں اور ان کے رس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو انسانوں سے حسن ظن رکھتے ہیں۔ان کے متعلق برا گمان کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔محض ظن و گمان کی بنیاد پر لوگوں کے متعلق رائے دینے سے پرہیز کرتے ہیں۔

اس کے برعکس دوسرے قسم کے لوگ گندگی کی مکھی بننا پسند کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو انسانوں سے ہمیشہ بدگمانی کرتے ہیں۔ وہ چن چن کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہر بات کے منفی پہلو تلاش کرتے ہیں۔وہ بلا تحقیق رائے قائم کرتے اور بلا ثبوت الزام دھرتے ہیں۔ان کی دلچسپی

انسانوں کے نقائص، عیوب، کمزوریوں اور خامیوں تک رہتی ہے۔ یہ کبھی انہیں نہ ملیں تو بدگمانی کر کے انہیں دریافت کر لیتے ہیں اور پھر اطمینان سے ہر جگہ پھیلاتے ہیں۔

پہلی قسم کے لوگ اپنے حسن ظن کی وجہ سے معاشرے کو حسن نظر اور حسن عمل کا شہد دیتے ہیں۔ مگر دوسری قسم کے لوگ معاشرے کو صرف اور صرف بیماریاں دیتے ہیں۔ معاشرے میں الزام، بہتان، غیبت، تضحیک اور انسانوں کے تمسخر و تذلیل کی بیماریاں ان کی بدگمانی ہی سے جنم لیتی ہیں۔

ہر انسان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دیکھے کہ آیا اس نے زندگی شہد کی مکھی کے اصول پر گزاری ہے یا گندگی کی مکھی کی طرح وہ غلاظتوں کا اسیر بن کر رہ گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ایک ذکر

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ۔

''اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں؛ وہ تنہا ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں؛ بادشاہی اُس کی ہے اور حمد بھی اُسی کے لیے ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

ان کلمات کے حوالے سے ارشاد گرامی ہے: ''جس نے دن میں سو مرتبہ یہ ذکر کیا، اُس کے لیے دس غلاموں کو آزاد کرنے کے برابر اجر ہے، اِس کے علاوہ سو نیکیاں اُس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں اور سو گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اور شام تک وہ شیطان سے پناہ میں ہوتا ہے۔ (بخاری، رقم: 3293)

جعلی نوٹ

پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ پانچ ہزار کا جعلی نوٹ مارکیٹ میں پھیل رہا ہے۔ یہ نوٹ بظاہر بالکل اصلی نوٹ جیسا ہے۔ جب تک بہت غور سے نہ دیکھا جائے اصلی اور جعلی نوٹ کا فرق واضح نہیں ہو پاتا۔

تاہم حقیقت یہ ہے کہ کوئی جعلی نوٹ کبھی سو فیصد اصلی نوٹ جیسا نہیں ہوتا۔اصلی نوٹ حکومت کی اس ضمانت کے ساتھ جاری ہوتا ہے کہ جب کبھی کوئی شخص یہ نوٹ لے کر حکومت کے پاس جائے گا تو وہ اس کے عوض ،نوٹ پر لکھی ہوئی رقم کے مساوی قیمت اسے دے گی۔ یہ قیمت سونے کی شکل میں بھی ہوسکتی ہے اور فارن کرنسی کی شکل میں بھی ۔نوٹ حکومت پر ایک بہت بڑی ذمہ داری ہوتا ہے،اس لیے وہ اہتمام کرتی ہے کہ اس کی نقل تیار نہ ہوسکے اوراس کے لیے بہت سے اقدامات کیے جاتے ہیں۔

نوٹ کا مخصوص کاغذ، اس کا رنگ،اس میں ڈلا ہوا دھاگہ، ابھری ہوئی تحریر اور پوشیدہ تصویر وغیرہ سب مل کر اس کو یقینی بناتے ہیں کہ جعلی نوٹ کسی نہ کسی طرح پہچان میں آجاتا ہے۔تاہم اس کے باوجود جعلی نوٹ چھپتے ہیں اور لوگوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ لین دین کرتے ہوئے نوٹ کو غور سے نہیں دیکھتے اور نہ اسے جانچتے ہیں۔

جس طرح جعل ساز لوگ جعلی نوٹ بناتے ہیں اسی طرح شیاطین اور گمراہ لوگ جعلی عقائد اور مصنوعی شریعت بھی گھڑ کر لوگوں کے سامنے ہر دور میں پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ جعلی عقائد اصل میں توہمات اور جعلی شریعت لوگوں کے دین میں اپنے اضافے اور بدعتیں ہوتی ہیں۔توہمات اور بدعات بلاشبہ کبھی ایمان اور شریعت کی جگہ نہیں لے سکتے۔ ایمان اور شریعت پر جنت کی ضمانت ہے جبکہ توہم پرستی اور بدعات کا انجام جہنم کا جیل خانہ ہے۔لیکن اس کے باوجود لوگ ان میں پھنس جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ جعلی نوٹ کی طرح ان چیزوں کو بھی نہیں پرکھتے۔ حالانکہ جعلی نوٹ سے کہیں زیادہ آسان پہچان ان کی ہے۔ ہر عقیدہ اور عمل کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھنے سے اصلی وجعلی کا فرق واضح ہوجاتا ہے۔

ایک مومن پر یہ لازم ہے کہ وہ ہر عقیدہ اور عمل کو اس کسوٹی پر پرکھے۔ جس نے یہ کیا وہ جنت میں جائے گا اور جس نے یہ نہ کیا اس کی کل کمائی کل قیامت کے دن جعلی نوٹ ثابت ہوگی۔

چوہا اور انسان

جینیاتی طور پر چوہا ایک ایسا جانور ہے جو انسانوں سے بہت قریب ہے۔یہی وجہ ہے کہ سائنسدان جب انسانی بیماریوں پر تحقیق کرتے ہیں تو بالعموم چوہوں کو تختۂ مشق بناتے ہیں۔ان میں بیماریوں کے جراثیم داخل کئے جاتے ہیں اور پھر مختلف تجرباتی دوائیں اور ویکسین دے کر ان کے نتائج دیکھے جاتے ہیں۔ اگر یہ تجربات کامیاب رہتے ہیں تو پھر انسانوں کو یہ دوائیں دی جاتی ہیں،تا کہ حتمی نتائج کی جانچ کی جا سکے ۔شاید یہ اسی جنیاتی مماثلت کا نتیجہ ہے کہ چوہے گھروں میں گھس کر انسانی غذائیں مثلاً روٹی وغیرہ شوق سے کھاتے ہیں اور دیگر کار آمد اشیا بھی کتر جاتے ہیں۔اس لیے انسان انہیں سخت ناپسند کرتے ہیں اور ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں۔

آج کل چوہوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک نئ قسم کا ٹریپ استعمال ہورہا ہے۔اس میں سے انسانی غذا مثلاً روٹی چاول وغیرہ کی انتہائی تیز خوشبو اٹھ رہی ہوتی ہے۔اس کی ایک سائیڈ خالی ہوتی ہے اور دوسری سائیڈ پر ایک انتہائی طاقت ور گلو (ایک اچھی قسم کا گوند) لگا ہوتا ہے۔رات کے وقت اسے چوہوں کی آمدورفت کے راستے میں رکھ دیا جاتا ہے۔اندھیرا ہوتے ہی چوہے خوشبو کے پیچھے دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور اس پر چڑھ جاتے ہیں،مگر پھر انہیں اس سے اترنا نصیب نہیں ہوتا، کیونکہ انتہائی طاقت ور گلو ان کے پاؤں جکڑ لیتا ہے۔

عام چوہے دان ایک چوہے کو پکڑ کر غیر مؤثر ہوجاتا ہے،مگر یہ ٹریپ خوراک کی خوشبو کے پیچھے آنے والے مزید چوہوں کا شکار کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹریپ کی جگہ ختم ہوجائے یا چوہے ختم ہوجائیں یا رات ختم ہوجائے۔پھر صبح اس قید خانے کو چیختے چلاتے قیدیوں کے ساتھ اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ جان سے چلے جاتے ہیں،مگر اپنی جگہ سے ہل نہیں پاتے۔

یہ عجیب سانحہ ہے یا شاید یہ بھی جنیاتی مماثلت کا اثر ہے کہ اتنی ہوشیاری سے چوہوں کا شکار کرنے والا انسان خود بھی اکثر ایک "چوہا" ثابت ہوتا ہے۔جنس اور پیٹ کے تقاضے،اولاد کی محبت، مال کی حرص،شہرت کا نشہ، اقتدار کی ہوس، معاشرے میں بلند اسٹیٹس کی تمنا، وسیع بینک بیلنس، بڑی بڑی جائدادیں، ترقی کرتے ہوئے کاروبار، چلتے ہوئے کارخانے، نئے ماڈل کی چمکتی دمکتی گاڑیاں، عالیشان گھر، فارن ٹرپس اور نہ جانے کیا کچھ، یہ سب آدمی کے لیے اکثر اوقات چوہے دان ثابت

ہوتے ہیں، جنھیں اس کا شکاری، ابلیس، اس کی راہ میں رکھ دیتا ہے۔ ان کی کشش میں انسان پیغمبروں سے انگلی چھڑا کر دیوانہ وار ان کی طرف بھاگتا ہے۔ قرآن پیچھے سے آوازیں دیتا رہ جاتا ہے کہ "یہ تو دنیا کی زندگی کا ساز و سامان ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ٹھکانہ ہے" مگر کون پلٹ کر دیکھتا ہے۔

انسان خواہشات کی ایک فہرست بناتا ہے اور ان کے پیچھے دوڑ لگا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان چیزوں کو پا لیتا ہے، مگر عین اسی لمحے حالات کا "گلو" اسے جکڑ لیتا ہے۔ خواہشات کی محدود فہرست ایک لامحدود چکر میں بدل جاتی ہے۔ وہ لاکھ سر پٹخ لے، اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اس چکر سے نکل جائے۔ اس کے بعد صرف موت اس کا مقدر ہوتی ہے، پھر جو بچتا ہے، وہ درحقیقت صرف ایک چلتی پھرتی زندہ لاش ہوتی ہے، جس سے اٹھنے والے تعفن کو ہم جیسے لوگ شاید محسوس نہ کر سکیں، مگر خدا کے فرشتے وہاں سے ناک بند کر کے گزرتے ہیں، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ نیکی کے فرشتے تو وہاں سے گزرتے ہی نہیں، ہاں صرف وہ فرشتے گزرتے ہیں جن کا کام ایسے "چوہوں" کو وقت آنے پر اٹھا کر جہنم کے کوڑے دان میں پھینکنا ہوتا ہے۔

انسانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک کے بعد ایک اس ''ٹریپ'' میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پہلا ''چوہا'' بھی وہاں مزے کر رہا ہے۔ اس کے دیکھا دیکھی وہ بھی اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے اس دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ بالآخر سب کا ایک ہی انجام ہوتا ہے۔ البتہ جو لوگ خواہشات کے اس جال سے بچ کر نکل جائیں، ان کا استقبال عالم کا پروردگار خود یوں کرے گا:

''اے نفس مطمئنہ، لوٹ چل اپنے رب کی طرف اس طرح کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ پھر داخل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں''۔

چوہوں کو پکڑنے والو! اپنے چوہے دان کو پہچانو۔ تمھارے شکاری ابلیس نے اس دور میں نت نئے چوہے دان بنا لیے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کسی روز تم بھی کسی جال میں جکڑے جاؤ اور تمھیں خبر تک نہ ہو۔

اپنے حصے کی روٹی کی تلاش میں پیغمبر سے انگلی مت چھڑاؤ۔ کبھی خدا کی اس کتاب کو بھی پلٹ کر دیکھ لو جس کے لیے دنیا کی کامیابی اتنی ہی غیر اہم ہے جتنی تمھارے لیے آخرت، زندگی کی شام ڈھلنے کو ہے۔ کیوں فانی دنیا کے لیے ابدی آخرت کو کھوتے ہو، کیوں عارضی لذتوں کے لیے بے مثل جنت کو کھوتے ہو۔

دو چار روز اور ہے خوابوں کا سلسلہ

پھر ابد تک رہے گا عذابوں کا سلسلہ

ہمارا صاحب

خاتون نے فون اٹھایا، مخاطب کی بات سنی اور کہا، ''سر میٹنگ میں ہیں، آپ کچھ دیر بعد فون کر لیں''۔ مخاطب نے مزید کچھ کہا، مگر خاتون اپنے اصرار پر قائم رہیں کہ اس وقت صاحب سے بات نہیں ہو سکتی۔

میں نے یہ گفتگو سنی اور خدا کی عظمت کا ایک نیا در مجھ پر وا ہو گیا۔ خدا کتنی عظیم ہستی ہے۔ کروڑوں اور اربوں کہکشاؤں کا انتظام کرنے والا رب، لاکھوں قسم کی کھربوں مخلوقات کو رزق فراہم کرنے والا رب، ختم نہ ہونے والی اور سمجھ میں نہ آنے والی دنیا کے معاملات چلانے والا رب۔ اس رب سے، اس بادشاہ سے، اس مالک سے اگر کبھی کوئی بندۂ ناچیز ملنا چاہے، اس سے بات کرنا چاہے، فریاد کرنا چاہے تو اسے کسی سیکرٹری سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے کسی کمرہ انتظار میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ اسے کسی فون لائن پر ہولڈ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا فون انگیج اور موبائل کبھی بند نہیں ہوتا۔

انسان جب جب رب کو پکارتا ہے تو وہ سنتا اور بلا تاخیر جواب دیتا ہے۔ مگر انسان امتحان میں ہے۔ اس لیے وہ جو کرتا ہے، غیر محسوس طریقے پر کرتا ہے۔ تاکہ لوگ بن دیکھے اس کی عظمت کو مانیں اور اس کی جنت کے حقدار بنیں۔

مگر آہ! یہ بدنصیب انسان، خدا کے بجائے انسانوں کی عظمت میں جیتا ہے۔ خالق کے بجائے مخلوق کا در کھٹکھٹاتا ہے۔ رب کے بجائے بندوں پر بھروسہ کرتا ہے۔ اصل ''صاحب'' کے بجائے عارضی اور فانی صاحبوں کے پیچھے دوڑتا ہے۔

مگر سچ یہ ہے کہ یہاں سارا اختیار اور سارا اقتدار صرف اور صرف ایک ہی ''صاحب'' کے لیے ہے۔ اسی کی شان سب سے اونچی اور اسی کی ذات سب سے بلند ہے۔ جس خوش نصیب نے اس بات کو دریافت کر لیا، اس کی نظر میں خدا کے سوا کوئی بچ نہیں سکتا۔ اس کا سر خدا کے سوا کسی کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ اس کی ہر چاہت اور ساری حمد رب العالمین کے لیے خاص ہو جاتی ہے۔

آج اگر لوگوں نے خدا کو نظر انداز کر دیا ہے تو یہ ان کی بدنصیبی ہے۔ لوگوں کو بہرحال خدا کے سامنے جھکنا ہے۔ آج عقل کی آنکھ سے پہچان کر نہیں جھکے تو کل سر کی آنکھوں سے دیکھ کر جھکنا پڑے گا۔ مگر اس روز کا جھکنا سوائے ندامت اور خسارے کے کسی اور چیز میں اضافہ نہیں کرے گا۔

انسان کو خدا کے سامنے ڈھیر ہونا ہی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ جو آج ہی خدا کی عظمت کے سامنے ڈھیر ہو گئے۔ بدنصیب ہیں وہ جو کل خدا کی عظمت کے سامنے ڈھیر ہوں گے۔

جلد بازی

میں سگنل کے قریب پہنچا تو سرخ بتی روشن ہوگئی۔ میں نے گھڑی دیکھی اور وقت کا شمار کرنے لگا۔ پینتالیس سیکنڈ بعد سگنل کھلا اور میں آگے بڑھ گیا۔ میں نے حساب لگایا کہ وہ گاڑی والا جو میرے ساتھ تھا اور سرخ اشارے کے باجودر کے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا وہ اپنی منزل تک کتنا جلدی پہنچا ہوگا۔ اگر راستے میں چار سگنل بند ملیں تو پینتالیس سیکنڈ فی سگنل کے حساب سے کل تین منٹ کی تاخیر اسے پیش آئی ہوگی۔ پھر میں نے سوچا کہ کیا ہماری قوم وقت کی اتنی پابند ہے کہ سیکنڈ اور منٹ کے حساب سے اپنی ملاقاتوں اور دفتری اوقات کی پابندی کرتی ہے؟

اس سوال کا جواب ہر شخص جانتا ہے۔ پھر کیا سبب ہے کہ اپنی اور دوسروں کی جان خطرے میں ڈال کر سگنل توڑ دینا ہمارے معمولات میں شامل ہے۔ بے اختیار میرے ذہن میں قرآن پاک کی وہ آیت گونجی ''خلق الانسان من عجل''۔ انسانی مشین کو بنانے والے نے بڑے باکمال انداز میں مشین کا مسئلہ بیان کردیا۔ انسان طبعاً جلد باز واقع ہوا ہے۔ جلد بازی کے اس رویے کو اچھی تربیت سے قابو میں نہ کیا جائے تو یہ انسان کے اوپر مسلط ہوجاتا ہے۔ ہماری قوم میں تربیت کے تمام ادارے کم وبیش تباہ ہوچکے ہیں، اس لیے جلد بازی جیسی منفی عادت کو ایک حد میں رکھنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آئے دن سڑکوں پر موت کا رقص ہوتا رہتا ہے۔ سگنل توڑنے کے علاوہ، حد رفتار سے زیادہ تیز گاڑی چلانا، آپس میں ریس لگانا، غلط اوورٹیک کرنا، یہ اسی طبیعت انسانی کے وہ مظاہر ہیں جن کو ہر روز ہم اپنی سڑکوں پر دیکھتے ہیں اور جس کے نتیجے میں ہر روز ان گنت بوڑھے جوان، چھوٹے بڑے، مرد وعورت، معمولی سی جلد بازی کی وجہ سے موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

ہم میں سے ہر شخص کی یہ مذہبی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اگر اپنی شخصیت کو بہتر بنانا چاہتا ہے تو اپنی طبیعت میں موجود جلد بازی کے عنصر پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ جلد بازی کا رویہ صرف سڑکوں ہی پر نہیں بلکہ زندگی کے عام معمولات میں بھی ہمیں بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ اسی لیے بڑوں میں یہ محاورہ مشہور تھا کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ شیطان بلاشبہ انسان کا دشمن ہے۔ وہ ہمیں جلدی میں مبتلا کرکے ہماری دنیا اور آخرت دونوں کو بدترین نقصان پہنچاتا ہے۔

گالی کا جواب

ہمارے ادارے سے کچھ عرصہ قبل ایک بزرگ متعارف ہوئے تھے۔پچھلے دنوں وہ میرے دفتر تشریف لائے۔گفتگو کے دوران انہوں نے مجھے بتایا کہ ہمارے ادارے سے متعلق ہونے کے بعد ان میں ایک بڑی تبدیلی آئی ہے۔وہ یہ کہ پہلے گاڑی چلاتے ہوئے جب کوئی شخص غلط حرکت کرتا ہوا نظر آتا تھا تو بے اختیار ان کے منہ سے گالی نکلتی تھی۔مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔اب وہ اس طرح کا کوئی مسئلہ پیش آنے پر یہ خیال کرتے ہیں کہ جو کچھ ہورہا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہے۔اس لیے وہ خاموشی سے صبر کرتے ہیں۔

اس دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسانوں کو انسانوں کے ذریعے سے تلخ تجربات پیش آتے ہیں۔لوگ انہیں انسانوں کی طرف سے خیال کرکے انتہائی منفی ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اس کی ایک مثال مذکورہ بزرگ کا دوسرے کے لیے سخت الفاظ کا استعمال ہے۔ظاہر ہے کہ اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے کے بعد دوسرے آدمی سے آپ کسی اچھے رویے کی توقع نہیں کرسکتے۔گالی کا جواب گالی ہی ہوا کرتا ہے۔

تاہم جب کوئی انسان اس طرح کے واقعات کو خدا کی آزمائش تصور کرکے صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے بہترین اجر لکھ دیا جاتا ہے۔خدا کے فرشتے زمین پر اتر کر اس کے قلب پر سکینت نازل کرتے ہیں۔وہ پریشانیوں اور ذہنی دباؤ سے محفوظ رہتا ہے۔ساتھ ہی وہ دوسروں کو اپنے شر سے بچالیتا ہے۔اس کے نتیجے میں مجموعی طور پر معاشرے میں خیر بڑھتا ہے اور شر کم ہوتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں لوگوں کی تربیت اس طرح ہورہی ہے کہ وہ فوری طور پر اشتعال میں آجاتے ہیں۔وہ صبر کی اعلیٰ ترین انسانی صفت سے محروم ہوچکے ہیں۔جس معاشرے سے یہ صفت ختم ہوجائے وہاں تھوڑے عرصے میں جان، مال اور آبرو کا تحفظ ختم ہوجاتا ہے۔

صبر کی نفسیات کا فروغ اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔اس نفسیات کے حصول کا ذریعہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم منفی واقعات کو خدا کی آزمائش سمجھیں۔

گرچہ میں راکھ ہوں، گرچہ میں خاک ہوں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا دوست قرار دیا ہے۔ ان کی جتنی تعریف قرآن پاک میں کی گئی ہے، اتنی تعریف کم ہی کسی نبی کی گئی ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام نے درود کے الفاظ سیکھنا چاہے تو آپ نے انہیں درود ابراہیمی سکھایا، جس میں حضورؐ پر اسی طرح رحمت اور برکت کی دعا ہے جس طرح حضرت ابراہیم پر رحمت اور برکت کی گئی۔

قرآن ایک مقام پر ان کے متعلق یہ کہتا ہے کہ وہ بڑے نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔ یہ وہ موقع تھا جب آپ نے حضرت لوطؑ کی قوم کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کی تھی۔ یہ بد بخت قوم بدترین فحاشی میں مبتلا تھی اور اپنی بدبختی اور جرائم کی بنا پر رحم و کرم کے ہر دروازے کو بند کر چکی تھی۔ فرشتے اس قوم کو سزا دینے سے پہلے حضرت ابراہیم کے پاس آئے اور انہیں حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب کی خوش خبری دی۔ پھر قوم لوط پر عذاب کے فیصلے کا ذکر کیا۔ اس پر حضرت ابراہیم نے اس قوم کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست انتہائی موثر اسلوب میں بڑے اصرار سے کی۔

بائبل میں اس اصرار کی تفصیل آئی ہے۔ بائبل کے مطابق اس موقع پر آپ نے عرض کیا کہ اے رب اگر قوم میں پچاس نیک لوگ ہیں تو ان کی وجہ سے قوم کو معاف کر دے، جواب ملتا ہے کہ اس قوم میں پچاس نیکوکار بھی نہیں ہیں، پھر وہ کہتے ہیں کہ اگر پینتالیس راستباز ہوں تو قوم کو معاف کر دے، مگر یہی جواب ملتا کہ پینتالیس بھی نہیں۔ پھر وہ گنتی کم کرتے ہوئے دس آدمیوں تک آ جاتے ہیں مگر ہر دفعہ ایک ہی جواب ملتا ہے کہ اتنے لوگ بھی نہیں۔ اس گفتگو میں جو چیز سب سے زیادہ پر اثر ہے وہ سیدنا ابراہیم کا انداز گفتگو ہے جو وہ پروردگار عالم کی بارگاہ میں اختیار کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ بائبل میں یوں نقل ہوئے ہیں:

''دیکھیے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرات کی، اگرچہ میں راکھ اور خاک ہوں۔''، (پیدائش 20:18)

حضرت ابراہیم کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گفتگو کرنے کا ادب کیا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کے خالق اور مالک ہیں۔ ان کی عظمت کا عالم یہ ہے کہ ان کی بادشاہی میں یہ ختم

نہ ہونے والی کائنات ایک ذرہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ان کی مرضی اور علم کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں گر سکتا۔ان کی ہیبت سے بڑے بڑے فرشتے لرزتے اور کانپتے ہیں۔وہ اگر اشارہ کردیں تو ساری مخلوقات لمحہ بھر میں ختم ہو جائیں۔ان کا کرم نہ ہو تو انسانیت بغیر ہوا اور پانی کے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے۔آسمان و زمین کی ہر شے ہر لمحہ ان کی حمد، تسبیح اور تعریف کرتی اور ان کی عظمت کے ترانے پڑھتی رہتی ہے۔آج ہر چند کہ اس نے اپنے جلال پر غیب کا پردہ ڈال رکھا ہے، مگر روز قیامت جب وہ یہ نقاب اتارے گا تو اس کے جلال کی تاب نہ لا کر یہ پہاڑ، سمندر، آسمان سب تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

ایسی ہستی کے حضور گفتگو کا ادب وہی ہونا چاہیے جو حضرت ابراہیم نے اختیار کیا تھا۔یہی سارے انبیا کا طریقہ ہے۔اسی کا اظہار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دعاؤں سے ہوتا ہے جو مختلف کتب احادیث میں ملتی ہیں۔تاہم حضرت ابراہیم کے واقعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خدا اگرچہ بہت بلند، عظیم، صاحب قدرت اور صاحب جلال ہے، مگر اس کے ساتھ وہ بے حد محبت کرنے والا، رحمدل اور کریم بھی ہے۔وہ جس طرح مجرموں کو سزا دینے میں سخت ہے اسی طرح وہ اپنے محبت کرنے والوں اور فرمانبرداروں پر بیحد مہربان ہے۔

اس محبت اور مہربانی کا اندازہ اس تبصرے سے ہوتا ہے جو قرآن نے قوم لوط پر عذاب کے وقت حضرت ابراہیم کی اوپر بیان کردہ گفتگو کے بارے میں کیا۔ عدل کے تقاضوں کے مطابق قوم لوط کو معاف نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے ان کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا، مگر اللہ تعالیٰ کو حضرت ابراہیم کا رویہ ایسا پسند آیا کہ حضرت ابراہیم کے اصرار کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے کہ:

”ابراہیم ہم سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑا کرنے لگا۔وہ بڑا نرم دل اور رجوع کرنے والا تھا“۔

اللہ سے جھگڑا کرنے کے پیرایۂ بیان سے جو محبت ٹپکتی ہے اس کا اندازہ کوئی صاحبِ دل ہی کر سکتا ہے۔مگر اللہ تعالیٰ کا یہ تبصرہ بتاتا ہے کہ جو شخص خود کو رب کے لیے مٹا دے، خدا اسے عظمت کی آخری بلندیوں تک اٹھا کر لے جاتا ہے۔وہ خدا کے مقابلے میں خود کو راکھ کہے اور خدا اسے اس مقام پر پہنچا دے جہاں وہ خدا کا دوست اور اس سے ’جھگڑا‘ کرنے والا بن جاتا ہے۔وہ خود کو خاک کہے اور خدا اسے وہ رحمتیں اور برکتیں عطا کرے جن کی خواہش خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی کرتے ہیں۔

قیادت کا مسئلہ

ہمارے ہاں آئے دن اخبارات میں ایسے حادثات کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں، جن میں کوئی تیز رفتار ویگن یا بس کسی موٹر سائیکل سوار کو کچل دیتی ہے۔ان حادثات کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب موٹر سائیکل سوار کے ہمراہ اس کے بچے بھی ہوں۔ایسے میں یہ معصوم بچے بھی حادثات کا شکار ہوجاتے ہیں۔ان حادثات کا سبب ایک طرف تو پبلک ٹرانسپورٹ چلانے والے ڈرائیوروں کا غیر تربیت یافتہ ہونا ہے تو دوسری طرف موٹر سائیکل سواروں کا کئی کئی بچوں کو اسکوٹر پر بٹھانا ہوتا ہے۔تاہم ہمارے ہاں کے معاشی بحران کے اس دور میں ایک مڈل کلاس آدمی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنے کئی بچوں اور بیوی کو اسکوٹر پر بٹھا کر نکلے۔کیونکہ رکشہ ٹیکسیاں بہت مہنگی اور بس، ویگن کا سفر انتہائی غیر معیاری ہوتا ہے۔

دنیا کے ہر مہذب ملک میں پبلک ٹرانسپورٹ کی اعلیٰ ترین سہولتیں فراہم کرنا حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے۔امریکہ یورپ اور فار ایسٹ کے مما لک میں یہ سہولتیں اس پیمانے کی ہیں کہ لوگ اپنی گاڑیاں چھوڑ کر ان میں سفر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔مگر ہمارے ہاں دیگر بنیادی سہولیات کی طرح یہ سہولت فراہم کرنا بھی حکومت کی ترجیحات میں دور دور تک شامل نہیں۔اس کا سبب کوئی اور نہیں خود عوام ہیں جو بدترین اور کرپٹ قیادت کو محض ان کے جذباتی نعروں کی بنیاد پر اپنے اوپر سوار رکھتے ہیں۔اگر عوام یہ طے کرلیں کہ وہ نعروں اور جذباتی باتوں کے فریب میں نہیں آئیں گے اور ہر اس قیادت کو رد کردیں گے جوان کے بنیادی حقوق پورا کرنے کی جدوجہد نہ کرے تو بتدریج معاملات میں بہتری آجائے گی۔

معاملات کی خرابی کی زیادہ بڑی خرابی اس فکری قیادت کی ہے جس نے ہمیشہ عوام کو غیر متعلقہ باتوں میں الجھا کر رکھا ہے۔یہ لوگ بین الاقوامی تنازعات، ملی مسائل، غیر مسلموں کی سازشوں اور غیر اہم مذہبی معاملات کو اس طرح بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں کہ اصل مسائل نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔یہ لوگ کشمیر، فلسطین، چیچنیا، افغانستان اور عراق کے معاملات پر عوام کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں، حالانکہ اتنے لوگ ان تمام مما لک میں غیر مسلموں کے ہاتھوں سے نہیں مرتے جتنے لوگ

پاکستان میں روزانہ ٹریفک کے حادثات کا شکار ہوکر مرجاتے ہیں۔ یہ لوگ غیر مسلم طاقتوں کی مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کا رونا روتے ہیں حالانکہ دنیا کا مشکل ترین کام پاکستانی عدالتوں میں انصاف کا حصول ہے۔ یہ لوگ مسلمان ممالک پر امریکہ اور اسرائیل، بھارت اور دیگر ممالک کے قبضے کو ہمارا سب سے بڑا مسئلہ بتاتے ہیں حالانکہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ملک کے وسائل چند فیصد کرپٹ اور مفاد پرست طبقات کے قبضے میں جاچکے ہیں۔

جس شخص کے بچے بھوک سے مر رہے ہوں اور وہ ان کی دال روٹی کی فکر کرنے کے بجائے دوسروں کے جھگڑے نمٹاتا پھرے، اسے کون اچھا کہے گا۔ جس شخص کی بیوی جاں کنی میں مبتلا ہو اور وہ اس کی فکر کرنے کے بجائے معاشرتی مسائل کی اصلاح کے لیے اٹھے، اسے کون درست کہے گا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اجتماعی طور پر ہم نے یہی روش اختیار کر رکھی ہے۔

اگر ہمیں اپنی تقدیر بدلنی ہے تو ہمیں ہر حال میں اپنی قیادت بدلنی ہوگی۔ سیاسی لوگ اگر کرپٹ ہیں تو وہ ہماری لیڈرشپ کے مستحق نہیں ہونے چاہییں۔ جو لوگ ہمارے بنیادی مسائل پر بات نہیں کرتے، انہیں ہماری سوسائٹی میں فکری قیادت کے مقام سے ہٹادینا ضروری ہو چکا ہے۔

ہمیں ہر حال میں یہ طے کرنا ہوگا کہ ہمارا اصل مسئلہ کیا ہے؟ ہمارا اصل مسئلہ وہ ہے جو ہمیں اپنے گھر میں درپیش ہو چکا ہے۔ یہ مسئلہ بنیادی حقوق اور جمہوریت کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ مفت تعلیم اور علاج کی سہولت کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ روزگار کی فراہمی اور امن وامان کی بحالی کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ پینے کے صاف پانی اور ملاوٹ سے پاک غذا کی دستیابی کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ ٹریفک کی بہترین سہولیات اور آلودگی سے پاک ماحول کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ معاشی ناہمواری اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ انصاف کی فراہمی اور عدالتی نظام میں بہتری کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ غربت اور جہالت سے چھٹکارے کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ کرپشن کے خاتمے اور بددیانت لیڈرشپ سے نجات کا مسئلہ ہے۔

یہ ہیں ہمارے اصل مسائل۔ جو ان پر بات کرے گا، ان کے حل کی کوشش کرے گا، اسی کو ہمارا لیڈر ہونا چاہیے۔ جو ان پر بات نہیں کرے گا وہ قوم کا لیڈر نہیں ہے، بلکہ قوم کا مجرم ہے۔ اور جو قوم ایسے مجرموں کو لیڈر بناتی ہے وہ کبھی دنیا میں کوئی باعزت مقام حاصل نہیں کرسکتی۔

قیامت کا اے ٹی ایم

''کیا یہاں سے پیسے ملتے ہیں؟''، یہ آواز سن کر میں ٹھٹکا اور سر گھما کر آواز کی سمت دیکھا۔ یہ ایک چھوٹی سی بچی کی آواز تھی جس کے چہرے اور لباس پر اس کی غربت کی خاموش داستان تحریر تھی۔ اس بچی نے مجھے ATM مشین بوتھ سے پیسے نکالتے ہوئے دیکھا اور اس کے معصوم ذہن میں وہ سوال پیدا ہو گیا جو ابھی اس نے مجھ سے کیا تھا۔

میں نے کہا کہ ہاں بیٹا یہاں سے پیسے ملتے ہیں۔ اس نے فوراً اگلا سوال بڑی معصومیت کے ساتھ داغ دیا، ''کیا سب کو یہاں سے پیسے مل سکتے ہیں؟''۔ میں نے جواب دیا کہ نہیں، جس کے پیسے بینک میں ہوتے ہیں، صرف اسی کو ملتے ہیں۔ اس مختصر سے مکالمے کے بعد میں آگے بڑھ گیا۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ طارق روڈ کے اس بازار میں جہاں فیشن اور ضرورت کی ہر چیز خریدنے لوگ آتے ہیں، اس معصوم بچی کی قسمت میں سوائے حسرت کے، کچھ نہیں۔

اس دنیا میں پیسہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں ہر چیز پیسے سے ملتی ہے۔ یہ پیسہ انسان کو بڑی مشقت اٹھا کر کمانا پڑتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب قیامت کے بعد اصل زندگی شروع ہو گی تو وہاں کی ہر نعمت نیکی کی کرنسی سے مل سکے گی۔ مگر یہ کرنسی ہر کسی کو دستیاب نہیں ہو گی بلکہ صرف انہی لوگوں کو ملے گی جنھوں اس دنیا میں اعمال صالح کرنے کی مشقت جھیلی ہو گی۔ ان کی نیکیاں اللہ تعالیٰ اپنے 'بینک' میں جمع کر لیتے ہیں اور قیامت کے دن وہ جب چاہیں گے انہیں یہ نیکیاں لوٹا دی جائیں گے۔

مگر قیامت کے دن یہ صالحین جب خدائی 'بینک' سے نیکیوں کی کرنسی لے کر نکل رہے ہوں گے تو کچھ لوگ اسی طرح ان سے سوالات کریں گے اور انہیں وہی جواب ملے گا اور اوپر بیان ہوا کہ جس کے پیسے ہوتے ہیں اسی کو ملتے ہیں۔

خوش نصیب ہے وہ جس کے حصے میں اس روز 'پیسے' آئیں گے۔ بدنصیب ہے وہ جس کے حصے میں اس روز حسرت آئے گی۔

ریورس گیئر

یہ روڈ One Way تھا اور سڑک پر سناٹا تھا اس لیے میں اطمینان سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک میں نے اس گاڑی کو دیکھا جو ریورس میں بہت تیزی سے میری طرف آ رہی تھی۔ میں نے بریک لگا کر اپنی رفتار کم کی اور ایک کونے میں ہو گیا اور وہ صاحب One Way پر اپنی گاڑی ریورس کرتے ہوئے تیزی سے میرے پاس سے گزر گئے۔ ان کے گزرنے کے بعد میں نے توجہ کے ساتھ آگے دیکھا تو سامنے کچھ دور سڑک پر لوگوں کی بھیڑ نظر آئی۔ اس بھیڑ کے درمیان وسط سڑک پر ایک پولیس کی گاڑی بھی کھڑی ہوئی تھی۔

میں نے رفتار بڑھائی اور اس مجمع کے قریب پہنچ گیا اور آہستہ آہستہ مجمع کے بیچ سے گزر گیا۔ اس دوران میں جو کچھ میں نے دیکھا اس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ غالباً کچھ ڈاکو تھے جنہیں پکڑ پر پولیس والوں نے اپنی گاڑی میں بٹھایا تھا اور اب وہ لوگ وہاں سے روانہ ہونے والے تھے۔ یہ مجمع اسی تماشے کو دیکھنے کھڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر قبل میرے سامنے سے الٹے پاؤں دوڑنے کی تصویر بنے جو صاحب اپنی نئی ٹویوٹا کرولا میں گزر رہے تھے، وہ اس مجمعے اور پولیس کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے تھے اور کسی ضرر کے اندیشے سے بچنے کے لیے ریورس میں گاڑی چلا کر یہاں سے بھاگے تھے۔

میں نے سوچا کہ دنیا کے اندیشے نے انسان کا یہ حال کر دیا ہے تو جس شخص کو آخرت کا اندیشہ لاحق ہو جائے اس کا کیا حال ہوگا۔ لیکن آخرت کے اندیشے کو عقل کی آنکھ سے پہچاننا اور ایمان کی آنکھ سے ماننا پڑتا ہے۔ جبکہ آج لوگوں نے عقل کی آنکھ کو صرف دنیا کے نفع نقصان کو دیکھنے کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اس لیے ان کی ایمان کی بینائی اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ انہیں جنت کی نعمتیں نظر آتی ہیں نہ جہنم کی آگ۔ مگر ایک حقیقی مومن خدا کی ہر نافرمانی کی جگہ سے اسی طرح ریورس گیئر لگاتا ہے، جس طرح اس نئی ٹویوٹا کرولا والے نے لگایا تھا۔

اصول پسندی

کراچی کی شہری انتظامیہ نے پچھلے دنوں پلاسٹک بیگ کے استعمال پر پابندی لگادی۔اس پابندی کے بعد شہریوں کی قانون کی پاسداری کا عجیب نمونہ دیکھا۔حیرت انگیز طور پر تمام تاجروں نے اپنی دکانوں سے پلاسٹک کی تھیلیاں ہٹادیں اور ہر خریدار کو یہی جواب ملنے لگا کہ تھیلیوں پر پابندی لگادی گئی ہے اس لیے آپ کو سبزی، پھل، دودھ وغیرہ جو کچھ بھی چاہیے ہاتھ میں لے کر جائیں۔سب سے زیادہ قانون پسندی کا ثبوت دودھ والوں نے دیا جنھوں نے اپنی دکانوں پر باقاعدہ حکومت کا جاری کردہ حکمنامہ لگا رکھا تھا اور ہر خریدار کو یہ بتارہے تھے کہ حکومت نے تھیلی پر پابندی لگا رکھی ہے اس لیے ہم بھی نہیں دے رہے۔

پلاسٹک بیگ کیا مسائل پیدا کررہے تھے؟ ان پر پابندی کتنی درست ہے؟ مسئلے کا حل کیا ہے؟ ان سوالات سے قطع نظر اس واقعے میں ہماری قوم کی ایک خاص نفسیات کا ظہور ہوا ہے۔وہ یہ کہ ان کی تمام تر قانون پسندی اور اصول پسندی اپنے مفادات کی تابع ہوتی ہے۔یہی وہ تاجر ہیں جن کی ایک بہت بڑی تعداد حکومت کی مقرر کردہ قیمتوں سے کہیں زیادہ مہنگی قیمت پر اشیا فروخت کرتی ہے۔یہ جب چاہتے ہیں اپنے منافع کا خود تعین کرکے قیمتیں بڑھادیتے ہیں۔جس چیز کے دام لیتے ہیں، کم ہی وہ چیز خالص ملتی ہے۔رمضان میں پھلوں کی قیمتوں کو آگ لگ جاتی ہے اور محرم اور عید کے مواقع پر زیادہ طلب کی بنا پر دودھ کی شکل میں پانی ملتا ہے۔

ایسے مواقعوں پر ان لوگوں کو کبھی قانون کی حکمرانی اور حکومت کا ضابطہ یاد نہیں آتا۔یہ صرف اس وقت یاد آتا ہے جب تھیلیوں کے پیسے بچ رہے ہوں۔ایسی قوم کو اور ایسے لوگوں کبھی اپنے حکمرانوں کی شکایت نہیں کرنی چاہیے۔یہ حکمران ان کے اعمال کا نتیجہ ہیں جو ان پر مسلط کیے گئے ہیں۔جب تک لوگ نہیں بدلیں گے ان کے حکمران بھی نہیں بدلیں گے۔

لولاك......

مجھ سے بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کی بڑائی پر تو بہت کچھ لکھتا ہوں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں مضامین کیوں نہیں لکھتا۔ حتیٰ کہ ربیع الاول کے مہینے میں بھی نہیں۔ میں اس کے سوال میں دو باتیں کہتا ہوں۔ ایک یہ کہ معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اعلیٰ ترین سطح پر مدحت رسول کا کام کر رہے ہیں۔ ان کے کام ہی کا اثر ہے کہ اس معاشرے میں عشق رسول کی گرمی کمزور ترین ایمان کے مسلمان کے لہو میں بھی خون بن کر دوڑتی ہے۔ بڑے سے بڑا سیکولر اور غیر مذہبی اور عقلی آدمی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کے معاملے میں بے پناہ جذباتی ہوتا ہے۔ ایسے میں کچھ لکھ کر میں کسی کمی کو پورا نہیں کروں گا۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ خود جو کام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر کرتے رہے، جو دین کا بنیادی مطالبہ ہے، اس کے حوالے سے ایک عمومی غفلت پائی جاتی ہے۔ یعنی اللہ کا ذکر، اس کا شوق، اس کی تسبیح، اس کی تعریف، اس کی حمد اور اس کے کبر کا بیان۔ اس معاملے میں ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم اپنی ہر تقریر کے آغاز پر بلا سوچے سمجھے نحمده کہتے ہیں اور اختتام پر الحمد الله رب العالمين کہ دیتے ہیں۔ ہمارے شعرا اور ادیب، مقرر اور خطیب، عالم و واعظ سب کا معاملہ کم و بیش یہی ہے۔ لیکن کبھی خدا کے نام سے ہماری زبان میں مٹھاس نہیں گھلتی، کبھی اس کی یاد میں دل نہیں تڑپتا، کبھی اس کی محبت میں آنکھوں سے آنسو نہیں ٹپکتے، کبھی اس کی ملاقات کا شوق میں موت کی تمنا پیدا نہیں ہوتی۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا رواں رواں، زندگی کے ایک ایک لمحے میں، ہر ایک لمحے میں اس کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اس بات کو سب سے بڑھ کر اگر کسی نے جانا ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے۔ آپ کی پوری زندگی خدا کے شوق اور اس کی یاد کے سوا کچھ نہیں تھی۔ آپ کی حیات الذين امنو اشد حبا لله

(اہل ایمان تو سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں، البقرہ 165:2)

کا عملی نمونہ تھی۔ نہ صرف یہ آپ کی عملی زندگی تھی بلکہ یہی آپ کی دعوت بھی تھی۔ میں نے اگر یہ راستہ اختیار کیا ہے تو صرف اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں اختیار کیا ہے۔

میں جب اس مضمون کے بارے میں سوچ رہا تھا تو میں عین دوپہر کے وقت سڑک پر موجود تھا۔ سورج سر پر تھا اور اس کی تیز روشنی نے ہر شے کو منور کر رکھا تھا۔ مگر روشنی کے اس سیلاب کے باوجود جاتی سردی اور آتی بہار کے اس سورج میں کوئی تپش نہ تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری شخصیت کی اس سے اچھی کوئی مثال اس دنیا میں نہیں مل سکتی۔ آپ کی ذات موسم بہار کا وہ سورج ہے جس میں بہت چمک ہے، مگر دھوپ نہیں۔ آپ ہدایت کی وہ روشنی ہیں جس کے بعد کوئی اندھیرا باقی نہیں رہ سکتا مگر آپ کی سیرت میں تپش کا کوئی ایسا عنصر نہیں جو ہم گنہ گاروں کے وجود کو جھلسا دے۔ مگر کتنی عجیب بات ہے کہ لوگ آپ کی ذات اور سیرت سے وہ سبق حاصل نہیں کرتے جس کا پیغام لے کر آپ آئے تھے بلکہ خود کو اپنی خواہشات کے اندھیروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔

میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں داخل ہوا۔ ابھی جماعت میں کچھ دیر باقی تھی۔ کچھ لوگ مسجد کی عمارت کے اندر نوافل پڑھ رہے تھے اور کچھ لوگ مسجد کے صحن میں۔ میں نے گھڑی دیکھی اور پھر ایک نظر موسم بہار کے ٹھنڈے سورج کو دیکھ کر کہا۔

لولاك يا رسول الله مادريت الكتاب ولاالايمان

پھر میں سایہ میں کھڑے ہونے کے بجائے صحن میں پھیلی ہوئی سورج کی ٹھنڈی روشنی میں کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے لگا۔

ہزار ارب ڈالر

معروف امریکی میگزین فارچون (Fortune) نے مارچ 2007 کی اپنی اشاعت میں ابو ظہبی کو دنیا کا امیر ترین ملک قرار دیا ہے۔ ابوظہبی متحدہ عرب امارات کی سات ریاستوں میں سے سب سے بڑی ریاست اور ملک کا دارالحکومت کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ اس کی آبادی تقریباً دس لاکھ ہے جس میں سے صرف ۲ لاکھ مقامی ہیں جبکہ باقی لوگ تیل کی دولت نکلنے کے بعد روزگار کی تلاش میں یہاں آ بسے ہیں۔ اس جریدے کے مطابق تیل میں تیل کے کل ذخیرے کا دس فیصد حصہ متحدہ عرب امارات میں پایا جاتا ہے اور اس میں سے 94 فیصد ابوظہبی میں ہے۔ تیل سے جو دولت حاصل ہو رہی ہے اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابوظہبی انوسٹمنٹ اتھارٹی نے ایک ہزار ارب ڈالر کی خطیر رقم دنیا بھر میں انویسٹ کر رکھی ہے۔

یہ رقم یقیناً بہت زیادہ ہے۔ اس کو انویسٹ کرنے والے اس سے مزید منافع کمانا چاہ رہے ہیں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پیسہ سے مزید پیسہ کما کر کیا کیا جائے گا۔ کیونکہ اسی جریدے کے مطابق متحدہ عرب عمارات کی کل دولت اتنی ہے کہ ہر شہری کے حصے میں 17 ملین ڈالر کی رقم آتی ہے۔ یعنی پاکستانی حساب سے ایک ارب روپے سے زائد رقم ہر آدمی کے حصے میں آتی ہے۔ جب اتنی دولت پہلے سے موجود ہے جو زندگی کی ہر بنیادی اور ثانوی ضروریات کے لیے کافی ہے تو مزید دولت سے سوائے ایک احساس دولت کے سوا کیا حاصل ہو گا؟

آج سے کچھ عرصہ قبل تک یہ لوگ صحراؤں میں گلہ بانی کرتے ، اونٹ چراتے اور کھجوریں اگاتے تھے۔ ان کے امیر ترین لوگوں کی بساط مٹی کے گھروں تک تھی۔ مگر پھر اللہ تعالیٰ نے اس خطے کے باشندوں پر دولت کے دروازے کھول دیے۔ بدوؤں کے قدموں سے سیال سونا بہہ نکلا۔ دولت کے انبار لگ گئے۔ ننگے پاؤں بکریاں چرانے والے اونچی اونچی عمارتیں بنانے لگے۔ دنیا کا ہر سامان تعیش اس خطے میں ملنے لگا اور عیش و عشرت کی ہر جگہ پر عرب نظر آنے لگے۔ اس دولت کے اثرات عربوں کے ساتھ دیگر مسلم ممالک پر بھی پڑے۔ مثلاً ستر کی دہائی سے لے کر آج تک لاکھوں پاکستانیوں نے خلیجی ممالک میں روزگار حاصل کیا اور بلا مبالغہ کھربوں روپے پاکستان کما کر

بھیجے۔جس کے نتیجے میں پاکستان میں بھی دولت کی ریل پیل ہوگئی ۔ ساٹھ کی دہائی میں 22 خاندانوں والا پاکستان اب وہ جگہ ہے جہاں ہزاروں بلکہ لاکھوں ارب پتی پائے جاتے ہیں۔

تیل سے حاصل ہونے والی یہ دولت مسلمانوں کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔اس کو دینے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں میں لاکھوں ارب پتی پیدا کیے جائیں اور اپنی دولت سے دادعیش دیں۔ بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ قیامت کے آنے سے قبل انسانیت کا پیغام دنیا بھر میں پھیلنے لگے۔ یہ کام اب کسی نبی نے نہیں کرنا بلکہ امت مسلمہ کے ذریعے ہی سے سرانجام پانا تھا۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے سامراجی طاقتوں کے شکنجے سے تمام مسلم دنیا کو آزاد کرایا اور پھر مسلمانوں کے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگا دیے تاکہ وہ دور جدید میں دوسری اقوام کا مقابلہ کرسکیں۔

مسلمان اگر اللہ تعالیٰ کے اس منصوبے کو سمجھتے تو وہ ہزار ارب ڈالر مغربی ممالک میں انویسٹ کرنے کے بجائے اسے مسلمانوں کی جہالت اور غربت دور کرنے پر خرچ کرتے۔ یہ ہزار ارب ڈالر کی رقم اتنی زیادہ ہے کہ پاکستان جیسے 50 ملکوں کا سالانہ بجٹ اس میں بن سکتا ہے۔اس رقم سے جب لوگوں کو تعلیم ملتی، بنیادی ضروریاتِ زندگی حاصل ہوتیں، روزگار ملتا تو ان میں اتنا شعور بھی پیدا ہوجاتا کہ دین کے حوالے سے دنیا میں ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں۔ جہالت ختم ہونے سے تعصّبات ختم ہوتے۔قرآن کا اصل پیغام عام ہوتا۔تحمل اور برداشت پیدا ہوجاتی۔

آج بھی اس معاملے میں دیر نہیں ہوئی ہے۔عرب نہ سہی اگر پاکستان کے امیر افراد کی ایک قابل ذکر تعداد یہ طے کرنے کے اسے اپنی اضافی دولت خدا کے دین اور امت کی بہبود کے لیے وقف کرنی ہے تو صرف ایک نسل میں سب کچھ تبدیل ہوجائے گا۔لیکن لوگ اگر اپنی دولت سے مزید دولت کے انبار جمع کرنے کی روش پر قائم رہے تو بلاشک وشبہ ایک دفعہ پھر مسلمانوں پر وہی ذلت ورسوائی اور غلامی وبیکسی مسلط ہوجائے گی جس کا وہ پچھلی صدی کے آغاز پر شکار تھے۔

مسلمانوں اور عربوں کے پاس اس آنے والی ذلت سے بچنے کا صرف ایک راستہ ہے۔ وہ یہ کہ ہزار ارب ڈالر کی رقم کو اللہ تعالیٰ کے لیے انویسٹ کردیں۔اس کے نتیجے میں دولت کے ساتھ انہیں دنیا کا اقتدار اور عزت بھی مل جائے گی۔ وگرنہ جو کچھ ہے، جلد ہی وہ اس سے بھی ہاتھ دھولیں گے۔

پولن کا درخت

پولن کا درخت جسے عام طور پر جنگلی شہتوت کا درخت بھی کہتے ہیں، اسلام آباد کی پہچان ہے۔ یہ درخت جنگلات کی صورت میں اس شہر میں جگہ جگہ پھیلا ہوا ہے۔ اس درخت کی بنا پر شہر نہ صرف سرسبز ہو گیا ہے بلکہ گرمیوں میں ماحول کو ٹھنڈا رکھنے کا سبب بھی بنتا ہے۔

پولن (Pollen) دراصل ایک سفوف نما شے ہے جو اس درخت پر پیدا ہوتا ہے۔ ہوا کے ذریعے سے یہ سفوف دوسرے درختوں تک پہنچتا ہے اور ان کی زرخیزی کا سبب بنتا ہے۔ اس عمل کو پولینیشن (Pollination) کہتے ہیں۔ اس درخت سے نکلنے والا یہ پولن انسانوں کے لیے بڑے مسائل پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ یہ سانس کی نالی میں الرجی پیدا کر کے متاثرہ شخص کو نزلہ، زکام اور دیگر امراض میں مبتلا کر دیتا ہے۔ خاص کر دمے کے مریضوں کو اس کی وجہ سے بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے لوگ تو اس قابل ہی نہیں رہتے کہ شہر میں رہ سکیں۔ جب یہ مسئلہ شدت سے سامنے آیا تو اس درخت کو کاٹنے کا فیصلہ کیا گیا اور اب بڑے پیمانے پر اس درخت کو کاٹ کر ہٹایا جا رہا ہے۔

پولن کے درخت کی مثال یہ بتاتی ہے کہ خدا نے اپنی اس دنیا میں قیام وبقا کا کیا قانون بنا رکھا ہے۔ یہ قانون نفع بخشی ہے۔ جب تک کوئی وجود نفع بخش رہتا ہے وہ فطرت کے قانون کے تحت دنیا میں اپنا وجود باقی رکھتا ہے۔ جب اس کا نفع نقصان میں بدل جاتا ہے تو قدرت کے قانون کے تحت اس کا وجود مٹ جاتا ہے۔

انسانوں کو بھی اس اصول سے کوئی استثنا حاصل نہیں ہے۔ اس دنیا میں وہی شخص ترقی کرتا اور کامیاب رہتا ہے جو دوسرے لوگوں کے لیے نفع بخش ہو۔ جس کی محنت اور صلاحیت دوسروں کو اس بات کا یقین دلا دے کہ اس کی موجودگی ہمارے لیے مفید ہے۔ اس کے برعکس جو شخص لوگوں کے لیے تکلیف اور نقصان کا باعث بن جائے، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اس کا مزاج، اس کی گفتگو اور اس کا عمل بار بار لوگوں کے لیے مسئلہ پیدا کرے گا اور لوگ اسے اپنے درمیان سے نکال باہر کریں گے۔

نفع بخشی اس دنیا میں ترقی اور کامیابی کا راز ہے۔ جب کوئی شخص ترقی کے میدان میں پیچھے رہ جائے تو اسے دوسروں کو الزام دینے کے بجائے یہ دیکھنا چاہیے کہ کہیں اس کی نفع بخشی کی صلاحیت کم یا ختم تو نہیں ہو گئی۔

دوسرا رخ

صلح حدیبیہ اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ 6 ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ چودہ سو صحابہ عمرہ کی غرض سے روانہ ہوئے۔ مگر قریش نے آپ کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا۔ کافی گفت وشنید کے بعد وہ معاہدہ طے پایا جسے صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے اور جس کی رو سے مسلمانوں کو اگلے سال عمرے کی اجازت مل گئی، لیکن اس سال انہیں واپس لوٹ جانا تھا۔ اس صلح نامہ میں بعض دیگر ایسی شرائط بھی تھیں جن کو مسلمان اپنے لیے باعث عار سمجھ رہے تھے۔

جب مسلمان اس واقعے کو اپنی شکست سمجھ کر مایوسی کے عالم میں لوٹ رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے سورہ فتح کی وہ آیات نازل فرمائیں جن میں اس صلح کو 'کھلی ہوئی فتح' قرار دیا گیا تھا۔ آنے والے وقت میں یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی یہ بات سو فیصد درست تھی۔ اس واقعے کے دو برسوں بعد مسلمان پورے عرب اور صرف دو دہائیوں کے بعد پوری متمدن دنیا کے حکمران بن چکے تھے۔

صلح حدیبیہ کے اس واقعے میں جہاں اور بہت سے اسباق پوشیدہ ہیں وہیں اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ زندگی میں ہر معاملے کو دیکھنے کے دو رخ ہوتے ہیں۔ اسی صلح حدیبیہ کو مسلمانوں نے چند شرائط کی بنا پر اپنی ذلت اور شکست سمجھا تھا۔ لیکن اس واقعے کا ایک دوسرا پہلو یہ تھا کہ قریش جو مسلمانوں کو زندہ رہنے کا حق بھی نہیں دینا چاہتے تھے، انہوں نے پہلی دفعہ مسلمانوں کو عرب میں اپنے برابر کی ایک طاقت قرار دے دیا۔ وہ لوگ جو ابھی تک حرم میں مسلمانوں کے داخلہ کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے، اب خود مسلمانوں کو عمرے کی اجازت دینے پر مجبور ہو گئے۔ قریش نے یہ سب مسلمانوں کی محبت میں نہیں کیا بلکہ یہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے مقابلے میں ان کی شکست کا سب سے بڑا اعتراف تھا۔ مسلمان جذبات کی شدت میں یہ سب نہ دیکھ سکے، مگر

اللہ تعالیٰ کی ہستی جو ہر کمزوری سے بلند ہے، اس نے اسی صورتحال کو ''فتح مبین'' قرار دے دیا۔

زندگی کے ہر مسئلے کا ایک مثبت رخ بھی ہوتا ہے ۔انسان کو ہمیشہ یہی مثبت رخ دیکھنا چاہیے۔حال کی مشقت جھیل کر مستقبل کی تعمیر، صبر کی کلفت جھیل کر جنت کا حصول، لوگوں کی برائیوں کو معاف کر کے رب کی معافی کا استحقاق، چھوٹے فائدوں کا شارٹ کٹ چھوڑ کر بڑی کامیابی کی راہ پر استقامت، یہ اور ان جیسے بہت سے دوسرے رخ ہیں جو فرد اور قوم کے سامنے آتے ہیں، مگر ہم انہیں نہیں دیکھ پاتے۔

کامیاب انسان وہ نہیں جسے زندگی میں مصائب، شکستوں، مایوسیوں اور پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔کامیاب انسان وہ ہے جو ان سب میں چھپا دوسرا پہلو اور دوسرا رخ دیکھ لے۔

افضل اسلام اور کامل ایمان

''سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دفعہ) صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کون سا اسلام افضل ہے؟ فرمایا: (اُس شخص کا اسلام) جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں (یعنی ہر طرح کی تکلیف واذیت سے بچے رہیں)۔''

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک (کامل) مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی (مسلمان) کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے۔''

(بخاری)

نماز اور گناہ

اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ ہماری نماز ہمیں گناہ سے نہیں روکتی۔ حالانکہ قرآن پاک کی سورہ عنکبوت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''بے شک نماز فحش اور منکر کاموں سے روکتی ہے''۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے جسے تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم نے گناہوں کی تین نمایاں اقسام بیان کی ہیں۔

۱) فحاشی، عریانی اور جنسی بے راہروی پر مبنی گناہ

۲) حق تلفی کی نوعیت کے وہ گناہ جنھیں سب انسان برا سمجھتے ہیں

۳) خدا کی سرکشی اور بغاوت کی نوعیت کے گناہ

ایک شخص انھی تین بنیادوں پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے گناہ کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ نماز ان تمام اقسام کے گناہوں سے انسان کو بچاتی ہے۔ تاہم سورہ عنکبوت کی آیت میں صرف فحش اور منکر یعنی پہلی اور دوسری قسم کے گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نماز پڑھنے والا شخص جیسے ہی نماز میں رب کے حضور سر جھکاتا ہے وہ تیسری قسم کے گناہ یعنی رب سے سرکشی اور بغاوت سے دور ہوجاتا ہے۔ اس لیے اس طرح کے جرائم کو اس آیت میں بیان نہیں کیا گیا ہے۔

اس کے بعد پہلی اور دوسری قسم کے گناہ رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ نماز ان دونوں اقسام کے گناہوں یعنی فحش اور منکر سے روکتی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ہماری نماز ہمیں ان دونوں اقسام کے گناہوں سے نہیں روک پاتی تو اس کے لیے پوری آیت کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اس آیت کا ابتدائی حصہ تو ہم نے اوپر نقل کردیا ہے باقی حصہ اس طرح ہے جو عام طور پر بیان نہیں کیا جاتا اور نہ اس پر توجہ کی جاتی ہے۔ حالانکہ یہیں وہ بات بیان ہوئی ہے جو اہم ہے۔ فرمایا:

''بے شک نماز فحش اور منکر کاموں سے روکتی ہے۔ اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔''

یہ ہے وہ پوری بات جو اللہ تعالیٰ نے کہی ہے۔ مطلب اس بات کا یہ ہے کہ نماز اصل میں اللہ کی یاد کا نام ہے۔ یہ انسانوں میں رہتے ہوئے خدا میں جینے کا نام ہے۔ یہ غیب میں رہتے ہوئے خدا کی عظمت کو تسلیم کر لینے کا نام ہے۔ یہ خدا کی پکڑ میں آنے سے پہلے خود کو رب کے حوالے کر دینے کا نام ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یاد کی یہ کیفیت، یہ احساس بہت بڑی چیز ہے۔ اتنی بڑی کہ انسان ہر لمحہ خود کو رب کی نگرانی میں پاتا ہے اور پھر اس کا کوئی قدم خدا کی نافرمانی میں نہیں اٹھ سکتا۔ اس کا نفس تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی لگام اس کے اندر سے اٹھنے والے حیوانی جذبوں کے حوالے کر دے، مگر خدا کی یاد اسے آتی ہے اور اس کے نفس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیتی ہے۔ اس کے جبلی تقاضے سر اٹھاتے ہیں اور اس کے جذبات کو بے قابو اور قلب و نظر کو بے ایمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں مگر خدا کی یہی یاد آتی ہے اور ہر بہکی نظر اور امڈتے جذبے کو حدود آشنا بنا دیتی ہے۔

اس کے مفادات اسے حلال و حرام سے بے نیاز ہونے کی تلقین کرتے ہیں، اس کی خواہشات اسے اخلاقی تقاضوں کی پاسداری سے روکتی ہیں، اس کے تعصّبات اسے حق کی پیروی سے باز رکھنا چاہتے ہیں، بیوی بچوں کی محبت اسے حدود پامال کرنے پر اکساتی ہے، دنیا کی محبت اسے عارضی فائدوں کے پیچھے بھگاتی ہے، مال و مقام کی محبت اسے ظلم و عصیان پر آمادہ کرتی ہے مگر ہر ہر موقع پر یہ زندہ نماز، یہ خدا کی یاد والی نماز ایک چٹان بن کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک جاتے ہیں۔ کسی مرحلے پر اگر وہ جذبات سے مغلوب اور حالات سے مجبور ہو بھی جائے تو کبھی اس کا معاملہ ایک سرکش انسان کا نہیں بنتا بلکہ اگلی نماز میں اسے احساس ہو جاتا ہے کہ خدا زندہ اور اس پر نگران ہے۔ چنانچہ وہ رب کی طرف پلٹتا اور توبہ کرتا ہے۔

اس طرح نماز زندگی کے ہر موڑ پر انسان کو گناہوں سے دور رکھتی ہے۔ کیونکہ نماز جب ٹھیک طرح پڑھی جاتی ہے تو انسان کو ہمیشہ خدا یاد رہتا ہے اور یاد آ جاتا ہے۔ یہی وہ یاد ہے جو انسان کو گناہ سے بچاتی ہے نہ کہ بے روح قیام و سجود۔

موبائل فون

موبائل فون دورِ جدید کی ایک بڑی مفید ایجاد ہے۔ اس کی مدد سے کسی شخص سے مستقل رابطے میں رہا جا سکتا ہے۔ میرے پاس جو موبائل فون ہے، اس میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے سے اپنی آواز ریکارڈ کی جا سکتی ہے۔ پچھلے دنوں مجھے اپنے موبائل فون کی ایک اور خصوصیت کا علم ہوا۔ وہ یہ کہ اس پر فون کال بھی ریکارڈ ہو سکتی ہے۔

ہوا یہ کہ میں اپنے بعض ریکارڈ شدہ خیالات موبائل پر سن رہا تھا۔ اسی عمل میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری بعض فون کالز ساؤنڈ ریکاڈر میں موجود تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیسے ہوا، لیکن جب میں نے انہیں سننا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ بعض دوست احباب سے کی ہوئی گفتگو بعینہٖ وہاں موجود تھی۔ میں اس گفتگو کو، اس میں کہے ہوئے الفاظ کو بالکل بھول چکا تھا۔ مگر جب سنا تو سب یاد آ گیا۔

اپنی ریکارڈ شدہ آواز کو سننا میرے لیے کوئی نیا تجربہ نہ تھا، مگر یہ جس طرح اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا تھا اس نے مجھ پر سکتہ طاری کر دیا۔ مجھے فوراً یہ خیال آیا کہ نامعلوم طریقے پر ریکارڈ ہونے والی اس فون کال کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ بتایا ہے کہ وہ انسانوں کے ایک ایک عمل کی وڈیو بنا رہا ہے۔ وہ ان کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو ریکارڈ کر رہا ہے۔ انسان کہہ کر اور بول کر بھول جاتے ہیں۔ مگر خدا انہیں بھولتا۔ وہ سب محفوظ کر لیتا ہے اور قیامت کے دن انسان کے سامنے اس کے ہر ایک قول و فعل کی آڈیو اور وڈیو پیش کر دی جائے گی، (مجادلہ 6:58)۔

میں نے یہ بات قرآن میں بارہا پڑھی تھی۔ لیکن اس روز جو تجربہ ہوا۔ اس نے روزِ قیامت کی پیشی کو میرے سامنے گویا مجسم کر دیا۔ جب ایک ایک انسان کو تنہا اللہ کے سامنے پیش ہو کر زندگی کے ہر عمل کا حساب دینا ہو گا۔ انسان چاہے گا بھی تو اپنے اعمال سے، اپنے الفاظ سے مکر نہیں سکے گا۔

قیامت کا دن انسانوں کے احتساب کا دن ہے۔ اس دن انسان کو اس کی زبان سب سے زیادہ رسوا کروائے گی۔ عقلمند وہ ہے جو اس زبان کو سوچ سمجھ کر استعمال کرے۔

دل ونظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا

عصرِ حاضر میں میڈیا کی ترقی نے انسانی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔اس انقلاب کو وقوع پذیر ہونے سے روکا جا سکتا ہے،اور نہ ایسا کرنے کی ضرورت ہے۔جس چیز کی،میڈیا کے اس دور میں اشد ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ صفحۂ دل کو اس غلاظت سے محفوظ رکھنے کی سعی کی جائے جو نگاہوں کے رستے انسان کے اندرون تک رسائی پا لیتی ہے۔

کمپیوٹر اور ٹی وی اسکرین سے رنگ و آہنگ اور ساز و آواز کی جو یلغار دل و دماغ پر ہوتی ہے وہ حیران کن حد تک موثر ہے۔اس سے قبل کہ ایک فرد یہ جان سکے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔لطف و سرور کا متلاشی ٹی وی،ڈش اور کیبل کے چینل اور انٹرنیٹ کی وادیوں میں آوارہ پھرتے پھرتے اپنے باطن کی پاکیزگی کھو دیتا ہے۔یہ جانے بغیر کہ کس متاعِ بے بہا سے وہ ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔انسان کے وجود میں نگاہ قلب کا دروازہ ہوتی ہے۔ہر آنے والا اسی راستے سے نہاں خانۂ دل کا مہماں ہوتا ہے۔یہ دروازہ اگر ہر کس و ناکس کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے تو گو آنکھ روشن رہے مگر پاکیزگی قلب کی روشنی سے انسان محروم ہو جاتا ہے۔دو ہزار سال قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نگاہ کی اس غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر ارشاد فرمایا تھا۔

> ''تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ زنا نہ کرنا۔لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس کسی نے کسی بری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا''۔
>
> (متی باب ۵ آیت ۲۷،۲۸)

آج عیسیٰ کے نام لیواؤں نے نگاہ کی آلودگی کے وہ اسباب مہیا کر دیے ہیں جس کے بعد دل و نظر کا سفینہ بچا لے جانا بہت مشکل ہو چکا ہے۔پناہ صرف اس شخص کے لیے ہے جو نگاہ کے دروازے پر خدا خوفی کی تلوار لے کر بیٹھ جائے۔جو ایسا نہ کرے گا وہ اس دوشیزہ کی طرح پچھتائے گا جو زمانے کی ہوا سے بے پرواہ ہو کر شہر کی رونق دیکھنے نکلی۔مگر رات گئے جب گھر لوٹی تو اپنے وجود کی سب سے قیمتی شے - اپنی عصمت - گنوا بیٹھی تھی۔

آندھی اور عقاب

ہوا تمام مخلوقات کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک غیر معمولی نعمت ہے۔ مگر جب یہ ہوا تیزی سے چلنا شروع کر دے اور آندھی کی شکل اختیار کر لے تو ایک عظیم قدرتی آفت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کی طاقت کے آگے تمام مخلوقات بے بس ہو جاتی ہیں۔ یہ آندھی انسانوں کو پناہ گاہوں میں چھپنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بڑے بڑے قدآور درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔ سب سے بڑھ کر اس آندھی سے وہ پرندے متاثر ہوتے ہیں جو عام حالات میں ہوا کے دوش پر پر پھیلائے اڑتے پھرتے ہیں، مگر آندھی کے بعد یہی ہوا ان کے لیے وبالِ جان بن جاتی ہے۔ جن لوگوں نے کبھی آندھی کو آتے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ کس طرح ہوا کی تند و تیز یلغار ان پرندوں کو بے کسی کے ساتھ گھسیٹتی ہوئی لے جاتی ہے اور اکثر کسی پتھریلی رکاوٹ سے ٹکرا دیتی ہے۔

تاہم پرندوں میں ایک پرندہ ایسا بھی ہے جسے یہ تند و تیز آندھی بے بس کرنے کے بجائے مزید بلند کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ پرندہ عقاب ہے۔ دیگر پرندوں کی طرح عقاب بھی اتنا طاقتور نہیں کہ آندھی جیسی عظیم قدرتی آفت کا مقابلہ کر سکے۔ مگر عقاب آندھی سے پہلے آنے والے سکوت کو محسوس کر لیتا ہے۔ یہ قدرت کا ایک قانون ہے کہ آندھی آنے سے قبل ہوا بند ہو جاتی ہے اور ایک گھمبیر خاموشی چھا جاتی ہے۔ عقاب اس اشارے کو سمجھ کر فوراً بلندی کی طرف پرواز کر جاتا ہے۔ پھر ہوا کے تند و تیز جھکڑ چلنا شروع ہو جاتے ہیں، مگر ان کا زور سطح زمین کے قریب زیادہ ہوتا ہے اور بلندی پر کم ہوتا ہے۔ عقاب اس نسبتاً کمزور ہوا میں اپنے پر پھیلا دیتا ہے اور یہ ہوا اسے بلند تر کرتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بلندی کے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں وہ تیز ہواؤں کی دسترس سے نکل جاتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق اڑنا شروع کر دیتا ہے۔

عقاب اور دیگر پرندوں میں یہ فرق نہیں ہے کہ دیگر پرندے آندھی کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور عقاب کر سکتا ہے۔ اصل فرق یہ ہے کہ عقاب کو فطرت کی طرف سے پیش بینی کی وہ صلاحیت نصیب

ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ تند و تیز آندھی کے آنے سے قبل ہی اس کی زد سے نکل جاتا ہے اور قابل برداشت ہوا کو استعمال کر کے بلند تر ہو جاتا ہے۔

انسان بھی مصائب وحوادث کی آندھی کے مقابلہ میں اتنا ہی کمزور ہوتا ہے جتنا کہ ایک عام پرندہ۔ لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیش بینی کی ایک غیر معمولی صلاحیت دی ہے۔جس کی مدد سے انسان اگر چاہے تو اپنے کل کا اندازہ لگا سکتا ہے۔موت، بیماری، حادثات، اپنی اور اپنے بچوں کی آنے والی ضروریات کو انسان زندگی سے نکال تو نہیں سکتا مگر ان کا ایک عمومی اندازہ ضرور کرسکتا ہے۔اور پھر اسی بنیاد پر انسان ان کی کچھ نہ کچھ تیاری کرسکتا ہے۔مثلاً انسان اپنی غذا کو بہتر بنا سکتا ہے تا کہ بیماریوں سے محفوظ رہے، بچوں کے مستقبل کے لیے بہتر تعلیم کا بندوبست کرسکتا ہے، حادثات و بیماری کے لیے کچھ رقم پس انداز کرسکتا ہے۔

انسان کے لیے مصائب کی آندھی سے قبل اگر وہ راستہ درست ہے جو عقاب اختیار کرتا ہے تو اس آندھی کے آجانے کے بعد بھی وہی راستہ درست ہے جو عقاب کا ہے۔یعنی ہوا کا مقابلہ کرنے کے بجائے اپنے پر پھیلا کر خود کو اس کے حوالے کر دینا۔یعنی حالات جو رخ اختیار کریں ان میں ممکنہ حد تک کوشش کرنے کے ساتھ اپنے معاملات کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دینا۔اس عمل کے نتیجے میں انسان ہمیشہ پر سکون رہتا ہے۔اس کا نقصان کم ہوتا ہے۔اور پھر قدرت اپنے قانون کے تحت اس نقصان کی بھی کسی نہ کسی طور پر تلافی کر دیتی ہے۔صبر کے برعکس پریشان ہونے کا راستہ انسان کو نہ صرف کچھ دیتا نہیں بلکہ مزید مصائب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

پیش بینی اور صبر کے ساتھ اچھے حالات کا انتظار کرنا۔انسان کی اعلیٰ ترین صفات میں سے ہیں۔یہ صفات نہ صرف زندگی کی مشکلات سے انسان کو بچا لیتی ہیں بلکہ مشکلات آنے پر بھی انسان کو ثابت قدم رکھتی ہیں۔یہی وہ صفات ہیں جنہیں آج ہم میں سے ہر شخص میں پیدا ہونا ضروری ہے۔یہی صفات انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہماری کامیابی کی ضامن ہیں۔

وہ جنھیں وطن کو لوٹنا ہے

بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد خلیجی ممالک میں پرکشش تنخواہوں اوراجرتوں پر کام کرتی ہے۔ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد 14 سے 15 لاکھ ہے جن میں سے 9 لاکھ افراد صرف سعودی عرب میں مقیم ہیں ۔ دنیا کے دوسرے خطوں مثلاً امریکہ، کینیڈا، مشرقِ بعید، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک میں رہنے والے پاکستانیوں کے برعکس ان لوگوں کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ سالہا سال ملک سے باہر رہنے کے باوجود ان کا اوران کے بچوں کا مستقبل پاکستان ہی سے وابستہ رہتا ہے اور دھرتی سے ان کا رشتہ نہیں ٹوٹتا۔اس کا سبب خلیجی ممالک کا وہ قانون ہے جس کے تحت کسی غیر ملکی کے لیے عملی طور پر وہاں کی شہریت حاصل کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ وہاں گزار دینے والے غیر ملکیوں کا مقدر بھی یہی ہے کہ آخر کار انہیں اپنے وطن کو لوٹنا ہے۔

خلیج میں کام کرنے والے ان پاکستانیوں کو ایک دوسری صورتِ حال سے بھی واسطہ پیش آتا ہے۔ وہ یہ کہ ان ممالک میں کسی فرد کی مدتِ قیام کا تمام تر انحصار اس شخص یا کمپنی پر ہوتا ہے۔جس کے ویزہ پر وہ یہاں ملازمت کے لیے آیا ہوتا ہے۔اسے یہاں کی اصطلاح میں " کفیل" کہتے ہیں۔ جب تک کفیل کی مرضی ہوگی وہ آدمی یہاں کام کرتا رہے گا اور جب وہ چاہے گا اسے نہ صرف ملازمت سے فارغ کردے گا ، بلکہ فوراً ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کردے گا۔ یہ کوئی انفرادی سطح پر پیش آنے والا معاملہ نہیں ، بلکہ یہ حکومت کی سوچی سمجھی پالیسی ہے جس کے تحت وہ سرکاری اور نجی شعبوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے ہاں سے غیر ملکیوں کو نکال کر زیادہ سے زیادہ مقامی لوگوں کو روزگار مہیا کریں۔

ان مسائل کی بناء پر یہاں کام کرنے والوں میں ایک خاص قسم کی ذہنیت پیدا ہوجاتی ہے، جس کے باعث انہیں ہمیشہ احساس رہتا ہے کہ یہ جگہ ان کے مستقل قیام کی نہیں ہے اور یہ کہ ایک

روز انہیں بہرحال اپنے وطن کو لوٹنا ہے۔ان چیزوں سے ان کے اوپر مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ایک اثر ان کی زندگی پر یہ پڑتا ہے کہ یہ اس بات کی ہر وقت کوشش کرتے رہتے ہیں کہ جب وہ اپنے وطن کو لوٹ کر جائیں تو خالی ہاتھ نہ ہوں، بلکہ ان کے پاس کافی سرمایہ بچت کی صورت میں موجود ہو جس سے وہ اپنے مستقل وطن میں بہتر زندگی گذار سکیں۔ چنانچہ یہ لوگ اپنی کمائی کا بڑا حصہ اپنے ملک میں انویسٹ کرتے ہیں۔بعض لوگ بچت کی کسی اسکیم میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔بعض زمین وجائیداد میں رقم لگاتے ہیں۔بعض شیئرز خرید لیتے ہیں اور بعض اپنا پیسہ فارن کرنسی کی شکل میں محفوظ رکھتے ہیں۔

دوسرا اثر جوان کے طرزِ زندگی پر پڑتا ہے اسے بجا طور پر "سیکنڈ ہینڈ" زندگی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ایک طرف تو ان لوگوں کو اپنے مستقبل کے لیے کچھ رقم پس انداز کرنی ہوتی ہے تو دوسری طرف یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کسی بھی لمحے انہیں یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ایسی صورت میں ان کا تمام تر ساز وسامان دھرا کا دھرارہ جائے گا۔ چنانچہ وہ ہر معاملے میں سیکنڈ ہینڈ، گزارے کے قابل اور سستی چیز کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ جاتے وقت اگر کسی چیز کو پھینکنا بھی پڑے تو زیادہ دکھ نہ ہو۔ ورنہ قیمتی سامان ایسے وقت میں کوڑیوں کے مول ہی بکتا ہے۔ چنانچہ یہاں رہنے والے کم وبیش تمام لوگوں کا طرزِ عمل یہی ہوتا ہے کہ وہ فرسٹ کلاس تنخواہیں لے کر سیکنڈ کلاس زندگی گذارتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ جس طرح کی پرآسائش زندگی گذار سکتے ہیں، اس سے کم درجے کی زندگی اختیاری طور پر گذارتے ہیں۔

خلیجی ممالک میں کام کرنے والے ان پاکستانیوں کی زندگی ان لوگوں کے لیے بہترین نمونہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جنھیں یقین ہے کہ ان کا اصلی وطن جنت ہے۔اس دنیا میں تو وہ صرف کمانے کے لیے آئے ہیں اور اس کمائی کا بہترین مصرف

یہ ہے کہ اسے اپنے اصل وطن یعنی جنت کی زمین میں انویسٹ کریں، خدا کی قرضِ حسنہ کی اسکیم میں لگائیں، اللہ کی رحمت کے شیئرز خریدیں اور زیادہ سے زیادہ نیکیوں کی فارن کرنسی محفوظ رکھیں۔ غرض یہ کہ وہ اپنی تمامتر صلاحیتوں اور بہترین مساعی کے ساتھ حشر کے بازار میں سرمایہ کاری کریں تاکہ کل جب اپنے 'وطن' کو لوٹیں تو کوئی پچھتاوا نہ ہو۔

وہ لوگ جو دنیا میں اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر فرسٹ کلاس زندگی گذار سکتے ہوں، کیو ں سیکنڈ کلاس زندگی کو ترجیح دیتے ہیں؟ اس لیے کہ انہیں احساس ہوتا ہے کہ دنیا میں ان کے ویزے کی مدت کسی وقت بھی ختم ہوسکتی ہے۔ اگر ان کی پونجی اس دنیا کے سامانِ عیش وعشرت ہی میں صرف ہوگئی تو اگلی دنیا میں ان کا کیا بنے گا۔ ان کے عالی شان بنگلے وارثوں کے تصرف میں آجائیں گے، ان کی شان دار گاڑیاں دوسروں کے استعمال میں آجائیں گی ، ان کے بڑے بڑے کارخانے دوسروں کے حصے میں آجائیں گے۔ مرنے والوں کو تو اپنے ساز وسامان میں سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملا کرتی۔ سو جب سب کچھ چھوڑنا ہی ٹھیرا تو بہتر یہی ہے کہ آدمی خراب چیز چھوڑ کر جائے تاکہ دکھ بھی کم ہو، ورنہ اپنے خون پسینے کی کمائی کو یوں اکارت جاتا دیکھ کر ان کا جی بہت کڑھے گا۔

ہم مانیں یا نہ مانیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم میں سے ہر شخص " خلیج" میں کام کرنے والا ایسا ''غیر ملکی'' ہے جسے خوش قسمتی سے اپنا مستقبل سنوارنے کا ایک موقع مل گیا ہے۔ اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے لیے کچھ بچت نہیں کی تو اپنے "وطن" کو لوٹتے وقت سوائے حسرت ویاس کے ہمارے پاس کچھ نہیں ہوگا۔

وہ جنھیں وطن کو لوٹنا ہے، انہیں اس بارے میں کچھ سوچنا چاہیئے ۔ وہ جنھیں وطن کو لوٹنا ہے، انہیں اس بارے میں کچھ کرنا چاہیئے ۔

مومن کی پہچان

سیف اللہ صاحب ہمارے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے سے ہمارے ادارے سے وابستہ ہیں۔ ان کی ملازمت کی نوعیت ایسی ہے کہ انہیں دنیا بھر میں گھومنے اور جانے کا موقع ملتا ہے۔ ان مواقع کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک پرجوش داعیانہ شخصیت بھی دی ہے۔ چنانچہ وہ جہاں جاتے ہیں ہماری کتابیں اور رسالے ساتھ لے جاتے ہیں اور دنیا بھر میں ہمارا پیغام پھیلاتے ہیں۔ پچھلے دنوں میں نے سیف اللہ صاحب کو فون کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے بچوں کو رسالے کا ایک مضمون پڑھ کر سنا رہے تھے۔ انہیں جب بھی کوئی مضمون پسند آتا ہے وہ اسے اپنے بچوں تک ضرور منتقل کرتے ہیں۔

اگرچہ سیف اللہ صاحب میرے لیے اس وجہ سے اہم ہیں کہ ان کے ذریعے سے دنیا بھر میں میری تحریریں پھیلی ہیں، مگر مجھے ان کی یہ بات زیادہ پسند آئی کہ وہ اپنے بچوں تک بھی اچھی چیزیں پہنچاتے ہیں، چاہے انہیں پڑھ کر سنانا پڑے۔ یہ بات نہ صرف اس لیے اہم ہے کہ ہمارے گھر والے ہی اصل میں ہماری ذمہ داری ہیں بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ نئی نسلوں میں مطالعے کا رجحان بہت کم ہوگیا ہے۔ وہ بری چیزیں بھی پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو اچھی چیزیں کیا پڑھیں گے۔ ایسے میں پچھلی نسلوں کے والدین کو یہ اپنی ذمہ داری سمجھنی چاہیے کہ نئی نسل میں مطالعے کا شوق پیدا کریں۔ اگر وہ نہ پڑھیں تو اچھی چیزیں انہیں پڑھ کر سنائی جائیں۔

ایک سچا مومن حق کو سمجھنے کے بعد اسے فوراً دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بلاشبہ زبردستی دوسروں کے سر پر سوار نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت انہیں بات سنانے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ ان کی مصروفیات اور دلچسپی کی چیزوں میں مخل نہیں ہوتا۔ وہ جا بجا لوگوں کے سامنے وعظ و تقریر نہیں کرتا۔ لیکن وہ بات سنانے کا کوئی موقع خالی بھی نہیں جانے دیتا۔ وہ حکمت کے ساتھ ہمیشہ اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے لیے مستعد رہتا ہے۔ یہی ایک سچے مومن کی پہچان ہے۔

موسم بہار

اس مرتبہ پورے پاکستان میں گرمی بہت شدید پڑی ہے۔ لاہور میں تو درجہ حرارت 48 ڈگری تک جا پہنچا جو پچھلے 78 برس میں یہاں پڑنے والی شدید ترین گرمی ہے۔ شدید گرمی کے ساتھ لوڈ شیڈنگ نے شہریوں کی زندگی عذاب کردی۔ کراچی جو ملک کا سب سے بڑا شہر ہے، اس لوڈ شیڈنگ کا سب سے بڑا شکار بھی ہے۔ صورتحال یہ ہوچکی ہے کہ 8 سے 10 گھنٹے بجلی بند ہونا معمولات یومیہ میں شامل ہو چکا ہے۔ اس صورتحال سے لوگ اتنے تنگ ہیں کہ سڑکوں پر آگ لگانا، راستے بند کرنا اور احتجاج کرنا معمول بن چکا ہے۔

یہ گرمی چند دن کی ہے۔ برسات کی آمد آمد ہے۔ اس کے بعد آگ برساتا آسمان، ایسی رحمت برسائے گا کہ زمین اور اس کے تمام باسی گرمی کو بھول کر ٹھنڈی بارش کا مزہ لیں گے۔ یہی اس دنیا کا نظم ہے۔ بنانے والے نے اس دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی موسم سدا نہیں رہتا۔

مگر ایک دنیا اور آرہی ہے۔ اس دنیا کے موسم ابدی ہوں گے۔ اس کی دھوپ، اس کی چھاؤں، اس کی گرمی، اس کی سردی، اس کی خزاں، اس کی بہار سب ہمیشہ ایک جیسی رہیں گی۔ اس زندگی کا پہلا دن 50 ہزار برس کا ہوگا۔ یہ موسم گرما کا دن ہوگا۔ گرمی ایسی ہوگی کہ سورج سوا نیزے کے فاصلے پر محسوس ہوگا۔ پسینہ ایسا بہے گا کہ گویا ہر شخص اپنے پسینے میں غوطے کھا رہا ہوگا۔ پیاس کا عالم یہ ہوگا کہ حلق میں کانٹے پڑ چکے ہوں گے۔ اس روز بجلی اور ہوا کا تو کیا سوال، انسان کے سر پر کوئی سایہ تک نہیں ہوگا۔ مگر ایسے میں کوئی احتجاج کا سوچ بھی نہ سکے گا۔ کیونکہ یہ دن خدا کی عدالت قائم ہونے کا دن ہوگا۔ یہ احتجاج کا نہیں انصاف کا دن ہوگا۔

مگر اس روز کچھ خوش نصیب ہوں گے۔ جو عرش الٰہی کے سائے میں، رحمتِ رب کی ٹھنڈی چھاؤں میں اور ساقی کوثر کی محفل میں ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو زندگی کے ہر سرد و گرم میں صبر کرتے رہے۔ ظلم کے جواب میں عدل، بے رخی کے جواب میں مسکراہٹ، کانٹوں کے بدلے میں پھول دنیا کو دیتے رہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو جنت کے ابدی موسم بہار میں بسا دیے جائیں گے۔

دو چہرے ایک رویّہ

مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ان کے ایمان، محبت اور عقیدت کا محور ہے۔ ایک مسلمان چاہے کتنا بھی بے عمل کیوں نہ ہو وہ آپ کی محبت اور عقیدت کے معاملے میں بے حد حساس واقع ہوا ہے۔ حضور کی طرح ہی آپ کا لایا ہوا دین، آپ کی دی ہوئی شریعت اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب بھی مسلمانوں کے نزدیک بہت محترم ہے۔

حضور کی بے مثل شخصیت اور آپ کی لائی ہوئی آفاقی تعلیمات نے ہر دور میں انسانوں کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ لیکن دوسری طرف اعدائے اسلام نے بھی ہر دور میں انھی دو چیزوں کو نشانہ بنا کر نہ صرف اچھے غیر مسلموں کو اسلام سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے بلکہ مسلمانوں کا بھی اسلام پر اعتماد مجروح کرنا چاہا ہے۔

اسلام کے ان دشمنوں کا طریقہ کار ہمیشہ سے سادہ رہا ہے۔ یہ لوگ کبھی اسلام کے مثبت اور اچھے پہلوؤں کو لوگوں کے سامنے نہیں لاتے بلکہ چن چن کر اسلامی تعلیمات اور سیرت پاک کے ان پہلوؤں کو لوگوں کے سامنے لاتے ہیں جہاں سطحی طور پر دیکھنے میں ایک چیز اخلاقی اور عقلی پیمانوں کے بالکل خلاف نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ لوگ حضور کی سیرت پر یہ کہہ کر حملہ کرتے ہیں کہ آپ نے گیارہ شادیاں کیں۔ یا اسلامی تعلیمات کو یہ کہہ کر داغدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس میں عورتوں کو دوسرے درجے کا انسان سمجھا گیا ہے۔ یا قرآن پاک میں لونڈی غلام رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ حالانکہ جیسے ہی تمام باتوں کو ان کے موقع محل اور حالات میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے، اصل بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

ان کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ حقائق کی سادہ توجیہ کرنے کے بجائے ایک انتہائی رکیک اور منفی توجیہ کرتے ہیں۔ مثلاً حضور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوتی تھی۔ یہ لوگ کبھی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔ حضور پر جھوٹ کی نسبت کا اس لیے سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ آپ کے بدترین دشمن اور منکرین بھی آپ کو صادق اور امین کہتے تھے۔ چنانچہ اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ حضور کو معاذ اللہ مجنون، ساحر اور شاعر وغیرہ کہا گیا۔ دور جدید کے لوگوں نے نفسیاتی امراض کی آڑ لی اور وحی کے دوران میں طاری ہونے والی کیفیت کے پیش نظر یہ کہا گیا کہ معاذ اللہ آپ کو نفسیاتی عارضہ لاحق تھا۔

اسلام کے بارے میں اس طرح کی خلاف عدل باتیں وہی لوگ کرتے رہے ہیں جو حق کی دشمنی میں بالکل اندھے ہو جاتے ہیں یا پھر اپنے پیروکاروں کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ انہیں ہر اخلاقی اصول سے بالکل بے نیاز کر دیتا ہے۔ کسی کی دشمنی میں اندھے ہو کر خلاف عدل معاملہ کرنا یا اپنے مفادات کی خاطر اخلاقی اصول کو پامال کر دینا ایک خاص قسم کا منفی کردار ہے۔ یہ کردار ضروری نہیں کہ کسی دشمن اسلام میں پایا جائے۔ عین ممکن ہے کہ یہ کردار کسی مسلمان میں بھی موجود ہو۔ چنانچہ قرآن و حدیث میں مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس قسم کے رویے اور کردار سے دور رہیں۔ ہم مثال کے طور پر صرف ایک آیت نقل کر رہے ہیں۔

''اے ایمان والو! عدل کے علم بردار بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے۔ اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو۔ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو بے شک اللہ اس سے باخبر ہے''۔ (مائدہ 8:5)

بدقسمتی سے مسلمانوں اور خاص کر مذہبی حلقوں میں دین کی تعلیم بالکل غیر اہم سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی کی دشمنی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تو عدل و انصاف کی ہر حد پامال کر جاتے ہیں۔ مخالفین کے بارے میں لکھی ہوئی ان کی تحریریں کبھی پڑھ لیجیے، اختلاف کرنے والوں کے بارے میں ان کی تقریریں ذرا سن لیں تو اندازہ ہوگا کہ ان میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین، کفار و منافقین اور اسلام دشمن یہود و نصاریٰ کے طریقہ واردات میں کوئی فرق نہیں۔ جھوٹ، دروغ گوئی، خلاف واقعہ الزام تراشی، بات کو سیاق و سباق سے جدا کر کے پیش کرنا، معاملے کی غلط اور رکیک تاویل کرنا، واقعہ کو موقع محل سے الگ کر کے بیان کرنا، تحقیر و تذلیل پر مبنی اسلوب اختیار کرنا، کفر و ضلالت اور شرک و بد دینی کے فتویٰ لگانا، جان، مال اور آبرو کے درپے ہو جانا یہ وہ رویے ہیں جو اسلام دشمن عناصر بھی اختیار کرتے ہیں اور اسلام کے نام پر کھڑے ہوئے لوگوں کے معمولات میں بھی شامل ہیں۔

یہ رویہ اختیار کرنے والے لوگ بظاہر خدا پرستی اور تقویٰ کے لبادے میں خود کو چھپاتے ہیں۔ مگر قرآن کے مطابق یہ لوگ خلاف عدل بات کہہ کر خدا اور تقویٰ دونوں سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا اس کے سوا کوئی انجام نہیں ہوگا کہ قیامت کے دن خدا کے حضور یہ لوگ مجرموں کی طرح پیش ہوں گے اور خدا ان کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جو اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ہوگا۔

سایہ اور بچی

یہ ایک مووی کلپ (Movie Clip) تھا، جس کا نام شیڈو یعنی سایہ تھا۔ میں نے اسے کمپیوٹر پر چلانا شروع کیا تو ایک دلچسپ منظر سامنے آیا۔ یہ ایک بچی تھی جو آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ دھوپ کی وجہ سے اس کے ساتھ اس کا سایہ بھی نظر آ رہا تھا جو اس کے قد سے کافی بڑا تھا۔ چلتے چلتے جب اس کی نظر اپنے سایہ پر پڑی تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ اس کے ساتھ اس کا سایہ بھی اس کی طرف بڑھا۔ اس پر وہ مزید گھبرائی اور رونے لگی۔ پھر وہ دیر تک ادھر ادھر ہوتی رہی مگر سایہ اس کے ساتھ ہی چپکا رہا۔ اس کے ساتھ یہ وڈیو کلپ ختم ہو گیا۔

میں دیر تک اس ریکارڈنگ پر غور کرتا رہا جسے کسی نے ایک دلچسپ منظر سمجھ کر کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر لیا تھا۔ میرے لیے اس منظر میں تفریح کی تو کوئی بات نہ تھی، نصیحت کی ضرور تھی۔ یہ وسیع تر پس منظر میں انسانی زندگی کی بھرپور عکاسی تھی۔ انسان کو پیش آنے والے مسائل و آلام زندگی کا ناگزیر حصّہ ہیں۔ انسان ان سے گھبرا کر بھاگتا ہے اور یہ سائے کی طرح زندگی کے ہر موڑ پر انسان کا پیچھا کرتے ہیں۔ سائے کی طرح مصائب بھی ہمیشہ انسان کو اپنی برداشت سے زیادہ بڑے محسوس ہوتے ہیں۔ انسان ان سے بچنا چاہتا ہے، مگر موت تک یہ مصائب انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

تاہم ان مصائب کو دیکھنے کا ایک دوسرا انداز بھی ہے۔ بالکل اسی طرح، جس طرح سایہ کی حقیقت سمجھنے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہوتا ہے۔ یعنی سایہ بظاہر انسان کے وجود کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے، مگر درحقیقت یہ بتاتی ہے کہ انسان اس وقت روشنی میں کھڑا ہے نہ کہ تاریکی میں۔ کیونکہ سایہ اس وقت بنتا ہے جب انسان پر روشنی پڑے۔ اندھیرے میں کبھی سایہ انسان کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سایہ اپنی ذات میں کوئی مستقل شے نہیں بلکہ روشنی کا سائڈ افیکٹ ہے۔ ٹھیک اسی طرح مصائب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور مغفرت کے ساتھ بندے کی طرف متوجہ ہیں۔ اس کے نور کی روشنی ہے، جس نے انسان کے وجود کا احاطہ کر لیا ہے۔ اور مصائب اسی نور کا سائڈ افیکٹ ہیں۔

انسان ان مصائب کی حقیقت سے واقف نہ ہوتو وہ ساری زندگی مصائب کے سائے سے خوفزدہ رہتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو امتحان کی جس آزمائش میں اتارا ہےاس کا ایک بہت بڑا حصہ تو ان نعمتوں پر مشتمل ہے جو ہر لمحہ ہمیں حاصل رہتی ہیں۔ ہوا، پانی، لباس، خوراک، اعضا وقویٰ، عقل وفہم، رشتے ناطے، شعور واحساس غرض نعمتوں کی اتنی اقسام ہیں کہ اگر انھیں گننے کی کوشش کی جائے تو ان کا شمار ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ تمام نعمتیں اس لیے دیتے ہیں کہ ہم ان کا شکرادا کریں اور اللہ تعالیٰ کی ابدی نعمتوں کے حقدار بنیں۔ مگر انسان ان کو معمولی چیز سمجھنے لگتا ہے۔ وہ شکر کرنے کے بجائے غفلت اور معصیت کا شکار ہوجاتا ہے۔ یہ رویہ انسان کو جہنم میں پہنچا سکتا ہے۔

ایسے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظہور ہوتا ہے۔انسان کسی نہ کسی مسئلے کا شکار ہوجاتا ہے۔اسے جان، مال اور آبرو کا کوئی نقصان پیش آجاتا ہے۔اس سے مقصود انسان کو ایذا دینا نہیں بلکہ ان نعمتوں کا احساس دلانا ہوتا ہے جو اسے پہلے ہی سے حاصل ہوتی ہیں مگر انسان انہیں اپنا حق سمجھ بیٹھتا ہے۔ یہی انسان کی آزمائش کا دوسرا پہلو ہے۔ یعنی جو نعمت چھن گئی ہے، جو مصیبت آگئی ہےاس پر صبر کرے اور خدا سے اجر کی امید رکھے۔ خدا کے حضور استغفار کرے۔ اپنی کمیوں اور خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ مگر بدقسمتی سے اکثر انسان اس بچّی کی طرح بن جاتے ہیں جو اپنے سایہ کو دیکھ کر ڈر گئی تھی اور رونے لگی تھی۔ وہ مصائب پر صبر کے بجائے آہ وزاری کرتے ہیں۔ شکوے شکایت کرتے ہیں۔ایسے لوگوں کی مشکلات انہیں خدا سے قریب کرتی ہیں اور نہ ان کی اصلاح کا ذریعہ بنتی ہیں۔

مسائل زندگی کا ناگزیر حصّہ ہیں۔ان سے بچا تو نہیں جاسکتا، مگر دنیا وآخرت دونوں کی زندگی ضرور بہتر بنائی جاسکتی ہے۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ مصائب انسان کے لیے روشنی کی علامت بن جائیں۔وہ جان لے کہ یہ زندگی کا تاریک پہلو نہیں بلکہ روشن تر پہلو ہے۔ یہ اس روشنی کی علامت ہے جس کے ساتھ مالک دوجہاں اپنے بندے کی طرف متوجہ ہے۔ یہ روشنی خدا کے قرب کی روشنی ہے۔ یہ روشنی جنت کی نعمتوں کی روشنی ہے۔

معاشرتی برائیاں اور ہمارا رویہّ

مجھے ٹیلیوژن پر انٹرویو کے لیے براہِ راست (Live)اور ریکارڈ شدہ دونوں قسم کے پروگراموں میں شرکت کا موقع ملا ہے۔ براہِ راست پروگراموں کے برعکس ریکارڈ شدہ پروگرام کو کبھی وقت پر شروع ہوتے میں نے نہیں دیکھا۔ بالخصوص پہلی دفعہ جب مجھے اس کا اندازہ نہ تھا تو بڑی کوفت اٹھانی پڑی۔ میں دیے ہوئے وقت پر جب اسٹوڈیو پہنچا تو معلوم ہوا کہ پروگرام کے پروڈیوسر، ڈائریکٹر، میزبان اور تکنیکی عملہ سب غائب ہیں۔ بعد میں پروگرام کے پروڈیوسر نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا ہر مہمان دیے ہوئے وقت کے دو گھنٹے بعد آتا ہے۔آپ چونکہ ’بدقسمتی‘ سے وقت پر آ گئے اس لیے آپ کو زحمت ہوئی۔

پروڈیوسر صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ غلط نہ تھا۔ یہ ہماری سوسائٹی کا عام رویہ ہے کہ اجتماعی تقریب اور معاملات میں جو وقت دیا جاتا ہے اس کی پابندی کرنے والا بیوقوف بن کر رہ جاتا ہے۔مثلاً کسی شادی کارڈ کو پڑھیئے۔اس پر تقریب کا وقت نو بجے لکھا ہوگا مگر مقامِ تقریب پر جا کر دیکھ لیجیے۔ دس بجے تک میزبانوں، گیارہ بجے تک مہمانوں اور بارہ بجے تک نکاح کے آثار نظر نہیں آئیں گے۔انفرادی معاملات میں بھی ہمارا یہی رویہ ہے۔ہم ملاقات کا ایک وقت طے کرتے ہیں اور بلا عذر اس سے گھنٹہ یا نصف آگے پیچھے کرنا ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ہم ایک کام کو جس وقت پر کر کے دینے کا وعدہ کرتے ہیں کبھی اسے پورا کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔

ہمارا یہ رویہ بلاشبہ ہمارے اخلاقی زوال کی ایک کھلی نشانی ہے۔اس زوال کا سبب یہ ہے کہ جب کبھی ہم اصلاح کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد ہمیشہ دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ اپنی ذات کو ہم کبھی اس اصلاح کا نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی بدعملیوں کی دسیوں توجیہات ہماری زبان کی نوک پر رکھی رہتی ہیں۔

مثلاً کچھ عرصے قبل میں نے ایک معاشرتی مسئلے 'قطار نہ بنانے' پر ایک مضمون لکھا۔ اس میں نماز کے حوالے سے یہ بیان کیا گیا تھا کہ منظّم طریقے پر باجماعت نماز پڑھنے والوں کو قطار کی زیادہ پابندی کرنی چاہیے۔ جبکہ اس کے برعکس اہل مغرب اس معاملے میں زیادہ باشعور ثابت ہوتے ہیں۔ اس مضمون پر ایک صاحب نے یہ تبصرہ فرمایا کہ قطار بنانا یہودیوں کا طریقہ ہے۔ یہ تبصرہ اس منفی سوچ کی عکاسی کرتا ہے جو ہمارے معاشرے کے ایک عام آدمی کے دل ودماغ میں رچ بس گئی ہے۔ اس سوچ میں ہم اپنے غلط اعمال کی کوئی نہ کوئی تاویل اپنے پاس رکھتے ہیں۔ چاہے وہ تاویل انتہائی نامعقول ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وہ سوچ ہے جو پہلے مرحلے پر خیر وشر کا شعور ختم کرتی اور پھر خیر کو شر اور شر کو خیر بنا دیتی ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

تاہم جو لوگ کسی برائی کو برائی مانتے ہیں وہ بھی اپنے اندر اتنا حوصلہ پیدا نہیں کرتے کہ خرابی کے اس دھارے میں شامل ہونے کے بجائے اولین اصلاح کرنے والے بن جائیں۔ حالانکہ اگر کچھ لوگ ہمت کر کے آگے بڑھیں تو دوسروں کے لیے ایک اچھی مثال قائم ہوسکتی ہے۔ جس کے نتیجے میں مزید لوگ آگے بڑھیں گے۔ کیونکہ ایک عام انسان لفظوں کی نہیں مثالوں کی پیروی کرتا ہے۔

مثلاً شادی کی تقریبات میں تاخیر سے ہر شریف آدمی نالاں ہے مگر کوئی آگے بڑھ کر اس معاملے کو ٹھیک کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ معمولی عذر کی آڑ لے کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں ہمارے ایک عزیز دوست نے بڑی اچھی مثال قائم کی۔ انھوں نے اپنے بچوں کی شادی میں وقت کی پابندی کی یہ اعلیٰ مثال قائم کی ہے کہ کارڈ پر لکھے ہوئے وقت پر لازماً

کھانا کھول دیا جاتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مہمانوں کی تو خیر ہے مگر سسرال والوں کا آپ کیا کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ اگر وہ تاخیر سے آئیں گے تو میں انتظار کر کے ان کے ساتھ کھاؤں گا مگر ان کی وجہ سے وقت کی خلاف ورزی کر کے دوسروں کو تکلیف میں نہیں ڈالوں گا۔ یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ اگر اصلاح کے معاملے میں انسان یکسو ہو اور ہمت کر لے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہی وہ ہمت ہے جو ایک دفعہ کچھ لوگوں میں پیدا ہو جائے تو معاشرے میں خیر کا عنصر بڑھنا شروع ہو جائے گا۔

ہمارا ایک اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم اخلاقی معاملات کا مذہب سے کوئی تعلق محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اسے عیسائی یہودیوں کی کوئی بدعت سمجھتے ہیں۔ مذہب جو معاشرے اور مشکلات سے ٹکرانے کا سب سے بڑھ کر حوصلہ دیتا ہے ہمارے ہاں بے روح پوجا پاٹ اور بے معنی رسوم و رواج کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ مذہب کی کُل تعلیم یا تو اخلاقی نوعیت کی ہے یا ان کے نتائج اخلاقی دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی وقت کی پابندی کے مسئلے کو لے لیجیے۔ وقت کی پابندی کرنا ایفائے عہد کی ایک شکل ہے۔ اب دیکھیے دین کی تعلیمات اس بارے میں کیا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''اور عہد کو پورا کرو بے شک عہد کے متعلق پوچھ گچھ کی جائے گی۔'' (بنی اسرائیل 34:17)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس میں عہد کی پاسداری نہیں اس کا کوئی دین نہیں'' (مسند احمد)

قرآن و حدیث کے یہ احکام بتاتے ہیں کہ ایک سچا مومن اخلاقی دنیا میں بھی اعلیٰ ترین انسان ثابت ہوتا ہے۔ اگر اخلاقی دنیا میں کسی کا رویہ درست نہیں تو وہ جان لے کہ اس کے پاس کوئی دین نہیں۔

عجیب محرومی

میرے خاندان میں ایک لڑکی پہلی دفعہ ماں بننے والی ہے۔اس عرصہ میں وہ کافی تکالیف کا شکار رہی۔مگر ماں بننے کی خوشی میں وہ ساری تکلیفیں جھیل گئی۔اب سارے خاندان والے خوش ہیں۔اس نئے آنے والے کے لیے ہر ممکنہ تیاری کی جارہی ہے۔اس کی ہر ضرورت کا اہتمام کیا جارہا ہے تاکہ نئی دنیا کا یہ نیا مہمان اچھے طریقے سے اپنی زندگی کا آغاز کرے۔

یہ کم وبیش ہر انسان کی کہانی ہے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان آنے والے کل کا شعوری تصور رکھتا ہے۔وہ اس کے لیے تیاری کرتا ہے۔اس میں پوشیدہ مسائل سے بچنے کی کوشش کرتا اور اس میں چھپی خوشیوں کو محسوس کر کے لطف اندوز ہوتا ہے۔انسان کا یہی 'تصور کل' اس کی انفرادیت اور دنیا میں اس کی بقا وکامیابی کا ضامن ہے۔

مگر میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہی 'تصور کل' قیامت کے دن انسان کی پکڑ کا سب سے بڑا سبب بن جائے گا۔جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسان سے سوال کریں گے کہ میں نے اپنے پیغامبروں کی معرفت تمھیں جنت میں ملنے والی ہر خوشی اور جہنم کی ہر اذیت سے مطلع کر دیا تھا۔میرا پیغام زبانی ہی نہیں تحریری طور پر قرآن کی شکل میں تمھارے پاس موجود تھا۔اس میں میرے پیغام کے ساتھ ہر فکری اور عقلی سوال کا جواب بھی تھا۔ان سب کے ساتھ تم آنے والے کل کی تیاری کے اصول پر زندگی گزارتے تھے۔پھر یہ بتاؤ کہ آخرت کی اس نئی دنیا کی اپنے اس نئے جنم کی تیاری کیوں نہیں کی۔

خدا پوچھے گا میں نے تمھیں زندگی دی، رزق دیا، تم نے میری کتنی عبادت اور اطاعت کی۔تم مشکلوں میں مجھے پکارتے تھے، مجھ سے دعا کرتے تھے، میں نے تمھاری مدد کی۔تمھیں مشکلات سے نکالا، مگر جب میرا دین مشکل میں تھا، اس وقت بے پرواہ ہو کر اپنی دنیا میں مگن رہے۔تمھاری راتوں کی نینداور دن کا چین متاثر نہیں ہوا۔جاؤ آج تمھارے لیے میرے پاس سوائے محرومی کے اور کچھ نہیں۔

کتنا عجیب ہے یہ تصور کل رکھنے والا انسان اور کتنی عجیب ہوگی اس کی وہ ابدی محرومی جو اسے روز قیامت ملے گی۔

اصلی مومن

دین اسلام کی بنیاد ایمانیات پر ہے۔ ایمانیات کا پہلا جز اس بات کو ماننا ہے کہ اس دنیا میں انسان کا ایک خالق و مالک ہے جس نے ہر شے کو پیدا کیا ہے۔ انسان کو تنہا اسی معبود کی عبادت کرنی چاہیے اور اس کی پسند کی راہ پر چلنا چاہیے۔ اس ایمان کا دوسرا جز اس بات کو ماننا ہے کہ خدا ہر چند کہ آج غیب میں ہے مگر ایک روز وہ انسانوں کے سامنے آجائے گا۔ یہ وہ دن ہوگا جب تمام انسانوں کو زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اور اس بات کو دیکھا جائے گا کہ انہوں نے گزری ہوئی زندگی میں کیسے اعمال کیے۔ اچھے اعمال والوں کو جنت کی پرفضا وادی میں ہمیشہ کے لیے بسا دیا جائے گا اور بدکاروں کو جہنم کے عذاب میں چھوڑ دیا جائے گا۔

ایمانیات کا تیسرا جز یہ ہے کہ غیب کے اِس زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ انسانوں سے بے تعلق نہیں رہتا، بلکہ انسانوں کو اپنے مرضی سے آگاہ کرنے کے لیے انہی میں سے کچھ لوگوں کو اپنا پیغام پہنچانے کے لیے منتخب کرتا ہے۔ یہ لوگ پیغمبر کہلاتے ہیں جن پر وہ ایک اور مخلوق یعنی فرشتوں کے ذریعے سے اپنا کلام اتارتا ہے۔ پھر یہ پیغمبر اس کلام کو کبھی اپنے الفاظ میں اور کبھی کتابوں کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ لوگ خدا کی مرضی جان سکیں۔

یہی وہ باتیں ہیں جنہیں توحید، آخرت، رسالت، فرشتے اور کتابوں پر ایمان کہا جاتا ہے۔ یہ بظاہر چند الفاظ ہیں، مگر درحقیقت یہ وہ بنیادیں ہیں جن کو ماننے کے بعد انسان کی زندگی بدل جاتی ہے۔ ان کو ماننے والے لوگ ہر چیز سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے اور اسی سے ڈرتے ہیں۔ یہ لوگ اس دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں بناتے بلکہ آخرت کی ابدی کامیابی کے لیے جیتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک ایک عمل ان کے رب کی نگاہ میں ہے اور اس کے فرشتے ان کا ہر عمل ریکارڈ کر رہے ہیں جو ایک روز ان کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ ان کی نظر میں پیغمبروں سے زیادہ کوئی معتبر نہیں ہوتا۔ انسانوں سے تعلق اور خدا کی عبادت کے حوالے سے انبیا ہی ان کا آئیڈیل ہوتے ہیں۔

جس شخص کی زندگی ایمانیات کی بنا پر بدل جائے وہی خدا کے نزدیک اصلی مومن ہے اور جس کی زندگی نہ بدلے وہ خدا کے غضب کا شکار ہوگا، چاہے خود کو کتنا ہی مسلمان سمجھے۔

خزانے کا نقشہ

انسان کہانیوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔خاص طور پر وہ کہانیاں جن میں کسی پوشیدہ خزانے کا ذکر ہوان کہانیوں میں کوئی مہم جو خطرات سے کھیلتا اور مشکلات جھیلتا ہوا اس خزانے تک جا پہنچتا ہے۔اس مہم کے دوران اس کی راہنمائی کے لیے ہمیشہ ایک نقشے کا بھی ذکر ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ نامعلوم منزل تک جا پہنچتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو پوشیدہ خزانے کے حصول کی یہ کہانی انسانی فطرت کے ایک خاص پہلو کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جس کی بنا پر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ دنیا بھر کی ساری نعمتیں اور راحتیں حاصل کرلے۔ یہ سب کچھ مال و دولت کے بغیر نہیں مل سکتا۔خزانے کی کہانی میں یہی مال و دولت عالم شباب میں اس مہم جو کو مل جاتا ہے جو پڑھنے والے کے لیے ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن کہانیاں پسند کرنے والوں بلکہ درحقیقت اکثر انسانوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ خزانے کی کہانی کوئی فلم ،کوئی داستان نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔زندگی کی ایک ایسی حقیقت جس میں مرکزی کردار خود ان کا اپنا ہے۔روز ازل سے خدائے ذوالجلال نے زندگی کی سچی کہانی میں انسان کو مرکزی رول کے لیے منتخب کرلیا تھا۔اس کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ ایک مہم جو کی طرح دنیا کے مصائب و آلام اور راحت وسکون کو نظرانداز کرتا ہوا آگے بڑھے اور جنت کے اس خزانے کو پالے جس کے بعد انسان ہر عیش و آرام کا حقدار اور ہر دکھ وغم سے نجات پالے گا۔

خدا نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے جنت کے پوشیدہ خزانے تک پہنچنے کا ایک نقشہ بھی عطا کیا ہے۔ یہ نقشہ پیغمبروں کی راہنمائی کے ذریعے سے انسان کو ملتا رہا ہے۔اور آخری دفعہ یہ نقشہ قرآن پاک کی شکل میں تحریری طور پر محفوظ کر کے انسانوں کو دے دیا گیا ہے۔اس نقشے میں علامات نہیں بلکہ الفاظ کی شکل میں بتادیا گیا ہے کہ کون لوگ ہیں جو اس خزانے تک پہنچنے میں کامیاب رہتے ہیں۔سیدھا رستہ کیا ہے، اس پر چلنے میں کیا مشکلات آتی ہیں، ان سے کیسے نبرد آزما ہونا ہے،اس راستے کا زاد راہ کیا ہے، راستہ بھٹک جائیں تو کیا کرنا ہے، یہ سب اس میں تفصیل کے ساتھ بتادیا گیا ہے۔

مگر بدقسمتی سے انسان اس نقشے کو چھوڑ کر خواہش کے صحرا اور توہمات کے جنگل میں بھٹک رہے ہیں۔ وہ یہ بھول چکے ہیں کہ وہ عالم زیست میں ایک مہم پر بھیجے گئے ہیں۔ اس مہم میں ان کا مقصد جبلِ زندگی کے اس پار ایک اور دنیا میں موجود فردوس کے خزانے تک پہنچنا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دنیا کے اس جنگل سے وہ محتاط انداز میں گزریں۔ کیونکہ یہاں قدم قدم پر گناہ کی دلدل ہے، ابلیس کے چھوڑے ہوئے شکاری درندے اور نفسانی خواہشات کے اژدہے ہیں۔ انہیں اس جنگل سے اپنا زادراہ تو لینا ہے، مگر اسے اپنا مسکن و مقصد نہیں بنانا۔ جس نے ایسا کیا وہ ابد تک اس جنگل میں بھٹکتا رہے گا۔

خزانے کے اس نقشے کو چھوڑ دینا ہر چند کہ تمام انسانیت کی بدقسمتی ہے، مگر سب سے بڑھ کر یہ ان لوگوں کی بدقسمتی ہے جن کے حوالے کر کے پیغمبر علیہ السلام دنیا سے گئے تھے۔ اس لیے کہ دوسروں کو یہ سب کچھ سمجھانے کی ضرورت ہے، مگر انہیں تو اس بات پر یقین ہے کہ واقعتاً یہ قرآن جنت کے پوشیدہ خزانے کا نقشہ ہے۔ دنیا کے دوسرے لوگ تو کل قیامت کے دن یہ عذر پیش کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس خزانے کا یہ نقشہ نہیں تھا مگر مسلمان قیامت کے دن کیا عذر پیش کریں گے؟

آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ خدا کی کتاب اور ان کے پیغمبر کا دیا ہوا سب سے عظیم تحفہ ان کے پاس موجود ہے، مگر انہیں توفیق نہیں ہوتی کہ وہ اس کو کھول کر پڑھ لیں۔ جنہیں یہ توفیق ہوتی ہے وہ بے سوچے سمجھے اس کو پڑھتے ہیں اور ادب سے کسی بلند مقام پر رکھ دیتے ہیں۔ جو لوگ اس کے سمجھنے کے دعویدار بن کر کھڑے ہوتے ہیں، ان کے لیے یہ بس دنیا میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کا ایک منشور ہے۔ جب مسلمانوں کا یہ حال ہو تو کسی غیر مسلم سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

آج خدا اور انسانوں سے محبت کرنے والے لوگوں کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ انسانوں کو خدا کی اس کتاب کی طرف بلائیں۔ پیغمبر کے اس کلام کی طرف بلائیں۔ اس لیے کہ ہر انسان کے پاس وقت تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ ہر مہم جو کے لیے مہلت عمل ختم ہو رہی ہے۔ اس نے اس نقشے کی مدد سے فردوس کے خزانے کو نہ پایا تو اس کا انجام جہنم کی گہری کھائی ہوگی۔ وہ کھائی جہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رونا ہوگا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلانا ہوگا۔

حضور کی سچائی اور ہماری ذمہ داری

''اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسانوں کے متعلق جو منصوبہ بنایا ہے اور اس حوالے سے جو مطالبات انسانوں سے مطلوب ہیں، ان کی طرف انسانوں کی راہنمائی کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے''۔(الیل 12:92)۔

اس ہدایت کی ایک سطح وہ ہے جس کے لیے فطری ہدایت کا لفظ موزوں ہے کیونکہ یہ ہدایت ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔اس فطری ہدایت کا مقصد یہ ہے کہ ہر انسان خالق اور مخلوق کے بنیادی حقوق جان لے اور ان کے معاملے میں درست رویہ اختیار کر لے۔قرآن نے اس فطری ہدایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ توحید کا تصور روز ازل ہی سے انسانی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔ (اعراف 172:7)۔ اسی طرح ہر نفس انسانی میں یہ بات ودیعت کر دی گئی ہے کہ کن چیزوں کو خیر سمجھ کر اسے اختیار کرنا ہے اور کون سے امور کو شر ہونے کی بنا پر ترک کرنا ہے۔الشّمس (91:2-7)۔اسی ہدایت کا نتیجہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان تمام تر انحرافات کے باوجود ایک برتر ہستی کا اعتراف کرتے اور کسی نہ کسی اخلاقیات کی پیروی ضرور کرتے ہیں۔

لیکن فطرت کی یہ پکار چونکہ خاموش ہوتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی سے انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک زیادہ محکم اور واضح اہتمام بھی کیا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ بعض انسانوں کو منصب نبوت پر فائز کر کے ان پر وحی نازل فرماتے ہیں اور یہ انبیا اللہ تعالیٰ کا پیغام انسانیت تک پہنچاتے ہیں۔اس ہدایت میں نہ صرف اللہ تعالیٰ کے مطالبات صراحت کے ساتھ بیان کر دیے جاتے ہیں بلکہ یہ بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ ایک روز سب لوگ اللہ تعالیٰ کے پاس جمع کیے جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ دیکھیں گے کہ لوگوں نے کیسے اعمال کیے۔جو اچھے اعمال والے ہوں گے ان کو جنت کی عزت اور فردوس کی بادشاہت سے نوازا جائے گا اور برے اعمال والوں کا ٹھکانہ جہنم کی ذلت اور عذاب کی شکل میں ہوگا۔

اس سلسلے کا آخری اہتمام رسالت کا سلسلہ ہے۔ ہر رسول ایک نبی بھی ہوتا ہے جس میں وہ ٹھیک

وہی پیغام بندوں تک پہنچاتا ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ البتہ رسول نبی سے ایک قدم آگے بڑھ کر خدا کی دعوت کی سچائی اس طرح لوگوں پر واضح کر دیتا ہے کہ اس کی حقانیت میں کوئی شک وشبہ نہیں رہ جاتا۔ وہ اس طرح کہ رسول کی دعوت کو نہ ماننے کے نتائج اسی دنیا میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یعنی جن اقوام نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی، وہ دنیا ہی میں تباہ کر دی گئیں۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ ان اقوام کا تذکرہ ہے۔ ان میں قوم نوح، عاد، ثمود، قوم شعیب، قوم لوط اور آل فرعون وغیرہ کا نام بہت نمایاں ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے آخری درجہ میں اپنی ہدایت کے سچا ہونے کا ثبوت پیش کر دیا۔ آپ نبی ہونے کے ساتھ رسول بھی تھے اور اس حیثیت میں آپ کی قوم کے ساتھ وہی ہوا جو دیگر رسولوں کی اقوام کے ساتھ ہوا تھا۔ مگر آپ چونکہ خاتم الانبیا والمرسلین بھی تھے اس لیے آپ کے ذریعے سے رونما ہونے والے اس واقعہ کو آپ کی اپنی لائی ہوئی کتاب یعنی قرآن اور تاریخ کے صفحات دونوں میں قیامت تک کے لیے رقم کر دیا گیا۔

آپ انسانی تاریخ کی واحد شخصیت ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو نبی اور رسول کے طور پر پیش کیا اور تاریخی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اس بات کا مطلب یہ ہے کہ حضور نے دنیا کے سامنے توحید و آخرت کی دعوت پیش کی اور اس دنیا سے رخصت ہونے سے قبل جزیرہ نما عرب میں عملاً توحید کو غالب اور ایک قیامت صغریٰ قائم کر کے یہ بتا دیا کہ آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ آپ کے ذریعے سے توحید اس طرح غالب ہوئی کہ عرب میں توحید کے سوا کوئی دین باقی نہ رہا اور قیامت کا ایک نمونہ اس طرح قائم ہوا کہ آپ کے ماننے والے حکمران بن گئے اور منکرین کے پاس موت اور ذلت کے سوا کوئی راستہ نہ بچا۔ یہ بات مسلمانوں کا عقیدہ ہی نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ یہ تاریخی واقعہ آپ کی رسالت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

ختم نبوت کے بعد اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم آپ کی سچائی کے ثبوت کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ یہی اجتماعی طور پر ہماری سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

اسلام کا نفاذ یا نفوذ

بیسویں صدی کا نصف آخر جدید مسلم تاریخ کا ایک بہت اہم وقت ہے۔ یہ وہ عرصہ ہے جس میں مسلم ممالک نے نوآبادیاتی طاقتوں سے سیاسی آزادی حاصل کر لی تھی اور دنیا بھر میں 50 سے زیادہ مسلم ریاستیں وجود میں آ گئی تھیں۔ اس دور میں مسلمانوں کی مذہبی اور فکری قیادت کا اہم ترین مسئلہ یہ تھا کہ ان ممالک میں دین اسلام کا نفاذ ہو جائے۔ معاشرے سے غیر اسلامی شعائر کا خاتمہ ہو۔ اسلامی سزائیں نافذ ہوں اور اقتدار صالحین کے ہاتھ میں آ جائے۔

چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہر سطح پر بہت زیادہ کام کیا گیا۔ عوام الناس کی ذہن سازی سے لے کر سیاسی تنظیموں کے قیام تک اور فکری و قلمی جہاد سے لے کر حکمرانوں کے خلاف تحریک چلانے تک سارے اقدامات کیے گئے۔ اس کے نتیجے میں بیسویں صدی کے ربع اخیر یعنی آخری پچیس برسوں میں صورتحال تیزی سے بدلی اور بہت سے مسلم ممالک میں اسلام پسند قوتیں برسر اقتدار آ گئیں۔ اسلامی نظام کے نفاذ کا عمل شروع ہوا اور سیکولر عناصر کو پسپائی ہو گئی۔

تاہم اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حکومت کی سطح پر نفاذ اسلام کا تجربہ وہ اثرات و ثمرات نہیں دے پایا جس کے خواب دکھائے گئے تھے۔ اس معاملے میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا یہ اندیشہ بالکل درست ثابت ہوا کہ نفاذ اسلام کا معاملہ ترکش کے واحد تیر کی طرح ہوگا۔ یہ تیر اگر خطا ہو گیا تو پھر نشانے پر لگانے کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔ آج یہ اندیشہ ایک تلخ حقیقت بن کر سامنے آ گیا ہے کہ تیر نشانے سے خطا ہو چکا ہے۔

بدقسمتی سے 80 کی وہ دہائی جس میں پاکستان میں اسلامائزشن کا عمل پوری قوت سے جاری تھا، اسی دہائی میں ہمارے ہاں کرپشن، کلاشنکوف اور ہیروئن کلچر اپنی جڑیں پھیلا رہا تھا۔ 90 کی دہائی تک یہ بات اندھوں کو بھی نظر آنا شروع ہو گئی تھی کہ نظام زکوٰۃ نافذ ہو چکا ہے، مگر اس کے باوجود دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور غربت کا عمل بڑھ رہا ہے۔ حدود نافذ ہیں، مگر زنا اور بدکاری کا زنگ ہمارے نظام اقدار کو بری طرح چاٹنے لگا ہے، آئین میں اسلامی شقیں بڑھ رہی ہیں، مگر عوام میں اسلامی کردار اور

اخلاقی اوصاف کم ہورہے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس معاملے میں اصل غلطی یہ تھی کہ اسلام کو قانون کے ذریعے سے نافذ کرنے کی چیز سمجھ لیا گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ اس غلطی کی اصلاح کی جاتی آج یہ فکری غلطی اتنی بڑھ چکی ہے کہ لوگ قانون کے بجائے ڈنڈے کے زور پر اسلام نافذ کرنے پر اتر آئے ہیں۔ یہ پچھلی غلطی سے بھی زیادہ بڑی غلطی ہے۔ پہلی غلطی کے نتائج تو یہ نکلے تھے کہ منافقت کا مرض عام ہوا تھا۔ اس غلطی کے نتیجے میں تو لوگ علانیہ اسلام سے بغاوت کردیں گے۔ اس لیے اب وقت آ گیا ہے کہ نئی غلطی اور پرانی غلطی پر پوری طاقت کے ساتھ لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے لوگوں کو اس راستے کی طرف بلایا جائے جو صحیح راستہ ہے۔

ہمارے نزدیک اسلام اپنے آپ کو انسانی معاشروں میں نافذ نہیں کراتا بلکہ وہ معاشروں میں نفوذ کر جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اسلام کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ معاشرے کے ثقافتی ڈھانچے میں اپنی رسوم اور آداب داخل کرنا شروع کرتا ہے۔ وہ اپنے دلائل سے اس کے سوچنے والے اذہان کو مسخر کرتا ہے اور اپنی اقدار پر مبنی ایک تہذیبی روایت کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ اس کے بعد قانون کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ مرحلہ تہذیب و ثقافت سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ تمدن کا وہ معاملہ ہوتا ہے جس میں ہر قوم اور ہر گروہ اصولی ہدایات اسلام سے لے کر اپنے دور اور حالات کے مطابق اپنے اجتماعی نظام میں تبدیلی لاتی ہے اور قانون سازی کرتی ہے۔

یہ بات کسی نو مسلم معاشرے کے بارے ہی میں درست نہیں بلکہ ایک ایسے مسلم معاشرے کے بارے میں بھی درست ہے جو صدیوں سے غیر اسلامی تہذیب و ثقافت کے زیر اثر پروان چڑھا ہو۔ پاکستانی معاشرہ بھی درحقیقت ایک ایسا ہی معاشرہ ہے۔ یہاں پر بھی اسلام نافذ نہیں ہوسکتا بلکہ اس سے قبل اس کے نفوذ کی ایک بھرپور مہم شاید کئی عشروں تک چلانا ضروری ہے۔ اس کی اقدار، روایات، رسوم و آداب کو موجودہ ثقافت کے ڈھانچے میں شامل کرنے اور اس کے فکر و نظریہ کو سوچنے والے اور اقتدار رکھنے والے طبقات کے دل و دماغ میں راسخ کرنا ہی اس وقت اصل کام ہے۔ اسلام کے اس نفوذ کے بغیر اس کے نفاذ کا خواب کبھی پورا نہیں ہوسکتا۔

مغرب اور آج کا چیلنج

مرزا غالب(1796-1869)اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ان کی عظمت کا راز صرف ان کی شاعری کے حسن اور بیان کی خوبی ہی میں نہیں ہے۔ان کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے حقائق اور انسانی نفسیات کو گہرائی میں جا کر سمجھتے ہیں اور بڑی سادگی سے عام لوگوں کے لیے بیان کر دیتے ہیں۔غالب جس پر آشوب دور میں پیدا ہوئے اس میں انہوں نے مسلمانوں کی ایک عظیم سلطنت کو برباد ہوتے ہوئے اور باہر سے آئی ہوئی انگریز قوم کو ملک کے اقتدار پر چھاتے ہوئے دیکھا۔غالباً یہی وہ پس منظر ہے جس نے ان کی نظر میں گہرائی اور فکر میں وسعت پیدا کی۔

تاہم بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ غالب نے ایک ایسے پہلو سے مسلمانوں کی راہنمائی کی تھی ، جو اگر مسلمان اختیار کر لیتے تو آج دنیا کی عظیم ترین قوتوں میں ان کا شمار ہوتا۔مگر بدقسمتی سے لوگوں نے شاعری میں ان کے کمالات اور نثر پر ان کے احسانات کو تو لیا،مگر قومی معاملات میں ان کی راہنمائی کو نظر انداز کر دیا۔اور سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ یہ کام اس شخص نے کیا جو خود آنے والے دنوں میں برصغیر کے مسلمانوں کا بہت بڑا رہنما بنا یعنی سرسید احمد خان۔

1855 میں سرسید نے اکبر اعظم کے زمانے کی مشہور تصنیف ''آئین اکبری'' کی تصیح کر کے اسے دوبارہ شائع کیا۔غالب نے اس پر فارسی میں ایک منظوم تقریظ (تعارف) لکھا۔اس میں انہوں نے سرسید کو سمجھایا کہ''مردہ پرورن مبارک کارِنیست''یعنی مردہ پرستی اچھا شغل نہیں بلکہ انہیں انگریزوں سے یہ سبق سیکھنا چاہیے کہ وہ کس طرح فطرت کی طاقتوں کو مسخر کر کے اپنے اجداد سے کہیں آگے نکل گئے ہیں۔ انہوں نے اس پوری تقریظ میں انگریزوں کی ثقافت کی تعریف میں کچھ نہیں کہا بلکہ ان کی سائنسی دریافتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مختلف مثالوں سے یہ بتایا ہے کہ یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔

بدقسمتی سے اس نصیحت کو سرسید نہ سمجھ سکے۔وہ انگریزوں سے متاثر تو ضرور ہوئے،مگر سائنس و ٹیکنالوجی میں ان کی ترقی سرسید کا آئیڈیل نہ بنی۔ بلکہ انگریزوں کی زبان،ان کی معاشرت،ان کے سماجی علوم یہی سرسید کے نزدیک مسلمانوں کے لیے کامل نمونہ تھے۔اِنہی کی تحصیل کے لیے انہوں نے

مسلمانوں کو ابھارا اور اسی مقصد کے لیے ایک زبردست تعلیمی تحریک برپا کی۔ اس کا یہ فائدہ تو بہر حال ہوا کہ مسلمان اس قابل ہو گئے کہ انگریزی معاشرے کے دیگر نظاموں کے ساتھ ان کے نظام سیاست کو سمجھ کر ان سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، مگر بدقسمتی سے اس کے اثرات تہذیبی اور ثقافتی طور پر ان پر بہت برے پڑے۔ مسلم اشرافیہ (Elite) میں انگریزوں کی زبان، لباس، ثقافت، رہن سہن اور اقدار سے مرعوبیت کی نفسیات پیدا ہو گئی۔ بدقسمتی سے آج کے دن تک ہمارے پڑھے لکھے اور صاحب ثروت طبقات اسی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ مغربی تہذیب کے مثبت پہلو مثلاً قانون کی عملداری، سماجی عدل، تحریر وتقریر کی آزادی کا تو چلن ہمارے ہاں آج تک نہیں ہو سکا البتہ انگریزی زبان اور انگریزی طرز زندگی ہمارے ہاں عزت وشرف کا معیار سمجھے جاتے ہیں۔

اس صورتحال میں مزید خرابی ہماری مذہبی قیادت نے پیدا کی ہے۔ انہوں نے نہ صرف شروع ہی سے سرسید سے متضاد طرز فکر اختیار کیا۔ یعنی انگریزوں اور انگریزی تہذیب کے ہر پہلو سے شدید نفرت۔ سرد جنگ کے زمانے میں سیاسی حالات کی بنا پر یہ رویہ کچھ بہتر ہوا تھا مگر 9/11 کے بعد پیدا ہونے والے حالات کے نتیجے میں ایک دفعہ پھر اس ذہنیت کا بھرپور اظہار ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کے لیے درست راستہ اس وقت صرف یہ ہے کہ وہ افراط وتفریط سے بچتے ہوئے ایک درمیانی راستہ اختیار کریں۔ انہیں نہ مغرب سے مرعوب ہونا ہے اور نہ اس سے نفرت کرنی ہے۔ اس وقت مغرب دنیا کا حکمران ہے۔ ان کی تہذیب دنیا کی غالب تہذیب ہے۔ وہ سائنس وٹیکنالوجی کے امام ہیں۔ ان کی اس اہمیت کی بنا پر ان کے ساتھ بڑے تدبر کے ساتھ معاملہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے تین پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ سائنسی علوم اور تمدنی ارتقا میں ان کی ترقی کو کلی طور پر لینا ہمارا نصب العین ہونا چاہیے۔ دوسرے ان کی تہذیب کے وہ پہلو جو ہماری بنیادی اقدار کے خلاف ہیں، ان کو ہر صورت میں اپنے اندر در آنے سے روکنا ہمارا مقصد ہونا چاہیے۔ مثلاً ہماری تہذیب آخرت پسندی، حیا اور حفظ مراتب کے ارکان ثلاثہ پر کھڑی ہے۔ ان پر ہم کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ ان کے درمیان میں جو ثقافتی عناصر ہیں مثلاً زبان وغیرہ ان پر سمجھوتہ کرنا ہماری مجبوری ہے۔ اس حکمت عملی کو اپنائے بغیر ہم اس چیلنج کا سامنا موثر طریقے سے نہیں کر سکتے جو آج ہمیں درپیش ہے۔

تاکہ آنکھوں والے دیکھ سکیں

جماعت ختم ہوئی ۔ میں نوافل ادا کرنے کے لیے پچھلی صف میں آ گیا۔نماز میں میں نے سورہ نبا کی تلاوت شروع کردی۔اس سورت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان گنت احسانوں میں سے کچھ کا ذکر کرکے یہ فرمایا ہے کہ اگر ہم تمہیں اس طرح نعمتیں دے رہے ہیں تو جان لو کہ ایک دن ہم ان نعمتوں کا حساب بھی کریں گے اور یہ فیصلے کا دن آ کر رہے گا۔

میں نے یہیں تک تلاوت کی اور پھر رکوع میں چلا گیا۔مگر خدا کے سامنے اس رکوع سے سر اٹھانا میرے لیے بہت مشکل ہوگیا۔اس کا سبب یہ تھا کہ رکوع میں میری نگاہ اس لڑکے کے پیروں پر پڑی جو میرے برابر کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔اس کے دونوں پیر ٹیڑھے ہوکر پیچھے کی سمت مڑے ہوئے تھے۔وہ بمشکل اپنا توازن برقرار رکھ کر قیام میں کھڑا تھا۔قرآن میں آنے والے خدا کے الفاظ نے مجھ پر وہ اثر نہیں کیا تھا جو اس منظر نے کردیا تھا۔وہاں بھی خدا کی نعمتوں کا ذکر تھا مگر یہاں میرے سامنے یہ زندہ سوال آ گیا تھا کہ اگر میرے پیر بھی ایسے ہوتے تو زندگی کتنی مشکل ہو جاتی۔

انسان ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی ان گنت نعمتوں میں گزارتا ہے،مگر کبھی اسے یہ یاد نہیں آتا کہ ایک روز پروردگار ان نعمتوں کا حساب کرے گا۔انسانوں کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ معذوروں کی شکل میں ایک زندہ نصیحت ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔حضرت عیسیٰؑ نے اس حقیقت کو اپنے لافانی انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ خدا نے اندھے اس لیے پیدا کیے ہیں تاکہ آنکھوں والے دیکھ سکیں۔مگر انسان ان معذوروں سے صحیح سبق حاصل کرنے کے بجائے انہیں نظر انداز کردیتے ہیں یا بہت ہوا تو ان پر ترس کھاتے ہیں۔حالانکہ انسانوں کو ترس اپنے اوپر کھانا چاہیے۔کیونکہ ان معذوروں کو خدا کے احتساب سے نہیں گزرنا ہوگا۔احتساب ہمارے جیسے لوگوں کا ہوگا۔

بدنصیب یہ معذور اور محروم لوگ نہیں۔اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے کام میں استعمال ہو رہے ہیں اور اگر یہ صبر کریں گے تو یہ اپنا اجر بلاحساب کتاب پالیں گے۔بدنصیب وہ ہیں جو انہیں دیکھ کر بھی نہ سنبھلیں، کیونکہ قیامت کے بعد شروع ہونے والی زندگی میں انہیں ہمیشہ کے لیے معذور کردیا جائے گا۔

خدا کا ہاتھ

اس کے ہاتھ نے اپنی ماں کے پلو کو تھام رکھا تھا۔ چھوٹا سا ہاتھ ......کمزور سا ہاتھ...... معصوم سا ہاتھ۔ یہ بچہ سال بھر کا بھی نہیں ہوگا۔ باپ آگے بیٹھا موٹر بائیک چلا رہا تھا اور اس کے پیچھے ماں اپنے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے موٹر بائیک کی سیٹ کو اور دوسرے ہاتھ سے بچے کو پکڑ رکھا تھا۔ اس پورے منظر میں میرے لیے کوئی نئی بات نہ تھی سوائے اس چھوٹے سے ہاتھ کے...... جس نے ماں کے پلو کو پکڑ رکھا تھا۔

میں نے سوچا کہ اگر اس بچے کی ماں اپنے ہاتھ کی گرفت برقرار نہ رکھ سکے تو کیا یہ چھوٹا سا ہاتھ، یہ معصوم سی مٹھی، اتنی طاقتور ہے کہ خود کو گرنے سے روک سکے۔ میرے ذہن نے کہا، ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ بچہ نہیں بلکہ ماں ہے جو اسے سنبھالے ہوئے ہے''۔

میں اس سے قبل گرمی کے روزوں کی مشقت اور اس کے اجر پر غور کر رہا تھا، مگر اس منظر کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ جہنم کے گڑھے میں ہمیں گرنے سے اگر کوئی بچا سکتا ہے تو وہ ہماری عبادت کا کمزور ہاتھ نہیں بلکہ پروردگار کی رحمت کا طاقتور ہاتھ ہے۔ جنت کی منزل تک ہماری رسائی ہو ہی نہیں سکتی اگر مالک دو جہاں کا شفقت بھرا ہاتھ ہمیں نہ سنبھالے ہوئے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ساری مذہبیت اور عبادات بھی دراصل خدا کی دی ہوئی توفیق کی مرہون منت ہیں۔ اسی نے ہماری ساری دینداری کا بھرم رکھا ہوا ہے۔ وہ اگر ہم پر مطالبات اور آزمائشوں کے بوجھ ڈال دے تو ہماری ساری دینداری کی پول کھل جائے گی، (محمد 34:47)۔

میں نے سر اٹھایا اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ روزہ داروں نے روزہ کی مشقت اٹھا کر تیرا قرب چاہا ہے۔ لیکن یہ مشقت اس بچے کے کمزور ہاتھ سے زیادہ نہیں جس نے اپنی ماں کا دامن پکڑ رکھا تھا۔ ماں کے ہاتھ کو بچے کا سہارا بنانے والے، اپنے طاقتور ہاتھ کو آگے بڑھا دے۔ وگرنہ دنیا کی کوئی طاقت ان بندوں کو جہنم سے نجات اور جنت کی کامیابی کا حقدار نہیں بنا سکتی۔

دایاں ہاتھ

ہالینڈ کے سائنسدانوں کی ایک تحقیقی رپورٹ میں اس بات کا انکشاف کیا گیا ہے کہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے والی خواتین کی شرح اموات مختلف وجوہات کی بنا پر دائیں ہاتھ سے کام کرنے والوں کی بنسبت 40 فیصد زیادہ ہوتی ہے۔ان وجوہات میں کینسر، دل کے امراض اور دماغ کو خون کی فراہمی میں رکاوٹ شامل ہے۔مزید یہ بھی کہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے افراد جو دنیا کی کل آبادی کا دس فیصد ہیں،ان کی اوسط عمر بھی دائیں ہاتھ سے کام کرنے والوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔

یہ رپورٹ پڑھنے والے کو دین کی اس تعلیم کی یاد دلاتی ہے جس کے مطابق ہر مسلمان کے لیے یہ سنت مقرر کی گئی ہے کہ وہ کھانا کھائے تو سیدھے ہاتھ سے کھائے اور اللہ کا نام لے کر کھائے۔یہی نہیں بلکہ زندگی کے دیگر بہت سے اعمال بھی سیدھے ہاتھ سے کرنا ایک پسندیدہ چیز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ اگر مقرر کیا ہے تو یقیناً اس کے بہت سے دنیوی فائدے بھی ہوں گے، جس کی ایک مثال اس رپورٹ میں سامنے آئی ہے۔لیکن دین کی یہ تعلیم اصل میں انسان کو قیامت کے دن کی پیشی یاد دلانے کے لیے مقرر کی گئی ہے۔قیامت کے دن جب نیک لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے اعمال کے ساتھ پیش ہوں گے تو ان کا نامہ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔یہ اس بات کا ایک علامتی اظہار ہوگا کہ انہیں جنت کی ابدی کامیابی کی بشارت دے دی گئی ہے اور جہنم کے عذاب سے ہمیشہ کے لیے بچالیا گیا ہے۔

اس دنیا میں انسان کی زندگی کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد ہونا چاہیے۔وہ یہ کہ جب قیامت کے دن ختم نہ ہونے والی ابدی زندگی کا آغاز ہو تو اس کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے۔جسے پا کر وہ جان لے کہ اب اس کی زندگی خوشیوں کی وہ داستان ہوگی جس میں کبھی دکھ،غم، بیماری،موت، بڑھاپا، محرومی اور مایوسی نہیں آئے گی۔داہنے ہاتھ کا استعمال کچھ اور نہیں، زندگی کے اسی مقصد کی یاد دہانی ہے۔یہ جنت کے شوق کا اظہار ہے۔یہ خدا سے اس کی رحمت کی درخواست ہے۔

صرف نیک لوگوں کے لیے لکھا گیا مضمون

نیک لوگ بالعموم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک وہ جنہیں ان کی نیکی،تقویٰ اور پارسائی نے خدا کی معرفت سے نوازا ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جن کی عبادت وریاضت، فضل وکمال اور منصب ومرتبہ نے انہیں خدا سے زیادہ اپنی ذات کا عرفان بخشا ہوتا ہے۔ظاہری سیرت وکردار کے اعتبار سے اکثر دونوں گروہ ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں۔لیکن بعض اوقات ایسے حالات پیش آجاتے ہیں جو کسوٹی بن کر یہ فیصلہ کردیتے ہیں کہ کونسا گروہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا مستحق ہے اور کونسا گروہ اس کے غضب کا حقدار ہے۔

اس طرح کے حالات پیش آنے کی ایک صورت وہ ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کی موجودگی میں اوران کے سامنے کسی ایسے شخص کو بلند مرتبہ عطا کرے جس سے یہ خود کو برتر خیال کرتے ہوں۔اگر یہ نیکوکار پہلے گروہ سے ہوتا ہے تو اس کا ذہن فوراً خدا کی بے حساب بخشش اور عطا کی طرف مڑ جاتا ہے۔وہ منہ کے بل اپنے مالک کے حضور گر پڑتا ہے۔اس کی زبان سے معرفت کے اعلیٰ ترین کلمات نکلتے ہیں۔اس کے زمین بوس وجود سے وہ دعائیں نکلتی ہیں جو آسمان کا سینہ چیرتی ہوئی عرشِ قبولیت تک جا پہنچتی ہیں۔اس کا عجز بارگاہِ ربوبیت میں اس طرح ملتجی ہوتا ہے کہ مالک تونے اپنی کتاب میں یہ سکھایا ہے کہ جب حقداروں کو حق دیا جارہا ہو اور ایسے میں کوئی سوالی آجائے تو اسے بھی ازراہِ عنایت کچھ نہ کچھ دے دینا چاہیے۔مولیٰ تونے اپنے اس بندے کو جو کچھ دیا یقیناً اپنے علم وحکمت کی بنا پر دیا ہے۔لیکن اس تقسیم کے وقت میں بھی ایک سائل بن کر تیری بارگاہِ کرم میں حاضر ہوگیا ہوں۔اے رب تو مجھے وہ کچھ بلا استحقاق دیدے جو تو دوسروں کو استحقاق کی بنیاد پر دیتا ہے۔

خدا کی شانِ کریمی یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ جس کرم کی اس نے دوسروں کو تلقین کی ہے وہ خود اس کا اظہار نہ کرے۔ چنانچہ پھر اللہ کی رحمت مانگنے والے پر برستی ہے اور اس طرح برستی ہے کہ دنیا دیکھتی ہے۔مانگنے والے کی جھولی عطا و بخشش کے خزانوں سے بھردی جاتی ہے۔خدا کے سامنے ذلیل ہونے والا انسانوں کے سروں کا تاج بنادیا جاتا ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہے عنایت کرے۔ بیشک اللہ بہت بلند اور بڑا صاحبِ جود وکرم ہے۔

اس کے برعکس دوسری قسم کے نیکوکاروں کے سامنے پیش آنے والا ایسا کوئی بھی واقعہ ان کے قصرِ پندار پر حملے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ ان کے مینارۂ عظمت کو زمین بوس کردیتا ہے۔خدا کی بخشش ہمیں

چھوڑ کر دوسرے کی طرف متوجہ ہو، ان کا نفس یہ گوارہ نہیں کرسکتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کے دل میں اس شخص کے خلاف حسد، بغض اور عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کا تکبر انہیں اللہ المتکبر سے بھڑا دیتا ہے۔ اس کا تو خیر کیا بگڑنا ہے، حسد و تکبر کی یہ آگ ان کا اپنا نشیمن جلا ڈالتی ہے۔ خدا کا قہر ان پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہ بارگاہِ رب سے مردود کر دیے جاتے ہیں۔

ان دونوں قسم کے نیکوکاروں کی مثال قران میں بیان ہوئی ہے۔ پہلے گروہ کی مثال سیدنا ذکریا علیہ السلام کی شخصیت ہیں۔ وہ اپنے وقت کے نبی اور آل یعقوبؑ کی وراثت کے حامل تھے۔ اس کے ساتھ وہ حضرت مریمؑ کے خالو اور ان کے متولی بھی تھے۔ انہوں نے جب حضرت مریمؑ کے پاس خدا کا خصوصی رزق اترتے دیکھا تو یہ نہیں سوچا کہ کل کی اس لڑکی پر جو خود ان کی نگرانی میں تھی خدا کا یہ احسان کیوں ہوا اور ان پر خدا کی یہ عنایت کیوں نہیں ہوئی؟ بجائے اس کے کہ وہ اس لڑکی سے حسد کرتے انہوں نے فوراً اپنا رخ خدا کی طرف کر دیا۔ اپنے وجود کی تمام تر بے کسی کے ساتھ انہوں نے اپنی خالی جھولی خدا کے سامنے پھیلا دی۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ عطا نے ان کی جھولی منہ مانگی مراد سے بھر دی۔ جو اسباب ہوتے ہوئے عمر بھر نہ دیا وہ آج سارے اسباب منقطع ہونے کے بعد دے دیا۔ اس حال میں کہ خود بوڑھے اور بیوی بانجھ ہو چکی تھی۔ اور دیا بھی تو یحییٰ جیسا جلیل القدر نبی جس کی تعریف میں خود اس نے سردار، پاکباز اور نبی صالح کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر قرآن میں مریم و عیسیٰ کے تذکرے کے ساتھ زکریا اور یحییٰ کا ذکر کر کے اس واقعے کو ابدی زندگی دیدی۔

دوسرے گروہ کی نمائندہ مثال ابلیس ہے۔ خدا نے اس کے سامنے آدمؑ کو خلیفہ بنایا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ خدا کے حکم کے آگے سجدے میں گر پڑتا۔ مگر تکبر اور حسد کی آگ نے اسے اندھا کر دیا۔ اس کی نگاہ میں اصل اہمیت صرف اپنی ذات کی تھی۔ اس لیے اس معاملے کو وہ اپنا اور آدم کا معاملہ سمجھا۔ وہ جان نہ سکا کہ یہ دراصل اس کا اور خدا کا معاملہ ہے۔ اس نے خدا کا فیصلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے خدا سے بغاوت کر دی۔ چنانچہ خدا کا غضب بھڑکا اور اس طرح بھڑکا کہ وہ کائنات کا واحد بدنصیب بن گیا جس نے خدا کے سامنے کھڑے ہو کر معافی مانگنے کے بجائے سرکشی کی مہلت مانگی۔

یہ مضمون صرف نیک لوگوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جن کے لیے نیکی کی راہ آسان کر دی گئی ہے۔ تاکہ وہ اس آسان راہ کی مشکل گھاٹی کو جان لیں۔ وہ جان لیں کہ نیک ہونے میں کوئی بھلائی نہیں۔ اصل بھلائی خدا کے لیے نیک ہونے میں ہے۔

صادق وامین کا ماڈل

ایک زمانہ تھا کہ ہمارے معاشرے میں کسی شخص کی دینداری کے بیان کے لیے صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونے کے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔اس کا مطلب یہ تھا کہ فلاں مرد وعورت اتنا نیک ہے کہ نماز اور روزے کا اہتمام کرتا ہے۔اس کے بعد آہستہ آہستہ معاشرے میں کام کرنے والے دینی افراد کی فکر کا غلبہ ہونا شروع ہوا۔جس کے نتیجے میں دینداری کی تعریف مزید ترقی کرتی گئی۔اب دینداری کی سند حاصل کرنے کے لیے صرف صوم وصلوٰۃ کی پابندی کافی نہیں بلکہ دیندار معاشرے میں وہ شخص کہلانے لگا جو شرعی حلیہ اختیار کرے۔اس میں ایک مشت سے بڑی داڑھی، اونچی شلوار ، سر پر ٹوپی اور خواتین کے لیے برقعے و پردے کا اہتمام نیز تصویر اور موسیقی سے مکمل پرہیز شامل ہے۔

ہمارے معاشرے میں پچھلی کئی دہائیوں میں دینداری کی اس تعریف میں نہ صرف مذکورہ بالا چیزیں ، جن کا اہتمام مشکل ہے، شامل ہوئی ہیں بلکہ ان کا اہتمام کرنے والے لوگ بھی بڑھتے چلے جارہے ہیں۔عوام الناس ہی میں نہیں بلکہ معاشرے کے ان طبقات میں بھی اس دینداری کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے جہاں کبھی بھی دینداری اور تقویٰ کی رسائی آسان نہیں تھی۔ ہمارا اشارہ نوجوان لڑکے لڑکیوں اور صاحب ثروت افراد کی طرف ہے۔آج ہمارے معاشرے میں نوجوان لڑکیوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو اپنی مرضی اور شوق سے پردے کا اہتمام کرتی ہیں۔اسی طرح نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد سر پر ٹوپی اور عمامے کا تاج سجائے اور چہرے کو داڑھی کے نور سے مزین کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بھی ایسے نوجوانوں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے جو ان چیزوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی طرح معاشرے کے دولتمند طبقات میں بھی اس دینداری کے اثرات میں اضافہ ہوا ہے۔ بڑے بڑے تاجر اور ان کی بیگمات دینی تنظیموں سے وابستہ ہیں اور ان کی اعانت کرتے ہیں۔ معاشرے کے جو طبقات اور لوگ ان چیزوں کا اہتمام نہیں بھی کرتے ان کے نزدیک بھی یہ تو مسلم ہے کہ دینداری اگر کچھ ہوتی ہے تو یہی ہوتی ہے۔

ایک طرف یہ صورتحال ہے اور دوسری طرف رشوت، بدعنوانی، ملاوٹ، جھوٹ، وعدہ خلافی، حسد، تکبر، بددیانتی، فرائض سے غفلت، منافقت، ہوس زر، دنیا پرستی اور ان جیسی دیگر برائیوں کا معاملہ ہے جو معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ عام لوگ نہ صرف بڑی تعداد میں ان برائیوں کا شکار ہیں بلکہ مذکورہ بالا دیندار لوگ بھی اکثر ان عیوب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ موسیقی کے بارے میں بڑے محتاط لوگ دولت کی جھنکار کے پیچھے ہر اخلاقی حد کو عبور کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ تصویر کے معاملے میں حساس لوگوں کی اخلاقی تصویر اتنی بھیانک ہے کہ دنیا کے ہر آئینے کو سیاہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ داڑھی ٹوپی برقعے اور اونچی شلواروں والے لوگ بھی غیبت، جھوٹ، وعدہ خلافی، تکبر، حسد اور ریاکاری کو اپنا معمول بنائے ہوئے ہیں۔

ہمارے اس تجزیے کا مقصد یہ نہیں کہ ان کے نیکی کے معیارات ہی ان کے اخلاقی عیوب کی وجہ ہیں۔ ہرگز نہیں بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہاں دینداری کا معیار کچھ ظاہری چیزیں قرار پا گئی ہیں۔ لوگ انہی کے بارے میں حساس رہتے ہیں اور جن اخلاقی چیزوں کی حیثیت دین میں مقاصد کی ہے وہ نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو چکی ہیں۔

دوسری طرف جو ہستی دین کے معاملے میں ہمارے لیے رول ماڈل ہے اس کی نیکی کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ تھی کہ آپ ایمان و اخلاق کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز اور بہترین اخلاق کے حامل تھے (القلم 4:68)۔ پچھلے صحیفوں میں آپ کی پیش گوئی آپ کی جن خصوصیات کے ساتھ کی گئی تھی ان میں آپ کی صفات اور سیرت کے حوالے سے سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ یہ شخص الصادق والامین ہوگا (مکاشفہ 11:19)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین مخالف بھی آپ کی اخلاقی حیثیت کے معترف تھے۔ لوگ آپ کے دشمن ہو گئے لیکن امانتیں آپ کے پاس رکھواتے۔ وہ آپ کے پیغام کو نہیں مانتے تھے مگر کہتے تھے کہ یہ صاحب جھوٹ نہیں بولتے۔ وہ آپ کو اللہ کا رسول ماننے کے لیے تیار نہ تھے مگر انہیں یقین تھا کہ آپ کی بارگاہ میں کوئی مقدمہ پیش ہوا تو آپ اس کا فیصلہ عین عدل پر کریں گے۔

آپ کی سیرت اگر آپ کی ذات کا بیان ہے تو قرآن آپ کی تعلیمات کا بیان ہے۔ یہ قرآن جب کبھی اپنے مطلوب کردار کا بیان کرتا ہے تو اس میں صرف اور صرف ایک اعلیٰ ترین اخلاق کے انسان کی تصویر ہی سامنے آتی ہے۔ نہ کہ وہ تصویر جو آج دین کے نام پر پیش کی جاتی ہے۔

اس پس منظر میں یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اگر ہم لوگوں کو حساس بنانا چاہتے ہیں تو انہیں ظاہری اعمال میں حساس بنانے سے پہلے اس قرآنی ماڈل کے معاملے کو حساس بنائیں جو حضور کی سیرت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ ماڈل الصادق والامین کا ماڈل ہے۔ یہ ماڈل حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں یکساں طور پر ادا کرتا ہے۔ یہ ماڈل اگر نماز روزے کا پابند ہوگا تو بددیانتی اور ہوس زر سے بھی پاک ہوگا۔ یہ اگر عریانی اور فحاشی کو ناپسند کرے گا تو غیبت، رشوت، حسد، جھوٹ اور وعدہ خلافی سے بھی بھاگے گا۔ یہ ماڈل ہر حال میں پورا تولے گا۔ عدل کرے گا۔ رب سے ڈرے گا اور بندوں پر رحم کرنے والا ہوگا۔

اگر سوسائٹی کو اچھا بنانا ہے، اگر معاشرے میں عدل وفلاح کو عام کرنا ہے، اگر جہنم کی آگ سے لوگوں کو بچانا ہے، اگر جنت کی وادی کو عبادالرحمٰن سے آباد کرنا ہے تو لوگوں کو الصادق والامین بنایئے۔ لوگوں کو ان کے اخلاقی لباس کے بارے میں، ان کی اخلاقی تصویر کے بارے میں حساس بنایئے۔ انہیں بتایئے کہ متکبر جنت میں نہیں جاسکتا۔ مومن جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ جس میں عہد نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔ حسد نیکیوں کو اس طرح جلاتی ہے جیسے آگ لکڑیوں کو۔ ہوس زر اور دنیا پرستی میں مبتلا درہم ودینار کے بندے پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔ غیبت زنا سے بدتر جرم ہے۔ بہتان انسان کی عمر بھر کی کمائی کو ختم کردیتا ہے۔ رشوت لینے اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔

اللہ کے بندوں پر انفاق کرنے والا، پڑوسیوں سے اچھا معاملہ کرنے والا، غریبوں یتیموں کے سر پر دست شفقت رکھنے والا، والدین اور رشتہ داروں کے حقوق پورے کرنے والا مخلوق خدا پر رحم کرنے والا الصادق والامین ماڈل ہی آج سب سے بڑھ کر ہماری ضرورت ہے۔ یہی وہ ماڈل ہے جو ہم دینداروں کا مطلوب ہونا چاہیے۔

مغرب کی نفرت

مسلمان پچھلی کئی صدیوں سے اہل مغرب کے ساتھ تصادم کی حالت میں ہیں۔حالیہ برسوں میں یہ تصادم ایک نئی شدت کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہے۔اس کا ایک نتیجہ بدقسمتی سے یہ نکلا ہے کہ مسلمان اہل مغرب سے ایک عمومی نفرت کا شکار ہو چکے ہیں۔خاص کر مسلمان اہل قلم اوراہل علم کی ایک بڑی تعداد صرف اہل مغرب کی برائیوں اورعیوب کو نمایاں کر کے ان کے خلاف لوگوں میں نفرت پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔

اس طرح کی کوششیں صلیبی جنگوں کے دوران میں خود عیسائیوں نے بہت کی تھیں اور وہ اپنی قوم میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے،مگراس نفرت کے سہارے وہ مسلمانوں سے جیت نہیں سکے تھے۔اس لیے کہ ان کے مقابلے میں موجود مسلمان اخلاقی طور پراور علمی طاقت کے اعتبار سے ان سے بہت بہتر تھے۔اورایک ایسی قوم کو صرف نفرت کے سہارے شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔آج یہی معاملہ اہل مغرب کا ہے۔وہ نہ صرف علمی طور پر بلکہ اجتماعی اخلاقیات کے اعتبار سے بھی ہم سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔

اس کا ایک اظہار حالیہ دنوں میں اس وقت ہوا جب ریاست نیوجرسی کے گورنر ایک حادثہ میں زخمی ہوئے۔حادثہ کا سبب تیز رفتاری اور سیٹ بیلٹ نہ باندھنا تھا۔چنانچہ نہ صرف انھوں نے عوام سے معافی مانگی بلکہ چالان بھی کٹوایا۔مزید یہ کہ اسپتال کے اٹھارہ دنوں کے علاج کا لاکھوں ڈالر کا بل بھی سرکاری خزانے کے بجائے اپنی جیب سے دیا۔

جس قوم کا اخلاقی نظام اتنا مضبوط ہو،اسے کسی قوم کی نفرت شکست نہیں دے سکتی۔آج مسلمانوں کو اگراہل مغرب سے جیتنا ہے توانہیں اخلاقی میدان میں بلند ترین سطح پرآنا ہوگا۔جب تک مسلمان یہ نہیں کرتے وہ کبھی اہل مغرب سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔چاہے ان کے قلم کار مغرب کے خلاف کتنا ہی زہراگلیں۔چاہے ان کے عیوب کو کتنا ہی بڑھا چڑھا کے بیان کیا جائے۔

I am a Playboy

پچھلے دنوں میں اپنے دوست اورادارے کے رفیق سلمان علی کے ہمراہ جارہا تھا کہ راستے میں ایک گاڑی تیزی سے ہمارے آگے سے گزری۔اس گاڑی کے عقبی شیشوں پر بہت نمایاں اورواضح انداز میں دو جملے لکھے ہوئے تھے جو کچھ اس طرح تھے۔

I am a Playboy

Girls are my toy

یہ دوسطریں پڑھ کر ہم دونوں دنگ رہ گئے۔ہماری حیرت ان جملوں کے مفہوم سے زیادہ لکھنے والے کے حوصلے پر تھی کہ اس نے اپنی گاڑی پر یہ جملہ ایک چلتے پھرتے اشتہار کی شکل میں لکھ رکھا تھا۔ ہمارے معاشرے میں بدکردار ہونا شائد کوئی بہت بڑی بات نہ ہو مگر اس کا اس طرح علانیہ اظہار کرنے کارواج ابھی تک نہیں پڑا۔مگر یہ پڑھ کر لگتا تھا کہ اب اس رواج کے دن بھی گنے جا چکے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں سانحہ یہ ہے کہ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اپنی حد کو عبور کر کے دوسروں پر زبردستی دین نافذ کرنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔وہ دوسرے لوگوں کو بالجبر برائیوں سے روکنا چاہتے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ رویہ نہ دین کا مطالبہ ہے اور نہ معاشرہ اسے قبول کرسکتا ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اجتماعی خیر وشر سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے کام سے کام رکھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ایسے لوگوں کی دینداری کی آخری حد نماز روزہ کی پابندی ہوتی ہے اوران کے اردگرد جو کچھ ہورہا ہوتا ہے وہ اس سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔وہ اپنے قریبی لوگوں کے ایسے رویوں کی بھی اصلاح نہیں کرتے جن کے اخلاقی ،معاشرتی اور مذہبی طور پر برا ہونے میں کوئی دوآرا نہیں پائی جاتیں۔جب نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو پھر لوگ حیااوراخلاق کے ہر جذبے سے عاری ہوکر اپنی بے لگام حیوانی خواہشات کا اسی طرح اعلان کرنے لگتے ہیں۔یہ اعلانات کسی فرد کی آزادی کا نام نہیں بلکہ معاشرے کے اجتماعی ضمیر پر ایک طمانچہ ہیں۔ جو قوم ایسے طمانچے کھانے پر تیار ہو جائے وہ ایک ایک کر کے ساری اخلاقی خصوصیات سے محروم ہو جاتی ہے۔

صرف 6500

زبیر زندانی میرے بڑے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ میرے رسالے کے ایک مستقل قاری بھی ہیں۔ پچھلے دنوں وہ مجھ سے ملنے تشریف لائے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ رسالے کے مضامین پڑھ کران میں خود بھی غور وفکر کرنے کی عادت پیدا ہوچکی ہے۔ وہ اس دنیا میں پیش آنے والے واقعات کی کھڑکی سے آخرت کی دنیا کا نظارہ کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

مثال کے طور پر انہوں نے اپنا ایک واقعہ سنایا۔ وہ ایک کاروباری شخص ہیں اور اکثر لوگوں کے ساتھ رقم کا لین دین لگا رہتا ہے۔ ایک روز انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ انہیں بینک کے اکاؤنٹ کا بیلنس معلوم کر کے بتائے۔ کچھ دیر میں انہیں بتایا گیا کہ اس وقت اکاؤنٹ میں صرف 6500 روپے ہیں۔ یہ بات ان کے لیے قطعاً غیر متوقع تھی۔ وہ جس سطح پر کاروبار کرتے ہیں، اس کی وجہ سے انہیں گمان تھا کہ اس وقت اکاؤنٹ میں کافی رقم ہوگی۔ یہ وہ وقت تھا جب انہیں اپنے اسٹاف پر شدید غصہ بھی آ سکتا تھا جس کی بدانتظامی کی وجہ سے یہ صورتحال پیدا ہوئی تھی۔ مگر اس کے بجائے ان کا ذہن ایک دوسری طرف مڑ گیا۔ انہوں نے سوچا کہ میں ہر برس عمرہ کرتا ہوں۔ نماز، روزہ، انفاق اور اخلاق کے تقاضوں بھی پورا کرتا ہوں۔ اس بنا پر میں اپنے خیال میں آخرت کے لیے میں کافی سرمایہ جمع کر رہا ہوں۔ لیکن اگر ایسا ہوا کہ کل قیامت کے دن میرے اکاؤنٹ میں صرف "6500" ہی نکلے تو میں کیا کروں گا۔ یہ سوچ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ کافی دیر تک ایک خاص کیفیت میں رہے۔

دورِ جدید کی مذہبیت نے انسان کا جو ذہن بنایا ہے اس میں انسان صرف اپنی نیکیوں کو ہی گنتا رہتا ہے۔ وہ اس کیفیت سے محروم رہتا ہے، جس میں بندہ سب کچھ کر کے بھی خود کو کچھ نہیں سمجھتا۔ مگر یہی وہ کیفیت ہے جو دعا وزاری میں ڈھل کر انسان کو خدا سے قریب کرتی ہے۔

غور وفکر پر مبنی یہی وہ دینداری ہے جو خدا کو اصل مطلوب ہے۔ مگر بدقسمتی سے ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں میں شائد آج ایسے دیندار 6500 بھی نہیں ہوں گے۔

سوچ اور عمل

''دو تہائی شب گزر چکی تھی اور میں تہجد کی نماز پڑھ رہا تھا۔نماز کے بیچ میں میں پانی پینے کے لیے اٹھا۔ والدہ کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے خیال آیا کہ دیکھ لوں انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔اندر جھانکا تو محسوس ہوا کہ ان کے کمرے میں بہت ٹھنڈ ہورہی ہے۔ میں انہیں چادر اڑھانے لگا تو ان کی آنکھ کھل گئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔انہوں نے کہا کہ بیٹا میں آج گولی کھانا بھول گئی ہوں، اس لیے ٹانگوں میں درد ہورہا ہے۔ میں ان کی ٹانگیں دبانے وہیں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اطمینان سے سوگئیں تو میں اٹھنے لگا اور اسی عمل میں میرا چشمہ میرے گھٹنے تلے آکر ٹوٹ گیا جو میں نے اتار کر نیچے رکھ دیا تھا۔''

وہ سانس لینے کے لیے لمحہ بھر رکے تو میں نے کہا کہ یہ تو آپ کے ساتھ بہت بری ہوئی۔آپ کو یہ خیال نہیں آیا کہ میں اعلیٰ ترین درجے کی نفلی عبادت میں مشغول تھا- ایک طرف نماز تہجد اور اس کے ساتھ ماں کی خدمت- وہ بھی ان کی تکلیف کے لمحات میں۔لیکن آپ کو اس کا کچھ اچھا بدلہ نہیں ملا۔

وہ دوبارہ گویا ہوئے،''ہاں لمحے بھر کو یہ خیال آیا تھا،مگر پھر مجھے محسوس ہوا کہ نئے چشمے کا یوں ٹوٹ جانا کوئی نقصان نہیں، بلکہ نقد انعام ہے۔یہ میری عبادت کی قبولیت کی نشانی ہے۔ بظاہر میرا نظر کا چشمہ ٹوٹا ہے،مگر اس کے بدلے میں مجھے وہ نظر عطا کردی گئی جو شب کی سیاہی میں مجھے جنت کا روشن نظارہ کرارہی ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ اگلے ہفتے مجھے ایک بہت بڑا حادثہ پیش آیا،لیکن اللہ تعالیٰ کی عنایت سے مجھے کوئی خاص نقصان نہ پہنچا۔ میں اُس لمحے اگر منفی اندازِ فکر کا شکار ہوجاتا تو خدا سے بدظن ہوکر اپنی محنت ضائع کر بیٹھتا اور دنیا اور آخرت کی نہ جانے کتنی بھلائیوں سے محروم ہوجاتا۔''

وہ اپنی بات ختم کرکے کمرے سے باہر نکلنے کے لیے اٹھے، دروازے کے قریب پہنچ کر وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھہرے اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔''اس دنیا میں جتنا اہم تمھارا عمل ہے، اس سے کہیں زیادہ اہم تمھارے سوچنے کا انداز ہے۔زندگی کا ہر اطمینان اور خوشی مثبت انداز فکر میں پوشیدہ ہے۔ جس شخص کے پاس مثبت سوچ کا سرمایہ نہیں اس کا کوئی عمل اسے خوشی اور کامیابی نہیں دے سکتا۔''

قصرالزہرہ

عبدالرحمٰن ثالث اسپین کا ایک عظیم حکمران تھا۔ وہ 300ھ میں اس وقت اقتدار میں آیا جب اسپین کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوکر یورپ کی مسیحی طاقتوں کا نوالہ بننے والی تھی۔ مگر نصف صدی کے اس کے اقتدار کے بعد 350ھ میں جب اس کا انتقال ہوا تو اسپین یا اندلس پورے یورپ سے زیادہ طاقتور اور دنیا کی خوشحال ترین ریاست بن چکی تھی اور یہاں مسلم اقتدار مزید 500 برس قائم رہا۔

عبدالرحمٰن کے عہد میں اسپین عظمت اور ترقی کے جس مقام پر پہنچا اس کا ایک اظہار وہ محل ہے جو اس نے اپنی بیوی زہرہ کے لیے قرطبہ کے نزدیک بنوایا۔ یہ محل جس کا نام قصرالزہرہ تھا، 12 مربع میل کے رقبے پر پھیلا ایک شہر جتنا وسیع تھا۔ اس میں 15000 بلند اور شاندار دروازے تھے۔ اس کی تعمیر کے لیے دنیا بھر سے اعلیٰ تعمیری سامان منگوایا گیا اور بے دریغ سونا چاندی، ہیرے جواہرات اور انتہائی شفاف سنگ مرمر کا استعمال کیا گیا تھا۔ دس ہزار معماروں نے دن رات کام کرکے اس محل کو 25 برس میں مکمل کیا۔ اس کے تعمیری حسن، صناعی اور دلکشی کو دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے لوگ آتے تھے اور اپنے زمانے میں اس سے زیادہ بہتر تعمیر دنیا میں موجود نہ تھی۔ مگر اتفاق کی بات ہے کہ یہ محل جس برس مکمل ہوا اسی سال عبدالرحمٰن کا انتقال ہوگیا۔ اس کی بیوی بھی نہ رہی اور جب مسیحیوں نے قرطبہ پر قبضہ کیا تو قصر الزہرہ کا نام ونشان مٹا دیا۔

خدا نے یہ دنیا انسانوں کے امتحان کے لیے بنائی ہے۔ اس دنیا میں ایک طرف یہ مواقع ہیں کہ ایک تنہا انسان تاریخ کا دھارا موڑ دے اور قصرالزہرہ جیسا محل بناڈالے، دوسری طرف یہاں موت اور گردش زمانہ کی وہ رکاوٹیں ہیں جو انسان کے ہر کارنامے کو کھاجاتی ہیں۔ یہ صرف آخرت کی دنیا ہے جہاں کی بادشاہی میں عظمت اور ابدیت ایک ساتھ جمع ہوجاتی ہیں۔ یہ دنیا اصل میں اُس آنے والی بادشاہی کو حاصل کرنے کا بہترین موقع ہے۔ جس شخص نے ایمان، صبر اور عمل صالح کی مدد سے اس موقع کا فائدہ اٹھایا اصل میں وہی آزمائش کی یہ بازی جیت گیا۔ باقی لوگوں کے حصے میں سوائے خسارے کے، کچھ نہیں آتا۔

مہربانی کی مہک

پچھلے دنوں میری والدہ سے ملنے ہمارے پرانے محلے سے کچھ خواتین آئیں۔ میں ان کو پہچان نہیں سکا تھا۔مگر جب میری والدہ نے ان کا تعارف کرایا تو میں انہیں پہچان گیا۔ چودہ پندرہ برس پہلے یہ سب چھوٹی چھوٹی بچیاں تھیں۔مگراب ماشاءاللہ یہ تینوں بڑی ہوگئی تھیں اوران میں سے ایک کی شادی اور دوسری کی منگنی ہوچکی تھی۔

میں گرچہ انہیں نہیں پہچانا تھا مگر وہ سب مجھے پہچان گئی تھیں۔انہوں نے مجھے بتایا کہ جب وہ چھوٹی تھیں تو میں انہیں اپنی موٹرسائیکل پر بٹھا کر گھمایا کرتا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔میں نے نئی نئی موٹر بائیک خریدی تھی۔میں اپنے خاندان کے چھوٹے بچوں کو اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر گھماتا تھا۔ایسے میں وہ مجھے اپنے دروازے پر کھڑی ہوکر حسرت بھری نظروں سے دیکھتی تھیں کیوں کہ ان کے گھر میں کسی کے پاس موٹر بائیک نہ تھی۔ان کی معصوم سی خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں انہیں بھی ساتھ لے جایا کرتا تھا۔

میرے لیے یہ ایک بہت معمولی سی بات تھی۔مگر محبت اورمہربانی کی یہ بات انہیں ایک طویل عرصے بعد بھی یاد رہی۔اس کا سبب یہ ہے کہ انسان نہ نفرت کو بھول پاتا ہے اور نہ محبت اورمہربانی کو فراموش کرپاتا ہے۔خاص کر جب یہ مہربانی بغیر کسی وجہ اورسبب کے کی جائے۔

آج ہمارے معاشرے میں لوگوں کے دکھ بہت بڑھ گئے ہیں۔اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے چھوٹی چھوٹی مہربانیاں کرنی چھوڑ دی ہیں۔ہم نہیں جانتے کہ ہماری ایک مسکراہٹ، ایک درگزر، ہمدردی کا ایک کلمہ، مہربانی کا ایک عمل چاہے کسی کو کتنا بھی چھوٹا لگے کبھی چھوٹا نہیں ہوتا۔یہ عمل ایک کمزور اورمحروم انسان کے دل میں ہمارا وہ عکس قائم کرتا ہے جو مدتوں نہیں بھلایا جاتا۔یہ عکس کبھی ایک انسان تک نہیں رکتا بلکہ روشنی بن کر دوسروں میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔انسان اس مہربانی سے دوسروں کے ساتھ مہربانی کرنا سیکھتا ہے۔یہاں تک کہ پورا معاشرہ محبت کے پھولوں سے مہک اٹھتا ہے۔

خوبصورتی اور زیب وزینت

خوبصورت نظر آنا انسان کی ایک فطری خواہش ہے۔ ہر زمانے میں انسان اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کی کوشش کرتے آئے ہیں۔مگر اکثر لوگ اس معاملے میں افراط وتفریط کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے زیب وزینت کے معاملے میں اس نے انسان کے فطری ذوق جمال کو ملحوظ رکھ کر لوگوں کی بالکل صحیح راہنمائی کی ہے۔

ذوق جمال کے اعتبار سے انسانوں کے لیے خوبصورتی کے تین درجات ہیں۔ پہلے درجے میں انسان بدبو، غلاظت اور میل کچیل سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے کیونکہ یہ نجاستیں ذوق سلیم پر سخت گراں گزرتی ہیں۔گندگیوں کو اپنے سے دور کر کے اور صفائی ستھرائی حاصل کر کے انسان نہ صرف پاکیزگی حاصل کرتا ہے بلکہ خدا کی عطا کردہ فطری شکل وصورت میں لوگوں کو بھلا بھی لگتا ہے۔خوبصورتی کا یہ وہ درجہ ہے جس کا حصول لازمی ہے۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دین میں کثرت کے ساتھ ایسے احکام ہیں جو صفائی ستھرائی اور پاکیزگی پر مبنی ہیں۔جیسے ناخن تراشنا، غیر ضروری بال صاف کرنا اور غسل ووضو کے احکام وغیرہ۔روایت میں بیان ہوا ہے کہ:

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ایک صاحب کے بکھرے بال دیکھ کر اسے بال سنوارنے اور دوسرے کے میلے کپڑے دیکھ کر انہیں صاف رکھنے کی تلقین کی''۔ (ابی یعلیٰ رقم:2026)۔

خوبصورتی کا دوسرا درجہ وہ ہے کہ جس میں انسان باقاعدہ زیب وزینت اختیار کرتا ہے۔ اس درجہ کا اختیار کرنا محمود و پسندیدہ ہے۔چنانچہ ایک حدیث میں لباس اور جوتوں کی خوبصورتی کی یہ کہہ کر تحسین کی گئی ہے کہ

''اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے''۔(مسلم رقم:91)۔

اس قسم کی زینت میں خواتین بہت اہتمام کرتی ہیں۔لباس کی خوبصورتی ، بالوں کی آرائش، چہرے اور دیگر کھلے رہنے والے اعضاء پر سنگھار اور زیورات وغیرہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ صنف نازک ہونے کی بنا پر ان کا ایسا کرنا ایک فطری عمل ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اہتمام پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی بلکہ ایک خاص قریبی حلقے میں اس کی باقاعدہ اجازت بھی دی گئی ہے(النور31:24)۔

تاہم خواتین پر اس حوالے سے کچھ پابندیاں لگائی گئی ہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ مردوں کے لیے خواتین میں ایک کشش فطری طور پر پائی جاتی ہے۔خواتین کی اضافی زیب وزینت کا عمل اس کشش میں اضافے کا سبب بن جاتا ہے۔اس کشش کو اگر آزاد اور بے روک ٹوک چھوڑ دیا جائے تو یہ زنا کے اس جرم تک انسان کو پہنچا دیتی ہے جو پورے معاشرتی ڈھانچے کو درہم برہم کر دیتا ہے۔چنانچہ سورہ نور کی مذکورہ بالا آیت میں ،مرد وزن کے اختلاط کے موقع پر، اللہ تعالیٰ نے دیگر احکام کے ساتھ خواتین کو دو ہدایتیں اضافی طور پر دی ہیں۔ایک یہ کہ وہ اپنی اوڑھنیوں کے آنچل سے اپنے گریبان اور سینے کو اچھی طرح ڈھانک لیں۔ دوسرے یہ کہ اس موقع پر وہ اپنی زینتیں ظاہر نہ کریں۔ان کو چھپانے کا اہتمام کریں۔

اس معاملے میں خواتین کو دو رعایتیں دی گئی ہیں۔ایک تو وہی جو ہم نے اوپر بیان کر دی ہے کہ اخفائے زینت کی یہ پابندی قریبی حلقے کے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔دوسری رعایت یہ ہے کہ زینت اگر ان اعضا پر ہو جو عادتاً کھلے رہتے ہیں جیسے ہاتھ کی انگوٹھی ،آنکھوں کا کاجل یا ناک کی کیل وغیرہ تو یہ زینت اِس پابندی کی زد میں نہیں آتی۔

یہ رعایت آسانی کے نقطۂ نظر سے دی گئی ہے مگر اس کے باوجود خواتین پر یہ واضح رہنا چاہیے کہ ایسے مواقع پر اصل حکم زینت چھپانے ہی کا ہے اس کی نمائش کا نہیں۔ چنانچہ قرآن نے اس

سلسلۂ احکام کے آخر میں، مثال کے طور پر، صرف ایک چیز کو بیان کر دیا کہ خواتین اپنے پاؤں زمین پر مار کر نہ چلیں کہ وہاں موجود لوگ ان کی مخفی زینت کے بارے میں جان لیں۔ چنانچہ کوئی بھی ایسا رویہ اختیار کرنا جس سے خواتین مردوں کے لیے صنفی کشش پیدا کرنے کا سبب بن جائیں ان احکام کی روح کے قطعاً خلاف ہوگا۔

خوبصورتی اختیار کرنے کا تیسرا درجہ وہ ہے جس میں لوگ فطری اور اخلاقی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر زیب و زینت میں اسراف کرنا، متکبرانہ انداز اختیار کرنا یا ہر کام سے ہٹ کر ہمہ وقت خود کو جاذب نظر بنانے میں لگ جانا یا پھر انسان کی فطری خلقت میں تبدیلی کر کے خوبصورت بننے کی کوشش کرنا وغیرہ۔ چنانچہ اسی پس منظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں مردوں کو سونا اور ریشم کے استعمال سے منع کیا (احمد: رقم 16972) اور صنف مخالف کی مشابہت اختیار کرنے والے مرد و عورت پر لعنت کی ہے (احمد: رقم 3151)۔ اس پس منظر میں آج بھی اخلاق اور فطرت کے خلاف خوبصورتی کا کوئی طریقہ اختیار کرنا درست نہیں۔

☆ زندگی میں پیش آنے والے ناگوار حالات
روزے دار کے ایک سخت دن کی طرح آخر کار گزر جاتے ہیں
یہی رمضان کا اصل سبق ہے

☆ اہم یہ نہیں کہ رمضان میں آپ نے کیا اعمال کیے
اہم یہ ہے کہ رمضان کی تربیت نے آپ کو کیسا بنا دیا

☆ کامیاب زندگی یہ نہیں کہ آپ کتنے خوش ہیں
کامیاب زندگی یہ ہے کہ آپ کا پروردگار آپ سے کتنا خوش ہے

☆ لوگوں کے دکھ بانٹیے
یہ نہیں کر سکتے تو کم از کم
ان میں اضافے کا سبب بھی مت بنیے

مسجد قرطبہ اور مسجد اقصیٰ

دور جدید میں امت مسلمہ نے جن عظیم ترین لوگوں کو جنم دیا ہے ان میں ایک نمایاں ترین نام علامہ اقبال (1876-1939) کا ہے۔ اقبال نے جس دور میں ہوش سنبھالا، اس دور میں امت مسلمہ اپنی تاریخ کے بدترین علمی، فکری، عملی اور سیاسی زوال کا شکار تھی۔ 1857 میں مغلیہ سلطنت کا خاتمہ اگر اقبال کی پیدائش سے ذرا قبل ہوا تھا تو خلافت عثمانیہ کا خاتمہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جدید علوم سے ناواقفیت اور دینی علوم میں جمود اگر ان سے قبل مسلمانوں کا طریقہ تھا تو مغرب کی اندھی تقلید اور دور جدید سے آنکھیں بند کر لینے کی دو انتہاؤں کو انہوں نے اپنے سامنے مسلم معاشرے میں پنپتے دیکھا۔ مسلمانوں کا عظیم ماضی اگر ان سے پہلے تاریخ کی ایک داستان بن چکا تھا تو مغربی افکار اور سوشلسٹ انقلاب کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے انسانیت کی نئی تاریخ بناتے ہوئے دیکھا۔

سیاسی غلامی، فکری انحطاط اور مذہبی جمود کے ان حالات میں جنم لینے والے بلند پرواز اقبال کے ذمے ملت کی راہنمائی کا عظیم کام تھا۔ وہ اس کام کو کرنے کے پوری طرح اہل بھی تھے۔ وہ ایک دردمند انسان تھے جنہیں درِدل کے ساتھ فکرونظر سے بھی نوازا گیا تھا۔ جہاں جدید علم وفکر، نئی روشنی اور مغربی اقوام کے حالات سے وہ واقف تھے تو وہیں مذہبی علوم، مسلم تاریخ اور امت کے مسائل پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان کا سرمایہ گہری نظر اور وسیع علم تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اس کے ابلاغ کے لیے اپنے زمانے کے موثر ترین ذریعہ یعنی شاعری پر انہیں انتہائی غیر معمولی عبور تھا۔ ان کی مخاطب قوم اگر زوال اور مایوسی کی دلدل میں دھنسی ہوئی تھی تو اس کے ساتھ ہی وہ شدت سے کسی بانگ درا، کسی فکری قائد کی راہنمائی قبول کرنے کے لیے ذہناً تیار بھی تھی۔

یہ وہ حالات تھے جن میں علامہ اقبال اٹھے اور اپنے سوز، ترنم اور شعلہ بیانی سے مسلمانوں کے قافلہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اقبال کے افکار نے مسلمانوں کو مایوسی کے گرداب سے نکالا، اہل مغرب کی ذہنی غلامی میں جانے سے روکا، کمیونزم کے بڑھتے سیلاب کے سامنے سر جھکانے سے باز رکھا اور کچھ ہی عرصے میں

انہوں نے ہندو تہذیب کے بالمقابل دنیا کی سب سے بڑی مسلم سلطنت کی بنیاد رکھدی۔

اقبال کے افکار و خیالات کو اگر علامتی طور پر ان کی شاعری ہی سے کوئی نام دیا جاسکتا ہے تو وہ ''مسجد قرطبہ'' کا نام ہے۔ یہ اقبال کی وہ معرکتہ الآرا نظم ہے جسے اردو زبان کا تاج محل کہا جاتا ہے۔فنی محاسن سے قطع نظر یہ ان کے افکار کے بنیادی نقطے کو بھی بہترین طریقے پر بیان کرتی ہے۔یعنی مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی۔اسپین کے شہر قرطبہ میں واقع یہ مسجد مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ عظمت رفتہ کے ایک نشان کے طور پر باقی ہے۔ یہ مسجد علامتی طور پر اس سانحے کو بیان کرتی ہے کہ کس طرح مسلمانوں نے ہزار برس تک دنیا پر حکومت کی اور پھر ان کا اقتدار مسیحی طاقتوں کے قدموں تلے روندا گیا۔مگر اقبال اس مسجد میں بیٹھ کر، اس شہر میں ٹھیر کر اور اس کے دریا الکبیر کے کنارے کھڑے ہو کر مسلمانوں کے اندر عشق کی روح پھونکتے ہیں اور پھر ایک نئے زمانے کا خواب دیکھتے ہیں۔

آبِ روان کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز میں سامنے آنے والے اقبال کے افکار اس صدی کے خاتمے تک اصل میں مسلمانوں کی بنیادی فکری غذا رہے اور بعد میں پیدا ہونے والے فکری رہنما بھی اصل میں اقبال کا پھونکا ہوا صور ہی نئے سروں میں دہراتے رہے۔تاہم ایک صدی بعد یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اقبال کی تمام تر عظمت کے باوجود مسلمانوں کے مسائل، کچھ زمانی تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی اسی طرح موجود ہیں۔اقبال نے جس عظمت رفتہ کا خواب دیکھا تھا وہ آج بھی اپنی تعبیر سے محروم ہے۔اقبال جس مرد مومن کی نوید دیتے تھے وہ تو پیدا نہ ہو سکا، افرادِ ملت میں رہی سہی اخلاقی حس بھی کمزور پڑ گئی۔اقبال اسلامی قانون کے جن مسائل کا حل اجتہاد کی راہ میں ڈھونڈتے تھے وہ تو سامنے نہ آسکا البتہ خود شراب کے حرام ہونے نہ ہونے کی بحثیں اقبال کے اپنے گھر سے پیدا ہوئیں۔اقبال کا اتحادِ امت کا درس پہلے خلیج بنگال کی نظر ہوا اور اب باقی پاکستان کئی

قومیتوں کے درمیان اپنی بقا کی آخری جنگ لڑ رہا ہے۔ اقبال کے ممولے اور کبوتر مغربی شاہینوں سے لڑتے لڑتے اب خود مسلمانوں پر خودکش حملے کرنے لگے ہیں۔

ان حالات میں یہ ضروری ہو چکا ہے کہ ہم مان لیں کہ مسلمانوں کی قدیم فکری روایت کے آخری بڑے آدمی یعنی اقبال کی راہنمائی ہمارے مسائل کا حقیقی حل نہیں تھی۔ ہم مان لیں کہ ''مسجد قرطبہ'' کا ماڈل مسلمانوں کے مسائل کا حل نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے مسائل کا حل ان تین مسجدوں کا ماڈل ہے جو اس قابل ہیں کہ ان کی زیارت کے لیے جایا جائے۔ یعنی مسجد الحرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔ ان تینوں مسجدوں کی نمائندگی کے طور پر ہم اگر علامت بنانا چاہیں تو ان تین مساجد میں سے مسجد اقصیٰ کو علامت بنایا جا سکتا ہے کیونکہ مسجد قرطبہ کی طرح یہ مسجد بھی اس وقت مسلمانوں کے قبضے سے نکل گئی ہے اور دوسری بات جو ہمارے حوالے سے زیادہ اہم ہے کہ سابقہ امت کے دور زوال کی جنگ مسجد اقصیٰ ہی میں لڑی گئی تھی۔

''مسجد اقصیٰ'' میں سیکڑوں انبیا اور ہزارہا صالحین نے جو داستان لکھی اور جو جنگ لڑی وہ سیاسی اقتدار کی نہیں بلکہ توحید کی جنگ تھی۔ وہ جب غالب ہوئے تب بھی اور سیاسی طور پر مغلوب ہوئے تب بھی ان کی جنگ صرف یہ تھی کہ بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر خالق کی غلامی میں لایا جائے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے آخری رسول حضرت عیسیٰؑ دور غلامی میں پیدا ہوئے۔ مگر اپنی قوم میں عظمت رفتہ کا صور پھونکنے کے بجائے انہوں نے ان کی اخلاقی غلطیوں پر متنبہ کیا اور لوگوں کو ہدایت کے اس منصب کی طرف متوجہ کیا جس پر بنی اسرائیل فائز تھے۔

آج بھی مسلمانوں کا کام یہی ہے۔ انہیں اپنی عظمت رفتہ کی نہیں توحید کی جنگ لڑنی ہے۔ ان کی اصل ضرورت ان کے اقتدار سے زیادہ ان کے اخلاق کی بحالی ہے۔ ان کا ماڈل ''مسجد قرطبہ'' نہیں ''مسجد اقصیٰ'' ہونا چاہیے۔ یہی وہ ماڈل ہے جو نہ صرف انہیں رب کی نظر میں محبوب بنائے گا بلکہ چند برسوں میں انہیں دنیا کا حکمران بھی بنا دے گا۔

اپنی خامی

میرے دوست مجھے بتا رہے تھے کہ انہوں نے کس طرح دوسروں کی خرابیوں کے بجائے اپنے عیوب کو دیکھنا شروع کیا۔ وہ کہنے لگے کہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے آغاز پر میں نے ایک دفتر میں ملازمت کی۔ اس دفتر میں دوپہر کا کھانا میں دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ کھاتا تھا۔ کھانے کے وقت اکثر ہمارے ساتھ ایک چپراسی (Peon) آکر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ یہ ایک غریب آدمی تھا جس کی تنخواہ بمشکل 1500 روپے تھی۔

دیگر لوگ تو اپنا کھانا گھر سے لاتے تھے، مگر یہ صاحب اپنے گھر سے صرف دو روٹی لے کر آتے۔ لوگ کھانے کے لیے بیٹھتے یہ دو روٹی لے کر آجاتی اور کسی کے بھی سالن سے یہ روٹیاں کھانے شروع کر دیتے۔ لوگ اکثر ان کے ساتھ بیٹھنے پر ناگواری کا اظہار کرتے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جب یہ کھانا کھاتے تو منہ سے چپ چپ کی آوازیں آتیں جو کھانا کھاتے وقت بہت گراں گزرتیں۔

وہ اکثر میرے ہی ساتھ کھانے کھاتے کیونکہ میں نے چہرے پر کبھی ناگواری کے تاثرات کا اظہار نہیں کیا تھا، مگر دل میں مجھ پر بھی اتنا اپنے ساتھ بیٹھنا بہت ناگوار گزرتا تھا۔ حتیٰ کہ دفتر میں میرا کھانا کھانا دوبھر ہوگیا۔ لیکن ایک روز میرے ذہن میں ان کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے ایک خیال آیا۔ وہ خیال یہ تھا کہ اس وقت جتنی زیادہ کراہیت مجھے ان کی اس آواز سے ہورہی ہے، اس سے کہیں زیادہ کراہیت اللہ تعالیٰ اور اس کے پاک فرشتوں کو مجھ سے اس وقت محسوس ہوتی ہوگی جب میں اس کی نافرمانی کرتا ہوں۔ لیکن کبھی اس نے مجھے رزق کی نعمت سے محروم کیا اور نہ نماز میں اپنی قربت سے دور کیا۔

اس کے بعد مجھے کبھی ان کا ساتھ بیٹھنا برا نہیں لگا۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ دنیا میں دوسروں کو برا سمجھنا بہت آسان ہے۔ اس لیے کہ ان کی خامیاں بغیر کوشش کے نظر آجاتی ہیں۔ مگر اپنی خامیوں کا احساس کرنے کے لیے ایک خاص نظر چاہیے۔ یہ نظر جس میں پیدا ہوگئی وہی خدا کا بندہ ہے۔ جس میں نہ ہوسکی وہ اپنی ذات کا بندہ ہے۔

اصل ایمان

ہمارے ادارے میں کچھ عرصے قبل ایک صاحب ملازم ہوئے۔ یہ صاحب بہت مسکین طبعیت کے مالک تھے۔ وہ آفس کے تمام لوگوں کے ساتھ بڑی مسکینی کے ساتھ معاملہ کرتے لیکن جب میرے کمرے میں آتے تو غیر معمولی عاجزی کا مظاہرہ کرتے۔ وہ ہمیشہ میرے کمرے میں باقاعدہ اجازت طلب کر کے آتے۔ جب تک میں 'فرمایئے' کہہ کر گفتگو کا آغاز نہ کرتا ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے۔ اگر اپنی طرف سے کچھ کہنا ہوتا یا کچھ دریافت کرنا ہوتا تو اس کی بھی اجازت طلب کرتے۔ گفتگو کے دوران میں ان پر ایک خاص نوعیت کی خشوع وخضوع طاری رہتی۔ ہاتھ باندھنے کے علاوہ نگاہ میں لحاظ، گردن میں خم، لہجے میں جھجک اور آواز میں پستی ہوتی۔ ان کی ہر بات سوری سے شروع ہوکر شکریے پر ختم ہوتی۔

مجھے اپنے لیے ان کا یہ انداز اختیار کرنا قطعاً ناپسند تھا، لیکن میں نے کبھی انہیں ایسا کرنے سے منع نہیں کیا۔ بلکہ جب کبھی وہ کمرے میں آتے میں غور سے ان کی ایک ایک حرکت کو دیکھتا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میں ان سے گفتگو کے دوران میں یہ سیکھ رہا ہوتا تھا کہ پروردگار عالم کے بے حیثیت غلاموں کو اس کی بارگاہ میں کس طرح پیش ہونا چاہیے۔

خدا انسانوں کا خالق، ان کا مالک، ان کا بادشاہ اور ان کا معبود حقیقی ہے۔ انسانوں کا ہر نفع وضرر اسی کے ہاتھ میں ہے۔ موت وزندگی کا ہر فیصلہ اسی کی بارگاہ سے صادر ہوتا ہے۔ عطا اور محرومی کا ہر حکم اسی کا جاری کردہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک نظر مفلس کو غنی اور گدا کو بادشاہ بناسکتی ہے۔ اس کا ایک اشارہ مالک کو غلام اور امیر کو فقیر بناسکتا ہے۔ خدا کی عظمت اور بلندی کا احساس، اس کی نعمتوں اور مہربانیوں کا اعتراف، اس کی پکڑ اور عذاب کا اندیشہ، جس انسان کو ہو جائے اس کے لیے بے پرواہی اور غفلت کی زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ ایسا انسان جب کبھی خدا کو یاد کرے گا تو اس کی وہی کیفیت ہو جائے گی جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ یہ حال نہ بھی ہو تب بھی اس کے لیے گناہ اور نافرمانی کی زندگی گزارنا ممکن نہیں رہتا۔

کلمہ پڑھ لینا حقیقی ایمان نہیں، خدا کی عظمت کے احساس کا وجود پر طاری ہو جانا اصل ایمان ہے۔

مدر ٹریسا کا سبق

مدر ٹریسا (1910-1967) کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی ساری زندگی انسانیت کے لیے وقف کر دی۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں کئی عالمی ایوارڈ بشمول نوبل انعام، عطا کیے گئے۔ حال ہی میں مدر ٹریسا کے خطوط پر مشتمل ایک کتاب Mother Treesa: come be) my light) شائع ہوئی ہے۔ ان خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مدر ٹریسا جو کیتھولک چرچ سے وابستہ ایک نن تھیں، مذہبی اعتقدات کے بارے میں شکوک کا شکار تھیں۔ انہیں سینٹ کی سطح کا ایک بلند رتبہ مذہبی شخص سمجھا جاتا تھا، مگر اب معلوم ہوا کہ وہ خدا اور ایمان کے بارے میں بے یقینی کا شکار رہیں۔

مدر ٹریسا کی زندگی کے تفصیلی مطالعے سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا ہوگا۔ ان کی پرورش ان کے کٹر مذہبی والدین نے بطور ایک نن کے کی۔ 18 سال کی عمر میں وہ غریبوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لینے کے لیے یک آئرش مشنری تنظیم سے وبستہ ہو گئیں۔ 1929 میں انڈیا آئیں اور اس تنظیم کے تحت چلنے والوں اسکولوں میں بچوں کو پڑھانے لگیں۔ اس کام کو انہوں نے اتنے جی جان سے کیا کہ وہ شدید بیمار پڑ گئیں۔ افسران نے انہیں تبدیلی آب و ہوا کے لیے دارجلنگ بھیجا اور یہیں انہیں خواب میں مسیح کی زیارت ہوئی۔ اس خواب میں انہیں انتہائی غریب طبقات کی مدد کا حکم ہوا۔ اس طرح کے خواب انہیں بار بار آتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے غریبوں کی مدد کے لیے اپنی ایک فلاحی تنظیم مشنریز آف چیریٹی قائم کی۔ جس سے وابستہ ہزاروں افراد آج دنیا بھر میں لاکھوں ضرورتمندوں کی مدد میں مصروف ہیں۔ لیکن اس تنظیم کے تحت انہوں نے جیسے ہی اپنے کام کا آغاز کیا تو انہیں یہ احساس ہوا کہ خدا موجود نہیں۔ انہیں یہ احساس 1948 میں کلکتہ میں غربت کے ہاتھوں دم توڑتے لوگوں کے درمیان میں ہوا اور پھر تاعمر اس احساس نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

مدر ٹریسا کی زندگی کی یہ تفصیلات ان کے معاملے کو صاف بیان کرتے ہیں۔ ایک کٹر مذہبی ماحول میں پرورش نے ان کی زندگی کی راہیں متعین کر دیں۔ انہوں نے مشنری کاموں یسے زندگی کا آغاز کیا۔

مسیحی مذہب کے عقائد چونکہ عقل کی کسی بنیاد پر پورے نہیں اترتے ، اس لیے اس مذہب کے پیروکاروں میں مسیحی کی قربانی اوران پر گہرے ایمان پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔اس کے نتیجے میں خوابوں کی وہ دنیا آباد ہوتی ہے جس کا ظہور مدر ٹریسا کی زندگی میں بھی ہوا۔وہ چونکہ ایک بے حد حساس اور اپنے کام سے مخلص شخصیت تھیں , اس لیے انہوں نے پہلے تعلیم کے کام اور پھر خدمت خلق کے کام کو بھی اسی تندہی سے کیا۔لیکن تعلیم کے کام کے برعکس غریبوں کی مدد کرتے ہوئے انہوں نے وہ اندوہناک مناظر دیکھے، جو ایک حساس آدمی کو ہلا ڈالنے کے لیے بہت ہیں۔

افلاس،غربت، بیماری،معذوری اور بے کسی کی موت کو کوئی بھی انسان جب قریب سے دیکھتا ہے تو اس کا تڑپ اٹھنا بالکل فطری ہے۔خاص کر ایک ایسے مسیحی کے لیے جسے ہر وقت خدا کی رحمت اور محبت کا درس دیا جاتا ہو۔اگر اس کی عقل بالکل کند نہ کردی جائے تو وہ یہ فطری سوال کرے گا کہ افلاس کی اس دنیامیں خدا کی رحمت کہاں ہے۔بیماری اور مایوسی کی اس دنیا میں خدا کیوں خود ظاہر نہیں ہوتا۔مسیح کی شکل میں غیر معمولی معجزات دکھانے والا خدااس وقت کہاں ہے۔

ان سوالوں کے جواب مذہبی لوگ بھی دے سکتے ہیں،مگر ایک حساس انسان اس سے کم پر مطمئن نہیں ہوسکتا کہ خدا خود آکر اسے اصل بات بتائے۔ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں سوائے اس کے کہ ایک شخص براہ راست قرآن پڑھے۔قرآن خدا کا زندہ و جاوید کلام ہے جس میں انسان کے ہر سوال کا جواب اللہ تعالیٰ خود دیتے ہیں۔ وہ قرآن میں بتاتے ہیں کہ انہوں نے ہی دنیا میں موت و زندگی کا سلسلہ رکھا ہے اور وہی انسانوں کو اچھے برے حالات سے آزماتے ہیں تا کہ وہ دیکھیں کہ لوگ ان حالات میں کیسے کام کرتے ہیں۔ان کے کاموں ہی کی بنیاد پر ہو قیامت کے دن یہ فیصلہ کریں گے کہ کسے جنت کی ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ملیں گی اور کسے جہنم کا عذاب۔پھر وہ قرآن میں آخرت کی زندگی کا نقشہ اتنے یقین اور تفصیل سے کھینچتا ہے کہ ہر دکھی دل صبر کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور ہر مایوس امید کی روشنی پالیتا ہے۔

آج کے انسان کو اگر شک اور مایوسی کے صحرا سے نکلنا ہے تو اسے قرآن کو اپنا رہنما بنانا ہوگا۔کیونکہ قرآن ہی آج کے ہر حساس انسان کے سوالات کا جواب ہے۔

صراطِ مستقیم

آج کے انسان کا مسئلہ کیا ہے؟ اسے اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس نے صراط مستقیم کھو دی ہے۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر بے مقصد گھوم رہا ہے۔ اس آوارہ گرد کی طرح جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ جس کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ جس کی صبح میں کوئی جوش اور جس کی شام میں کوئی قرار نہیں ہوتا۔

انسان ایسا کیوں ہو گیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ زندگی کی کہانی کے آغاز و انجام دونوں کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ وہ اس کہانی کے صرف اس حصے سے واقف ہے جو آج اس کے سامنے ہے۔ آج کے انسان کے سامنے صرف دنیا ہے۔ اس کی خوشیاں ہیں۔ اس کے غم ہیں۔ اس کی لذتیں ہیں۔ اس کی تلخیاں ہیں۔ اس کی آسائشیں ہیں۔ اس کے مسائل ہیں۔ اس کی نعمتیں ہیں۔ اس کی محرومیاں ہیں۔ اس کا پانا ہے۔ اس کا کھونا ہے۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

صراطِ مستقیم سے بھٹک کر انسان نہ دنیا میں بھیجنے والے رب کو یاد رکھتا ہے اور نہ اس آخرت کو جس کی طرف اسے ہر حال میں لوٹ کر جانا ہے۔ آج دنیا پرستی کے فتنے نے ہمیشہ سے بڑھ کر انسان کو اپنی منزلِ مقصود اور اس تک پہنچانے والی صراطِ مستقیم سے غافل کیا ہے۔ حتیٰ کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو صراطِ مستقیم کا امین کہتے ہیں، خود دنیا پرستی کے فتنہ کا شکار ہیں۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

مجھے پیسہ کمانا ہے۔ تاکہ اچھی جگہ میری شادی ہو جائے، تاکہ میرا گھر بن جائے، تاکہ

میرے بچوں کو اچھی تعلیم مل جائے، تاکہ معاشرے میں مجھے باوقار مقام مل جائے، تاکہ میری اولاد کا مستقبل سنور جائے۔ آج ہمارے معاشرے کے ہر فرد کا یہ نصب العین بن چکا ہے۔ اس کے لیے وہ ہر حد کو توڑ دیتا ہے۔ ہر قدر کو پامال کر دیتا ہے۔ ہر اصول کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اسے ایک روز مرنا ہے۔ اس کی قبر اس کی منتظر ہے۔ اسے حشر کے روز اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے۔ اپنے رب کے حضور پیش ہو کر زندگی کے نیک و بد کا حساب دینا ہے جس کی جزا ابدی جنت ہو گی یا ابدی جہنم۔

دنیا میں اپنی ضروریات، سہولیات اور آسائشوں کے لیے جدوجہد کرنا کوئی جرم نہیں۔ جرم یہ ہے کہ انسان اس عمل میں آخرت کو فراموش کر دے۔ وہ دنیا کی عارضی زندگی کو اپنا نصب العین بنا بیٹھے۔ خدا کی عطا کردہ صراطِ مستقیم سے بھٹک جائے۔

صراطِ مستقیم کیا ہے؟ اس سوال کا جواب جاننا کوئی مشکل کام نہیں۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ صراطِ مستقیم وہ راستہ ہے جس پر چل کر بندہ اپنے رب کی رضا اور جنت حاصل کر سکتا ہے۔ اس سے مراد لغوی معنوں میں کوئی سیدھا راستہ نہیں۔ ہم میں سے ہر شخص روز اپنے گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر سیدھا پہنچتا ہے۔ اس عمل میں یہ نہیں ہوتا کہ ہم گھر سے نکلے اور ناک کی سیدھ میں چل کر اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔ ہمیں بار بار موڑ مڑنے پڑتے ہیں۔ بار بار نشیب و فراز عبور کرنے ہوتے ہیں۔ اس سفر میں ہم صرف ایک کام کرتے ہیں۔ یعنی ہر موڑ پر ٹھیک فیصلہ کہ ہمیں کس سمت جانا ہے۔ ہم بارہا ایک خوبصورت راستہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بارہا ہموار سڑک چھوڑ کر ناہموار راستہ لے لیتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر اچھا اور آسان راستہ ہماری منزل کی طرف نہیں جاتا۔

جنت کے مسافر بھی اپنے صراطِ مستقیم پر ایسے ہی سفر کرتے ہیں۔ جب حلال و حرام کا کوئی موڑ آئے تو حرام کی تمام تر آسانی کے باوجود وہ اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ فواحش و منکرات کی

شاہراہ کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو وہ اسے چھوڑ کر پرہیزگاری کی مشکل چڑھائی چڑھتے ہیں۔ جنت کے مسافر راستے کی رنگینیوں کی خاطر کبھی اپنی منزل کھوٹی نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ صراطِ مستقیم اپنے نفس کو پاکیزہ کرنے کا نام ہے۔ نفس کی یہ پاکیزگی کسی کوہ، کسی غار میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ شاہراہِ زندگی کو چھوڑ کر، مسائل زندگی سے فرار اختیار کر کے یہ پاکیزگی نہیں ملتی۔ یہ پاکیزگی زندگی میں پیش آنے والے اچھے برے حالات میں تقویٰ اختیار کرنے سے ملتی ہے۔ یہ ہر حال میں رب سے جڑے رہنے سے ملتی ہے۔

جب غصہ آ رہا ہو، جب حرص کا زور ہو، جب طمع کی بھٹی دہکے، جب ہوس کا غلبہ ہو، جب خواہش ناگ بن کر پھنکارے، جب شیطان اپنے لشکر سمیت چڑھ دوڑے، تو جان لیجیے زندگی کے راستے میں کوئی موڑ آیا ہے۔ آپ کو اب فیصلہ کرنا ہے۔ آپ اپنے جذبات کی پیروی کرتے ہیں یا قرآن کی بتائی ہوئی مشکل راہ - بہت عارضی سی مشکل راہ - اختیار کرتے ہیں۔ پہلی صورت میں آپ صراطِ مستقیم سے بھٹک جائیں گے اور دوسری صورت آپ کو آپ کی منزل - خدا کی جنت - سے قریب کر دے گی۔

صراطِ مستقیم جنت کے راستے کا نام ہے۔ جنت سے قریب کرنے والی ہر شے صراطِ مستقیم ہے۔ زندگی کی ہر آزمائش میں جسے یہ بات یاد رہی وہ صراطِ مستقیم پر ہے۔ جسے یہ بات یاد نہ رہی وہ صراطِ مستقیم سے دور ہے۔

بے وقوف کون ہے؟

''ہوسکتا ہے کہ لوگ مجھے احمق سمجھیں لیکن اگر میں احمق ہوں تو دوسرے لوگ مجھ سے زیادہ بے وقوف ہیں''، یہ جملہ ادا کرکے وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکے اور پھر بولے۔''ضروری نہیں کہ انشورنس کرانے کے بعد میں اس کے ملنے تک زندہ رہوں، ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں میری آمدنی بڑھ جائے کہ مجھے انشورنس کی رقم کی ضرورت ہی نہ رہے، لیکن موت کی لاچاری اور حشر کی محتاجی ہر شخص کو دیکھنی ہے، میری توجہ اس دن کے انشورنس کی طرف ہے۔ جبکہ دنیا کا انشورنس اس روز کام نہیں آئے گا'' یہ بات کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔ میں بھی خاموشی سے یہ تجزیہ کرنے لگا کہ بے وقوف کون ہے۔

اس گفتگو کا پس منظر یہ تھا کہ یہ صاحب اپنے ایک رشتہ دار کے انشورنس کی رقم جمع کرانے گھر سے نکلے اور واپسی پر مجھ سے ملنے آگئے۔ بات چیت میں ذکر چھڑا تو انہوں نے بتایا کہ اپنے رشتہ داروں اور دوست احباب کے چھوٹے موٹے کام وہ اپنے فارغ وقت میں کردیتے ہیں۔ آج انہوں نے دفتر کی چھٹی کی تو گھر میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے کے بجائے وہ اپنے ایک رشتہ دار کا انشورنس جمع کرانے چلے گئے۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا آپ نے بھی انشورنس کرایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں میں نے یہ والا انشورنس نہیں کرایا البتہ یہ جو میں لوگوں کے چھوٹے چھوٹے سے مسائل حل کرتا ہوں یہی اصل میں میری انشورنس پالیسی ہے۔ حضور نبی کریم نے فرمایا ہے کہ اللہ بندے کی مدد کرتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہے۔ میں ہمیشہ ممکن حد تک دوسروں کی مدد کرتا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ خدا ہمیشہ میرے مسائل میں میری مدد کرتا ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ میری اصل بیمہ پالیسی خدا مجھے اس وقت دے گا جب حشر کے دن خدا کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔ اس روز وہ سب سے بڑھ کر میری مدد کرے گا اور قیامت کی ہر سختی سے بچا کر جنت میں داخل کردے گا۔

پھر انہوں نے وہ جملہ کہا جو میں نے شروع میں نقل کیا ہے۔ یہ گفتگو تو ختم ہوگئی لیکن دنیا کے ہر عقلمند کے لیے ایک سوال چھوڑ گئی۔ وہ سوال جو بہت جلد خیال سے حقیقت کا روپ دھارنے والا ہے۔

زندگی کی نشانیاں

ڈاکٹر مظہر نے میرے سامنے وزیٹنگ کارڈ رکھ دیا۔اس پر نام کے نیچے ''ڈپٹی کمشنر انکم ٹیکس'' کا عہدہ درج تھا۔ یہ ان صاحب کا وزیٹنگ کارڈ تھا جن کا موتیا کا آپریشن ڈاکٹر مظہر نے حال ہی میں کیا تھااور جن کا تذکرہ ڈاکٹر صاحب بڑے جوش کے ساتھ مجھ سے کررہے تھے۔

ڈاکٹر مظہر کا آئی کلینک میرے پڑوس میں واقع ہے۔وہ اپنی شخصیت اور مقصد دونوں اعتبار سے معاشرے کے قابل فخر اور قابل تقلید شخص ہیں۔ان کی زندگی کا مقصد عام آدمی تک اعلیٰ ترین علاج کی سہولت بہت کم نرخ پر پہنچانا ہے۔انہوں نے آنکھوں کا سرجن ہونے کے ناطے اسی شعبے سے آغاز کیا۔بعض صاحب دل لوگوں نے ان کی مدد کا فیصلہ کیا یوں وہ کلینک وجود میں آیا جہاں ایک عام آدمی کو بہت کم فیس پر اعلیٰ ترین علاج کی سہولت مہیا کی جاتی ہے اور جب کبھی کوئی ضرورت مند شخص ان کے کلینک آتا ہے تو وہ بھی مایوس نہیں لوٹتا۔اس کے لیے بھی، صاحب ثروت افراد کے تعاون سے،مفت علاج کا بندوبست کردیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھا اور کہنے لگے کہ جب میں نے ان صاحب کو موتیا کے آپریشن کے لیے سات ہزار کی رقم بتائی تو ان کے چہرے پر ایک سوالیہ نشان پیدا ہوا۔ یہ سوالیہ نشان ہمارے ہاں ہر اس سفید پوش شخص کے چہرے پر پیدا ہوجاتا ہے جسے قدرت بیماری کی آزمائش میں ڈال دیتی ہے۔میں نے اس سوال کو پڑھ لیا اوران کا آپریشن بغیر کسی فیس کے کردیا۔لیکن انکم ٹیکس کے محکمے کا ڈپٹی کمشنر عہدے کا آدمی ، جو رزق حرام کے گندے نالے سے نہا کر، امریکہ میں علاج کرانے کی استعداد رکھ سکتا تھا،اس کا یوں سفید پوش ہونا،اس کے بے داغ ہونے کی نشانی ہے۔

میں نے کارڈ دوبارہ دیکھا اور سوچا کہ ایسے صاحب کردار انکم ٹیکس افسر کا وجود معاشرے کے زندہ ہونے کی نشانی ہے اوران کا مفت علاج ہونا بھی معاشرے کے زندہ ہونے کی ایک نشانی ہے۔ جب تک زندگی کی یہ نشانیاں باقی ہیں، ہمارا معاشرہ سارے برے لوگوں کے باجود زندہ رہے گا۔

فیصلے کا دن

یہ ایک بڑا سا پوسٹر تھا جس پر لکھا تھا، ’’8 جنوری فیصلہ کا دن‘‘۔ پس منظر میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی بڑی ساری ایک تصویر تھی جس میں ان کا دمکتا اور مسکراتا چہرہ نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا۔ ان کے چہرے کی روشنی اور مسکراہٹ صاف بتا رہی تھی کہ یہ پاکستان کی آئندہ وزیر اعظم کا چہرہ ہے۔ وسیع عوامی تائید، صدر مملکت پرویز مشرف سے ہونے والی ڈیل اور بین الاقوامی تائید کی بنا پر یہ بات یقینی تھی کہ 8 جنوری 2008 کا سورج جب غروب ہوگا تو اگلی صبح بے نظیر کے اقتدار کا سورج بن کر طلوع ہوگا۔

مگر محترمہ کی زندگی میں 8 جنوری 2008 کا دن نہیں آیا۔ 27 دسمبر 2007 کا سورج جب ڈھلا تو بے نظیر کی زندگی کا سورج اس کے ساتھ ہی غروب ہوگیا۔ ان کی زندگی میں فیصلہ کا دن 8 جنوری نہیں بلکہ 27 دسمبر تھا۔ مگر یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ تھی۔

بے نظیر بھٹو کی زندگی کامیابی اور محرومی کی انتہاؤں سے عبارت رہی۔ وہ ایک جاگیردارانہ پس منظر کے حامل دولتمند خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح کے اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد ملک کے مقبول ترین لیڈر اور وزیر اعظم بنے۔ مگر اس کے بعد والد کے زوال، قید اور موت کے مناظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ قید اور جلاوطنی کی صعوبتیں اٹھائیں۔ پھر وطن واپسی پر عوامی مقبولیت، اپنی شادی کی خوشی، اولاد کی نعمت اور دو دفعہ اقتدار کی کامیابیاں دیکھیں۔ مگر اس کے ساتھ اپنے دو جوان سگے بھائیوں کی موت اور بعض قریبی ساتھیوں کی بے وفائی کے المناک مناظر بھی دیکھے۔ اور آخر کار وزیر اعظم بننے سے قبل ایک گولی کا نشانہ بن گئیں۔

ہر انسان کی زندگی اس سطح کی نہ سہی، مگر اس جیسی کامیابیوں اور محرومیوں سے عبارت ہوتی ہے۔ انسان ان سب سے گزر کر ایک روز اپنے رب کے حضور پیش ہوگا۔ یہی اس کے فیصلے کا دن ہوگا۔ جب یہ دیکھا جائے گا کہ زندگی کے مصائب پر اس نے کتنا صبر کیا اور خوشیوں پر کتنا شکر۔

اس دنیا کا کوئی دن فیصلے کا دن نہیں۔ فیصلے کا دن صرف قیامت کا دن ہے۔

ہیلمٹ

پچھلے دنوں شہر کراچی میں ہیلمٹ پہننے کی پابندی لگی۔ جب یہ اعلان ہوا تو لوگوں نے اس کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیا۔ مگر جب پولیس نے مقررہ تاریخ کے بعد سختی کرنی شروع کی تو لوگ ہیلمٹ خریدنے پر مجبور ہو گئے۔ اس لیے کہ پولیس اہلکار جگہ جگہ ناکے لگا کر موٹر سائیکل سواروں کو روکتے اور ہیلمٹ نہ ہونے پر انہیں جرمانے کرتے یا ان سے رشوت لے کر انہیں جانے دیتے۔ انھی دنوں ایک صاحب میرے گھر آئے تو بتانے لگے کے راستے میں دو جگہ پولیس والوں نے انہیں روکا اور دونوں جگہ پیسے دے کر انھوں نے اپنی جان چھڑائی۔

اس صورتحال کا نتیجہ یہ نکلا کہ 300 روپے میں ملنے والا ہیلمٹ تین گنا قیمت پر 900 روپے میں فروخت ہونے لگا۔ بعض جگہ ٹھیلوں پر ہیلمٹ فروخت ہونے لگے۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ چوروں اور راہزنوں نے ہیلمٹ چوری کرنا اور چھیننا شروع کر دیے۔ تاہم یہ صورتحال زیادہ عرصے جاری نہیں رہ سکی۔ تھوڑے دنوں میں حالات 'معمول' پر آ گئے۔ یعنی پولیس کی مہم ٹھنڈی پڑ گئی۔ لوگوں کی بڑی تعداد ہیلمٹ کے بغیر اب دوبارہ موٹر سائیکل چلاتی ہے اور کوئی انہیں روکتا ٹوکتا نہیں۔

اس صورتحال کو دیکھنے کا ایک پہلو یہ ہے کہ وقفے وقفے سے کوئی حکومتی یا سرکاری اہلکار کسی ہیلمٹ درآمد کرنے والے تاجر سے بھاری رشوت لیتا ہے اور پھر ہیلمٹ کی پابندی کا حکم جاری ہو جاتا ہے۔ یہ تاجر جب بھاری منافع پر اپنا امپورٹ کیا ہوا مال بیچ دیتا ہے تو پولیس سختی کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ بار بار یہ کہانی دہرائی جاتی ہے اور تاجر اور حکام دونوں ہاتھوں سے عوام کو لوٹتے ہیں۔ صورتحال کو دیکھنے کا ایک دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ کسی قوم کے لوگ اگر ذہنی طور پر کسی قانون کی پابندی کے لیے تیار نہیں تو زور اور زبردستی کے ساتھ زیادہ عرصہ تک ان سے اس قانون کی پابندی نہیں کرائی جا سکتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پولیس ، حکام اور قانون نافذ کرنے والے ادارے تعداد میں عوام سے کہیں کم ہوتے ہیں۔ دوسرے انہیں کسی ایک قانون کی خلاف ورزی کا نوٹس نہیں لینا ہوتا بلکہ ہزارہا قوانین اور

ضابطوں کی نگرانی کرنی ہوتی ہے۔اگرلوگوں کی اکثریت کسی خاص قانون کی پابندی کرنے کے لیے تیارہی نہیں توزیادہ عرصہ تک بالجبراس کی پابندی کرانا ممکن نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں لوگوں کی ذہنی ساخت اور تربیت کی کمی کو سمجھنے کے لیے میں ایک بہت پڑھے لکھے اور باشعور شخص کا واقعہ بیان کروں گا۔ان سے جب یہ کہا گیا کہ آپ موٹر سائیکل چلاتے ہیں تو ہیلمٹ نہیں پہنتے۔حالانکہ یہ حفاظت کے نقطہ نظر سے بہت ضروری ہے۔انہوں نے جواب دیا کہ ساری زندگی میں نے موٹر سائیکل چلائی ہے۔آج تک تو میرا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا۔یہ واقعہ بتاتا ہے کہ لوگ اتنی بنیادی بات بھی نہیں جانتے کہ ایکسیڈنٹ زندگی میں بار بار نہیں ہوتا، مگر جب کبھی ہوتا ہے تو ہیلمٹ ،موت وزندگی کے درمیان ایک فیصلہ کن لکیر کھینچ دیتا ہے۔

جب عوام اس رخ پرسوچتے ہوں تو محض قانون کے زور پر اصلاح نہیں ہوسکتی بلکہ جیسا کہ شروع میں میں نے بیان کیا ہے کہ رشوت پنپنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں یا پھر مہنگے داموں چیزیں فروخت کرنے والے تاجروں کی چاندی ہوجاتی ہے۔صرف ہیلمٹ کا واقعہ ہی اس بات کی وضاحت کے لیے کافی نہیں بلکہ جہیز،شادی کے کھانے پر پابندی وغیرہ کے قوانین کا حشر بھی سب کے سامنے ہے۔

اصل کام کرنے کا یہ ہے کہ قوم کو باشعور اور تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ہمارے تعلیمی نصابات میں ایران وتوران کی خبریں تو بہت ہوتی ہیں لیکن بدقسمتی سے شہریت کا شعور(Civic Sense) پیدا کرنے اوراخلاقیات کے بیج کی آبیاری کرنے پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ایسے میں والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کو ذمہ دار بنائیں۔اپنی جان، مال ،آبرو کے تحفظ کے لیے بھی اور دوسرے کے تحفظ کے لیے بھی محتاط اور ذمہ دارانہ انداز سے زندگی گزارنے کی تلقین کریں۔

تیز رفتاری سے پرہیز اور ہیلمٹ پہن کر اسکوٹر چلانا اسی ذمہ دارانہ طرز زندگی کا ایک اظہار ہے جس میں انسان اپنی جان کو بھی تحفظ دیتا ہے اور دوسروں کو بھی نقصان سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔وہ نقصان جو اگر پہنچ جائے تو زندگی بھر کا روگ بن جاتا ہے۔

بےنظیر کے بعد

آج کل مجھ سے سب سے زیادہ یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ بےنظیر کے بعد ملک کا کیا ہوگا؟ کیا یہ پاکستان کے اختتام کا آغاز (Beginning of the End) ہے؟ کیا ملکی حالات مزید خرابی کی طرف جائیں گے؟ کیا یہ ملک مذہبی تشدد، لسانی تصادم اور کسی ممکنہ بیرونی جارحیت کا کوئی وار اب سہہ سکے گا؟ کیا انارکی، لوٹ مار اور باہمی خانہ جنگی ہمارے قومی وجود کے خاتمے کا سبب بنے گی؟

یہ اور ان جیسے ان گنت سوالات اس اضطراب کا فطری نتیجہ ہیں جو مایوس کن حالات نے دل و دماغ پر طاری کر دیا ہے۔ لوگ مضطرب اور پریشان ہیں، دکھی اور غمزدہ ہیں، مایوس اور خوفزدہ ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حالات پر ان کا کوئی بس نہیں۔ چند لوگ ہیں جن کے ہاتھ میں ان کی تقدیر ہے اور وہ ان کی تقدیر سے کھیل رہے ہیں۔ اور انہوں نے ملک وقوم کے مستقبل کو ایک بےیقینی اور اندیشہ کی کیفیت سے دوچار کر دیا ہے۔

میں ان حالات میں یہ گھسا پٹا جملہ تو نہیں دہرانا چاہتا کہ پاکستان کا مستقبل بڑا روشن ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان کا مستقبل لوگوں کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ اچھے لیڈر کا انتخاب کریں جو آپ کی کشتی کو پار لگا دے۔ اس لیے کہ موجودہ حالات اتنے سنگین ہیں کہ اچھے سے اچھا لیڈر بھی ان میں کچھ نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں نجات کا واحد راستہ خدا کی مدد ہے۔ خدا جب کسی قوم کی مدد کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس میں بہترین لیڈر پیدا کر کے اس قوم کی نجات کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

خدا کی مدد اس وقت آتی ہے جب قوم کے چند باشعور لوگ ایمان و اخلاق کی دعوت کو قوم میں پھیلانے کا فیصلہ کر لیں۔ ایسے لوگ جب خدا سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس قوم میں ہم دعوت کا کام کرنا چاہتے ہیں، اس لیے آپ قوم کو مہلت دیں تو خدا ان کے لحاظ میں نہ صرف قوم کو مہلت دے دیتا ہے بلکہ اگر کچھ لوگ ان کی بات مان لیں تو بہتری کے راستے خود پیدا کر دیتا ہے۔

یہ لوگ خدا کو اپنی سچائی کا ثبوت اس طرح دیتے ہیں کہ اپنے قریبی حلقے میں ایمان و اخلاق کی یاددہانی کرانے والے بن جاتے ہیں۔لوگوں سے محبت، نرم گفتاری اور درگزر ان کا طریقہ ہوتا ہے۔انسانوں کی مدد، چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کا ادب اور خواتین کا لحاظ ان کا کردار ہوتا ہے۔ اللہ اور رسول کی محبت، خدا کے ساتھ اخلاص، اس کی اطاعت ان کی عادت ہوتی ہے۔اچھے اخلاق کا فروغ، نیکی کی تلقین، برائی سے اعراض ان کی سیرت ہوتی ہے۔

یہ لوگ خدا کے مطلوب اخلاق کو لوگوں میں پھیلاتے ہیں اور خدا لوگوں کے دل میں ان کی محبت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اپنے قریبی حلقے میں صالح عمل اور اچھے اخلاق کا بیج بوتے ہیں اور خدا دور دراز سے لوگوں کو ان کی مدد کے لیے بھیج دیتا ہے۔ یہ دعا و زاری سے اپنے اور اپنی قوم کے لیے درگزر کی درخواست کرتے ہیں اور خدا عالم اسباب میں ان کی دعوت کو موثر کر دیتا ہے۔

پاکستانی قوم اپنی زندگی کے نازک ترین مرحلے میں داخل ہوچکی ہے۔ یہ وقت مایوس ہونے یا ذاتی مفاد کی دوڑ میں لگ جانے کا نہیں۔ یہ وقت پاکستان کے بارے میں نجومیوں کی منفی پیش گوئیاں سننے، ملکی سیاست پر بے معنی تبصرے کرنے، سازشوں کی دنیا دریافت کرنے، اخبارات میں اپنے بارے میں امریکی منصوبوں کی تفصیل پڑھنے اور آنے والی تباہی کے انتظار کرنے کا وقت نہیں۔

یہ وقت کام کا وقت ہے۔ یہ سچی خدا پرستی اختیار کرنے کا وقت ہے۔ یہ اعلیٰ اخلاق اختیار کرنے کا وقت ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سیرت کو اختیار کرنے کا وقت ہے جن کے صدق اور امانت کی گواہی بدترین دشمن بھی دیتے تھے۔

اس سے پہلے کہ 'بے نظیر کے بعد کیا ہوگا' کا سوال کرنے والے 'پاکستان کے بعد کیا ہوگا' کا سوال کرنے لگیں، اٹھیے اور اپنے اندر نظر ڈالیے۔اپنے آپ کو بدلیے۔اپنے اردگرد نظر ڈالیے۔ اسے بدلنے کا عزم کیجیے۔اور اس سے آگے جو کچھ ہے اسے نظر انداز کر کے اپنی نظریں آسمان کی طرف امید کے ساتھ اٹھائیں۔یہی میرے پاس آپ کے سارے سوالوں کا تنہا جواب ہے۔

ویلنٹائن ڈے (1)

محبت انسان کا ایک بنیادی اور فطری جذبہ ہے۔ انسانی وجود، رشتوں اور تعلقات میں یہ جذبہ بڑے جمال اور حسن کے ساتھ اپنا ظہور کرتا ہے۔ خدا اور بندے، اولاد اور والدین، دوست اور اقربا کے رشتوں کی ساری خوبصورتی نہ صرف اس جذبہ کی عطا کردہ ہے بلکہ ان رشتوں کو زندگی کے ہر امتحان میں اگر کوئی سرخرو کرتا ہے تو بلا شبہ یہی محبت کا جذبہ ہے۔

محبت کے رشتہ کی ایک اور لطیف شکل وہ ہے جو آغاز شباب میں دل کے صحرا پر پہلی پھوار کی طرح برستی ہے۔ بحر زندگی ایک نئے تلاطم سے آشنا ہوتا ہے۔ قدم بے اختیار کسی سمت اٹھتے ہیں۔ نظر بے سبب کسی کو ڈھونڈتی ہے۔ دل کی دھڑکن بلا وجہ تیز ہو جاتی ہے۔ نگاہ پر بجلی سی کوندتی ہے۔ قلب جتنا بے چین ہوتا ہے دماغ اتنا ہی آسودہ رہتا ہے۔ دل کو بارہا بے وجہ قرار ملتا ہے اور بے وجہ قرار ملنے سے دل بہت بے قرار سا رہتا ہے۔

محبت کے اس جذبہ کا ودیعت کرنے والا وہ خالق دو جہاں ہے جو خدائے قدوس ہے۔ ہر تعریف کا مستحق، ہر خوبی کا سرچشمہ، ہر جمال کا خالق اور ہر جذبہ کا مالک۔ وہ جس طرح اپنی عطا میں لازوال ہے اسی طرح اپنی حکمت میں بھی باکمال ہے۔ وہ قدسیوں کا ممدوح ہی نہیں عارفوں کا محبوب بھی ہے۔ اس کی یہ حمد اور اس کی یہ محبت بے سبب نہیں۔ زندگی کی کہانی کا ہر ورق اسی نے لکھا ہے اور ہر سطر اسی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کہانی کا آغاز وہ محبت کی اسی نرم و نازک کونپل سے کرتا ہے، جسے نکاح کے تحفظ کے بعد وہ ایک شجر سایہ دار کی طرح دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ نوجوان محبت کے بیج کو دلوں کی زمین پر اگاتا ہے اور مضبوطی کے لیے جنس و شہوت کی کھاد ڈال دیتا ہے۔

مگر اس حیات بخش کھاد کو گناہ کی دلدل بنا دینے والا ابلیس لعین ہے۔ وہ شیطان مردود جو اپنی سرکشی کی وجہ سے بارگاہ ربوبیت سے دھتکار دیا گیا تھا۔ اور جس ہستی کے حسد میں دھتکارا

گیا تھا وہ یہی انسان تھا، جس کا دل محبت کے دریا میں بہر حال ڈوبتا ہی ہے۔ شیطان ملعون نے خدائے ذوالجلال کی عزت کی قسم کھا کر انسان کی بربادی کا عزم کیا تھا۔ وہ اس دریا کا رخ نکاح کے بحرِ زیست کے بجائے بدکاری کے گندے نالے کی طرف موڑنے کا خواہش مند رہتا ہے۔ وہ عفت کی پاکیزگی کے بجائے شہوت کی گندگی کو مقصودِ زیست ٹھہراتا ہے۔ وہ نکاح کے تقدس کے بجائے زنا کی غلاظت کو لذیذ تر بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ حیا کی بلندی کے بجائے آوارگی کی پستیوں کو مقصودِ حیات بنا دیتا ہے۔

اور آخری زمانے کی یہ مغربی تہذیب کہ جس نے ہزار برس سے قید شیطان کو رہا کرایا ہے، بحر و بر کو مسخر کرنے کے بعد دو عالم میں غالب ہے۔ یہ تہذیب میڈیا کی راہ سے شیطان کا ہتھکنڈہ بن کر دنیا اور اس کی اقدار پر حملہ آور ہوئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا حملہ یہ ہے کہ اس نے محبت کے پاکیزہ تعلق کو شہوت کی غلاظت سے لتھڑ دیا ہے۔ اس نے (Love Affair) کو (Lust Affair) بنا دیا ہے۔ جو نا مطلوب تھا اسے مقصود بنا دیا ہے اور جو مطلوب تھا اسے آزادی کی راہ میں کہیں کھو دیا ہے۔

ہمیں نہ محبت سے نفرت ہے نہ جوانی میں دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ہم دشمن ہیں۔ نہ انسانی جذبوں سے ہم ناواقف ہیں نہ شباب کے رنگوں کو پہچاننے سے اندھے۔ ہم مغربی تہذیب کے دشمن ہیں نہ مغربی اقدار و تہوار کے۔ نہ جوانی کے سیلاب پر بندھ باندھنے کے خواہاں ہیں نہ جدیدیت کی موج کو قدامت کے کوزے میں بند کرنے کے خواہش مند۔ صرف قوم کے فرزندوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان کے پروردگار نے ان کے لیے اس دنیا میں ایک ہی ویلنٹائن ڈے مقرر کیا ہے۔ وہ ان کی شادی کا دن ہے۔ رہی ان کی محبت تو اس کا اظہار ہر روز چاہتا ہے۔ بت پرستوں اور مسیحیوں کا مقرر کردہ صرف 14 فروری ہی کیوں؟

ویلنٹائن ڈے(2)

مرد و عورت کا تعلق اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں میں سے ہے (روم 21:30)۔اس تعلق کی بنیاد اُس کشش پر ہے جو انسانی جبلت (Instinct) میں رکھ دی گئی ہے تاکہ نسل انسانی آگے بڑھ سکے۔ یہ کشش نہ ہو تو صرف ایک نسل بعد پوری انسانیت دم توڑ دے گی۔ مرد و زن کی باہمی کشش انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ اکٹھے ہوں اور خاندان کا ادارہ تشکیل دیں۔ خاندان نہ ہو تو معصوم بچے اور ناتواں بزرگ زمانے کی سختیوں کو جھیلنے کے لیے تنہا رہ جائیں گے۔ مرد و زن کے اس تعلق کی ایک اور بڑی اہمیت بھی ہے۔ دوسری تمام نعمتوں کی طرح یہ بھی انسانوں کو خالقِ کائنات کی ان بے کراں عنایات کا ایک ادنیٰ سا تعارف کراتا ہے جو اس نے جنت کی ابدی زندگی میں ان کے لیے تیار کر رکھی ہیں۔

مگر مرد و زن کی یہ کشش بارہا اپنے ان مقاصد تک محدود نہیں رہتی۔شیطان انسان کی راہ میں بیٹھتا ہے اور خود اس کو ایک مقصود بنا دیتا ہے۔اس کا سب سے بڑا نمونہ مغربی معاشروں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ وہاں حیا کا فطری جذبہ بہت محدود اور عفت و عصمت (Chastity) ایک قدر کے طور پر باقی نہیں رہے۔میاں بیوی کا محدود اور پاکیزہ تعلق مرد و زن کے بے قید شہوانی تعلق میں بدل چکا ہے۔اس تعلق میں دو انسان ''رفع حاجت'' کے لیے باہم ملاقات کرتے ہیں اور دل بھر جانے کے بعد اگلے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

ویلنٹائن ڈے اس آزاد تعلق کو منانے کا دن ہے۔اس کی ابتدا کے متعلق یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بت پرست رومی تہذیب سے شروع ہوا یا تثلیث کے فرزندوں کی پیداوار ہے مگر اس کا فروغ ایک ایسے معاشرے میں ہوا جہاں حیا کی موت نے ہر (Love Affair) کو (Lust Affair) میں بدل دیا ہے۔مغرب کا یہ تحفہ اب کرسمس کے بعد دنیا کا سب سے زیادہ مقبول تہوار بن چکا ہے۔ ہر گزرتے سال، میڈیا کے زیر اثر، ہمارے ملک میں بھی اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

ہم مغرب سے آنے والی ہر چیز کے مخالف نہیں۔مگر کسی دوسری قوم کے وہ تہوار، جن کا تعلق کسی تہذیبی روایت سے ہو، انہیں قبول کرتے وقت بڑا محتاط رہنا چاہیے۔یہ تہوار اس لیے منائے جاتے ہیں تاکہ کچھ عقائد و تصورات انسانی معاشروں کے اندر پیوست ہو جائیں۔مسلمان عیدالاضحیٰ کے تہوار پر حضرت ابراہیمؑ کی خدا سے آخری درجہ کی وفاداری کی یاد مناتے ہیں۔آج ہم ویلنٹائن ڈے مناتے ہیں تو گویا ہم اس نقطۂ

نظر کو تسلیم کر رہے ہیں کہ مرد و عورت کے درمیان آزادانہ تعلق پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اہل مغرب کی طرح ہمیں اپنی بیٹیوں سے عصمت مطلوب نہیں۔ اپنے نوجوانوں سے ہم پاکدامنی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔

کوئی ہندو عیدالاضحیٰ کے موقع پر گائے کو ذبح کر کے مسلمانوں کے ساتھ شامل ہونے کا تصور نہیں کر سکتا۔ لیکن ہندوؤں کی موجودہ نسل گائے کے تقدس سے بے نیاز ہو کر عید کی خوشیوں میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو جائے تو عین ممکن ہے کہ ان کی اگلی نسلیں صبح سویرے مسلمانوں کے ساتھ گائیں ذبح کرنے لگیں۔ ٹھیک اسی طرح آج ہم ویلنٹائن ڈے پر خوشیاں منا رہے ہیں اور ہماری اگلی نسلیں حیا و عصمت کے ہر تصور کو ذبح کر کے ویلنٹائن ڈے منائیں گی۔

اسے دور کی کوڑی مت خیال کیجیے۔ ہماری موجودہ نسلیں صبح و شام اپنے گھروں میں مغربی فلمیں دیکھتی ہیں۔ عریاں اور فحش مناظر ان فلموں کی جان ہوتے ہیں۔ ان میں ہیرو اور ہیروئن شادی کے بندھن میں جڑے بغیر ان تمام مراحل سے گزر جاتے ہیں جن کا بیان میاں بیوی کے حوالے سے بھی ہمارے ہاں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ایسی فلمیں دیکھ دیکھ کر جو نسلیں جوان ہوں گی وہ ویلنٹائن ڈے کو ایسے نہیں منائیں گی جیسا کہ آج اسے منایا جا رہا ہے۔ جب وہ نسلیں اس دن کو منائیں گی تو خاندان کا ادارہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اپنے باپ کا نام نہ جاننے والے بچوں سے معاشرہ بھر جائے گا۔ مائیں حیا کا درس دینے کے بجائے اپنی بچیوں کو مانع حمل کے طریقوں کی تربیت دیا کریں گی۔ سنگل پیرنٹ (Single Parent) کی نامانوس اصطلاح کی مصداق خواتین ہر دوسرے گھر میں نظر آئیں گی۔

آج سے چودہ سو برس قبل مدینہ کے تاجدار نے جو معاشرہ قائم کیا تھا اس کی بنیاد حیا پر رکھی گئی تھی۔ جس میں زنا کرنا ہی نہیں اس کے اسباب پھیلانا بھی ایک جرم تھا۔ جس میں زنا ایک ایسی گالی تھا جو اگر کسی پاکدامن پر لگا دی جائے تو اسے کوڑے مارے جاتے تھے۔ جس میں عفت کے بغیر مرد و عورت کا معاشرہ میں جینا ممکن نہ تھا۔ اس معاشرے کے بانی نے فیصلہ کر دیا تھا۔

''جب تم حیا نہ کرو تو جو تمھارا جی چاہے کرو''

تاجدار مدینہ کے امتیوں نے کبھی حیا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ مگر اب لگتا ہے کہ امتی حیا کے اس بھاری بوجھ کو زیادہ دیر تک اٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ اب وہ حیا نہیں کریں گے بلکہ جو ان کا دل چاہے گا وہی کریں گے۔ ویلنٹائن ڈے کسی دوسرے تہوار کا نام نہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ وہ تہوار ہے جب امتی اپنے آقا کو بتاتے ہیں کہ ہم وہ کریں گے جو ہمارا دل چاہے گا۔

لوٹ مار

ہماری سیاست میں احتجاج اور تشدد کا عنصر آزادی سے قبل ہی در آیا تھا، مگر سن اسی کی دہائی تک احتجاجی مظاہروں میں زیادہ تک سرکاری املاک ہی کو نقصان پہنچایا جاتا تھا۔ نوے کی دہائی میں نجی املاک کو نقصان پہنچانے خاص کر گاڑیوں کو جلانے کا عمل بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ اس صدی کے آغاز پر احتجاجی سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کیا ہے۔ یہ عوامی احتجاج کے موقع پر لوٹ مار کا اندوہناک واقعہ ہے۔ لوٹ مار کے واقعات مختلف شہروں میں اور مختلف قسم کے احتجاج کے دوران میں پیش آئے۔ کراچی میں ایک نسلی گروہ کے احتجاج کے دوران، لاہور اور پشاور میں کارٹون کنٹروورسی کے خلاف ہونے والے مذہبی احتجاج کے دوران اور اب بے نظیر بھٹو کی المناک موت کے موقعہ سندھ بھر میں ہونے والے سیاسی احتجاج کے موقع پر بڑے پیمانے پر لوٹ مار کے واقعات پیش آئے۔

اس تفصیل سے یہ ظاہر ہے کہ لوٹ مار کا یہ مظہر نہ کسی خاص شہر اور علاقے تک محدود ہے اور نہ اس کے پیچھے کوئی خاص نسلی، مذہبی یا سیاسی پس منظر ہے۔ نہ یہ بعض مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے افراد کی کاروائی ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جارہا ہے۔ یہ ایک بہت گہرا اور اہم مسئلہ ہے جو کسی بھی قسم کی ہنگامہ آرائی کے دوران میں ظاہر ہونے لگا ہے اور آئندہ دنوں میں یہ بڑھتا چلا جائے گا۔ یہ اپنی شدت ہی میں نہیں بڑھے گا بلکہ نوعیت میں بھی سنگین تر ہوتا چلا جائے گا۔ مال کے بعد جان اور آبرو بھی اسی لوٹ مار کے ہنگامے کی نظر ہونے لگیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مسئلے کی درست تشخیص کر کے اس آتش فشاں کو پھٹنے سے پہلے ہی ٹھنڈا کر دیا جائے۔

لوٹ مار کا عمل جلاؤ گھیراؤ کے عمل سے بہت زیادہ سنگین ہے۔ سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے سے مقصود اگر سرکار کے خلاف نفرت کا اظہار اور حکومتی رٹ کو کمزور کرنا ہوتا ہے تو گاڑیاں جلانے سے عام لوگوں کو ڈرا کر گھروں میں بند رکھنا مقصود ہوتا ہے تاکہ احتجاج اور ہڑتال کے موقع پر کاروبار حیات کو بند کر کے اپنی مقبولیت، اسٹریٹ پاور اور کنٹرول کا ثبوت فراہم کیا جاسکے۔ جبکہ لوٹ مار کا کوئی اخلاقی جواز

یا کوئی اجتماعی مقصد نہیں ہوتا۔ بظاہر یہ کچھ افراد کی مجرمانہ اور مفاد پرستانہ حرکت محسوس ہوتی ہے، مگر دراصل اس کے پیچھے وہ معاشی تفریق ہوتی ہے، جس میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس کے پیچھے غصہ بھی ہوتا ہے اور مایوسی بھی، مگر اصل عامل دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہوتی ہے۔

جب ایک طرف چمکتی دمکتی گاڑیوں سڑکوں پر دوڑتی ہوں، عالیشان محلوں کی دنیا وجود میں آ رہی ہو، روشن اور شاندار مارکیٹوں میں پیسے والے بے حد و حساب خریداری کر رہے ہوں، ان کے بچے شاندار اسکولوں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہوں اور دوسری طرف دو وقت کی روٹی گھروں میں میسر نہ ہو، علاج معالجے کے لیے جیب میں رقم ہو نہ سرکار کی طرف سے انتظام ہو، بچوں کو اسکول کے بجائے مزدوری پر بھیجنا پڑے اور ان سب کے ساتھ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے امرا کی ذلت آمیز دھتکاریں سننیں پڑیں تو آخری نتیجہ لوٹ مار کی شکل میں نکلتا ہے۔

ہمارے حکمران طبقات زیادہ تر جاگیر دار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں مزارع کی بغاوت سختی سے کچل دی جاتی ہے۔ اس لیے وہ وہ شہری پس منظر کی بغاوت کی شدت سے واقف نہیں۔ ہمارے سیاست دان افراد ملت کے بنیادی مسائل کو حل کرنے میں مکمل ناکام رہے ہیں۔ ان کا تعلق اس اشرافیہ سے ہے جسے کیک کھانے کی عادت ہے، اس لیے وہ نہیں جانتے کہ آٹا نہ ملے تو کیا ہوتا ہے۔ ہماری فکری اور مذہبی قیادت نے انصاف اور بنیادی ضروریات کے بجائے ہمیشہ فرقہ وارانہ بحثوں اور بین الاقوامی سیاسی تنازعات کو اپنی جدو جہد کا نشانہ بنایا ہے۔ انہیں نہ اپنی ذمہ داریوں کا علم ہے اور نہ اپنے مقام و مرتبے کا۔

اب وقت آ گیا ہے کہ اس صورتحال کو بدلا جائے۔ ہمیں اپنی لیڈر شپ کو سختی کے ساتھ بتانا ہوگا کہ انہیں اپنا رویہ بدلنا ہوگا۔ پیسہ والوں کو یہ باور کرنا ہوگا کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے مال سے دینے کی عادت ڈالیں۔ ورنہ یہ چنگاری شعلہ بنے گی اور پھر ہر چیز خاکستر ہو جائے گی۔

صحافت اور فکری راہنمائی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو حیوانی قالب میں تو پیدا کیا ہے، مگر ساتھ ہی اسے عقل وفہم اور فکر وشعور کی وصلاحیتیں بھی عطا فرمائی ہیں جو اسے تمام حیوانات سے ممتاز کرتی ہیں۔ عقل وشعور کی یہ صلاحیت ہی انسان کا وہ اصلی شرف ہے جو اسے ایک کمزور جسم کے باجود کرہ ارض کا حاکم بنا دیتی ہیں۔ یہی شرف ہے جس کی مدد سے انسان نے پتھروں سے تمدن کو پیدا کیا، بحر و بر کو مسخر کیا، بیماریوں کو شکست دی اور ہر دور میں پیدا ہونے والے اپنے مسائل کو حل کیا۔ یہی عقل وفہم ہے جس کی بنیاد پر ہم ماضی سے سبق سیکھتے ہیں، حال کا تجزیہ کرتے ہیں اور مستقبل کا منصوبہ بناتے ہیں۔ یہی فکری راہنمائی ہماری زندگی کی کامیابی کی ضامن ہے۔

ایک فرد کی طرح معاشرہ بھی اپنے مسائل کے حل کے لیے درست فکری راہنمائی کا طالب ہوتا ہے۔ جو لوگ یہ فکری راہنمائی کریں وہ فلسفی، مفکر، حکیم اور دانشور کہلاتے ہیں اور اجتماعی طور پر انہیں فکری قیادت (Intelectual Leadership) کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر علامہ اقبال برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک عظیم فکری قائد تھے۔ انہی کی راہنمائی کو اپنا کر مسلمانوں نے پاکستان کے قیام کی تحریک چلائی اور ہندوستان سے جدا ہو کر اپنی الگ مملکت قائم کی۔

ایک فکری قائد وہ ہوتا ہے جو دیکھتا تو وہی ہے جو سب دیکھتے ہیں، مگر بتاتا وہ ہے جو دوسرے نہیں بتا پاتے ہے۔ وہ ایسا اپنے وسیع علم، گہرے مطالعے، کشادہ ذہن، تیز نظر اور بے لاگ تجزیہ کرنے کی خداداد صلاحیت کی بنا پر کر پاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک پاکستان میں جہاں اور کئی شعبوں میں زوال آیا وہیں فکری راہنمائی کرنے والی قیادت اور اس کی راہنمائی کی سطح بھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، گرتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ مثلاً علمی جمود، تعصب اور اختلاف رائے کو برداشت نہ کرنے کی روایت وغیرہ۔ تاہم اس صورتحال ایک بہت اہم سبب یہ ہے کہ اب قوم کی فکری راہنمائی زیادہ تر وہ لوگ کر رہے ہیں جو اصل میں صحافی ہیں۔ صحافی بنیادی طور پر رپورٹر ہوتا ہے جس کی اصل دلچسپی حالات حاضرہ اور خبر میں ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ حال میں جیتا اور فوری واقعات

کا نوٹس لیتا ہے۔اس کے تجزیے کا انحصار اپنے مطالعے سے زیادہ مختلف ذرائع سے سامنے آنے والی معلومات اور خبروں پر ہوتا ہے۔اس کے نتیجے میں وہ ایک دن کا مفکر تو بن سکتا ہے،مگر قوموں کی فکری راہنمائی کے لیے جس گہری نظر و بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اکثر ایک صحافی میں ناپید ہوتی ہے۔ ایک مفکر خبروں سے جنم لینے والے حال اور اور ماضی قریب میں نہیں جیتا بلکہ اس کا موضوع ماضی بعید اور مستقبل ہوتا ہے۔ وہ چیزوں کی معلومات سے زیادہ ان کی حقیقت اور نوعیت کو سمجھنے میں دلچسپی لیتا ہے۔زندگی اور معاشرہ کے اصول اور فرد اور اجتماعیت کی نفسیات کو سمجھنا اس کا اصل میدان ہوتے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ سب ایک عام صحافی کے بس کی بات نہیں۔ وہ تو ماضی قریب میں جیتا ہے جبکہ ایک حکیم اور مفکر ماضی بعید کی عطا کردہ حکمت میں جیتا ہے جو اسے مستقبل میں جھانکنے کے قابل بنا دیتی ہے۔یہی ایک صحافی اور مفکر کا بنیادی فرق ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں صحافت کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے صحافی صرف اور صرف سیاست اور سیاستدانوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ جبکہ دور جدید میں سیاست اجتماعی زندگی کا ایک ضمنی حصہ بن چکی ہے،مگر ہمارے صحافی اسی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ چونکہ سیاست کے میدان میں ہماری ناکامیاں غیر معمولی ہیں ، اس لیے وہ انھی ناکامیوں اور مایوسیوں کو قوم تک منتقل کرنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ جو کسی قسم کی راہنمائی نہیں بلکہ سلو پوائزننگ کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ آپ اخبارات کے کالم نویسوں کو پڑھ لیجیے یا ٹی وی کے تبصرہ نگاروں کو سن لیجیے۔ وہ آپ کو قوم کے کانوں میں مایوسی کا زہر ہی نظر آئیں گے۔

ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ لوگ ایک صحافی اور مفکر کا فرق سمجھیں۔ اخبار کا اور اپنا پیٹ بھرنے والے کالم نویسوں اور سیاسی پروگراموں کے تبصرہ نگاروں کی گفتگو سے متاثر ہونے کے بجائے کسی حکیم اور دانشور کو تلاش کریں۔ یہ لوگ کم ہوتے ہیں ،لیکن ایک دو اچھے حکیم قوم کا بیڑہ پار لگانے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔خدا کا قانون ہے کہ کسی معاشرے سے ایسے لوگ ختم نہیں ہوتے۔ بات صرف ان سے راہنمائی لینے کی ہے اور یہ ہمارے کرنے کا کام ہے، نہ کہ ان کے کرنے کا۔

ایمان کی آزمائش

قرآن میں بار بار یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جنت ایمان اور عمل صالح کا بدلہ ہے۔ صحابہ کرام تک جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی یہ دعوت پہنچائی تو اس کے جواب میں وہ ایمان لے آئے اور اپنی زندگی کو اعمال صالح کے مطابق ڈھالنے لگے۔ آج بھی اگر کوئی غیر مسلم جب اسلام قبول کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا امیدوار بننا چاہتا ہے تو ایمان اور عمل صالح کی شرائط پوری کرنا اس کے لیے لازم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بڑی عجیب بات ہے کہ وہ لوگ جو مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوتے ہیں، وہ ایمان کی شرط سے ہمیشہ خود کو استثنا سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے ایمان کا مرحلہ ایک مسلم گھرانے میں پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے خود ہی طے کر دیا ہے۔

قرآن پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان خدا کو اپنی عبادت، وفاداری اور آخرت کی کامیابی کو اپنا مقصدِ زندگی بنا لینے کا نام ہے۔ ان دونوں مقاصد کے حصول کے لیے تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے کو درست سمجھنا ایمان کا دوسرا بنیادی جز ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں کلمہ طیبہ کا زبانی ورد ایمان کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ یا بہت ہوا تو سابقہ اعمال سے توبہ کے بعد تجدیدِ ایمان (renewal of faith) کا ایک تصور کہیں مل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایمان سے متعلق تو ہیں لیکن اصل ایمان نہیں ہیں۔

اصل ایمان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ صحابہ کرام کو سامنے رکھا جائے۔ صحابہ کرامؓ ایک ایسی سوسائٹی کے فرد تھے، جہاں مذہب کے نام پر ایک عقیدہ موجود تھا۔ اس عقیدے سے وابستہ مذہبی لوگ کوئی اور نہیں حرم پاک کے متولی اور اولادِ ابراہیمؑ میں سے تھے۔ انہیں اپنی سچائی پر اتنا یقین تھا کہ جب یہ لوگ جنگ بدر کے موقع پر مکہ سے روانہ ہوئے تو حرم پاک کے پردے پکڑ کر یہ دعا کی کہ اے اللہ اگر یہ دین اسلام سچا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا دے۔ حضورؐ نے تیرہ برس تک ان لوگوں کے سامنے ایمان کی دعوت رکھی۔ دلائل کی بنیاد پر یہ ثابت کیا کہ ان کی عبادت، محبت اور وفاداری کا تنہا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ اللہ کی عبادت کے لیے میرے طریقے کی پیروی کریں گے تو آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے حق دار ہوں گے۔ صحابہ نے اس دعوت کو قبول کیا اور ہر طرح کی قربانی دے کر اسلام کو اختیار کر لیا۔

صحابہ کرامؓ کی یہ مثال بتاتی ہے کہ ایمان اصل میں ایک فکری دریافت ہے۔ یہ رائج نظریات، معاشرتی تصورات اور باپ دادا کے عقائد پر غور کر کے صحیح بات کو اختیار کر لینے کا نام ہے۔ یہ انسانوں

کے اور مخلوق کے بجائے خدا کی بڑائی میں جینے کا نام ہے۔ یہ مذہبی اکابرین اور مسلم رہنماؤں کے بجائے اللہ کے پیغمبر کو اپنا اصل رہنما سمجھنے کا نام ہے۔ عمل صالح اگر عمل کی آزمائش ہے تو ایمان فکر کی آزمائش ہے۔ جنت اگر پہلے کے بغیر نہیں مل سکتی تو دوسرے کے بغیر بھی اس کا حصول ممکن نہیں۔

عمل صالح کی طرح ایمان کی آزمائش آج تک جاری ہے۔ غیر مسلموں کو یہ آزمائش اگر ان کے آبائی مذہب کی بنا پر پیش آتی ہے تو مسلمانوں کو یہ آزمائش ان کے آبائی فرقے کی طرف سے پیش آتی ہے۔ آج مسلمان جب آنکھ کھول کر ارد گرد دیکھتا ہے تو وہ خود کو کسی نہ کسی مذہبی گروہ سے وابستہ پاتا ہے۔ ایسا شخص اپنے ماحول کے اثر یا کسی دعوت کی بنیاد پر اگر دینداری اختیار کرتا ہے تو اصل میں یہ اس کی جماعت یا اس کا فرقہ ہوتا ہے جو اس کے گرد اپنے شکنجے کو سخت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ بظاہر اللہ رسول اور آخرت کے الفاظ بول رہا ہوتا ہے مگر اس کی اصل وابستگی اپنے فرقہ، اپنی فکر اور اپنے بڑوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کے لیے اپنے طریقہ اور اپنی فکر کے سوا ہر دوسری چیز غلط ہوتی ہے۔ ایسا شخص اپنے فرقہ کو نجات یافتہ فرقہ اور باقی لوگوں کو جہنمی سمجھتا ہے۔ اس کے لیے قابل فخر شناخت وہ نہیں ہوتی جو اسلام نے دی ہے یعنی مسلم بلکہ وہ اپنے فرقہ کے حوالے سے ہی اپنا تعارف کرانا قابل فخر سمجھتا ہے۔

یہی وہ صورتحال ہے جو آج کے ایک مسلمان کے لیے ایمان کے اس امتحان کو از سر نو زندہ کر دیتی ہے جس سے صحابہ کرام کو واسطہ پڑا یا آج کے کسی غیر مسلم کو واسطہ پڑتا ہے۔ اس میں کامیابی کا طریقہ بھی وہی ہے جو صحابہ کرام کا تھا کہ اپنی ہر وفاداری کا رخ اللہ اور اس کے رسول کی طرف کر لیا جائے۔ تمام مسلمان اہل علم کو اپنا رہنما سمجھا جائے۔ ہر شخص کی بات کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور جس کی بات قرآن و سنت سے قریب لگے اسے اختیار کر لیا جائے۔ یہ تو ممکن نہیں ہوسکتا ہے کہ ہر آدمی دین پر تحقیق شروع کر دے، لیکن جب کبھی اپنے کسی دینی عمل یا عقیدے یا فکر پر کوئی سوال پیدا ہو جائے تو تعصب اور نفرت کے ساتھ اسے جھٹکنے کے بجائے دیگر اہل علم سے رجوع کر کے دوسروں کا نقطہ نظر اور ان کے دلائل معلوم کر لیے جائیں۔ مختلف اہل علم میں سے جس کی بات درست لگے اسے بلاتعصب اختیار کر لیا جائے۔

یہی وہ طریقہ ہے جو قیامت کے دن ہمارے ایمان کا سب سے بڑا ثبوت بن جائے گا۔ اس بات کا ثبوت کہ ہماری وفاداری اپنے بڑوں کے لیے نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص تھی۔ یہی وہ ایمان ہے جو ہمارے معمولی سے اعمال کو بھی اللہ تعالیٰ کی نظر میں بہت قیمتی کر دے گا۔

سونا اور عاقبت اندیشی

سونا ہر دور میں انسانوں کے لیے ایک بڑی قیمتی چیز رہا ہے۔اپنی گونا گوں خصوصیات کی بنا پر سونا زیورات کے طور پر استعمال ہونے والی سب سے نمایاں دھات ہے۔اپنی کم نہ ہونے والی قدر کی بنا پر ایک طویل عرصے تک کرنسی کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے۔ جب کرنسی نوٹ عام ہوا تو سونے کا یہ استعمال ختم ہو گیا۔تاہم کرنسی نوٹ سوائے ایک کاغذ کے ٹکڑے کے علاوہ کچھ نہیں،اس لیے کرنسی نوٹ کے زرِضمانت کے طور پر حکومتیں اپنے پاس سونے کے ذخائر بڑی تعداد میں رکھا کرتی تھیں۔بیسویں صدی میں آہستہ آہستہ زرضمانت کا یہ مقام بڑی حد تک امریکی ڈالر کے ذخائر کو حاصل ہو گیا۔

اکیسویں صدی کے آغاز پر یہ صورتحال بدلنا شروع ہوئی۔امریکی معیشت کی کمزوری کی بنا پر ڈالر کمزور ہوا۔چنانچہ حکومتوں نے اپنے تحفظ کے لیے ایک دفعہ پھر اپنے محفوظ مالی ذخائر کو سونے کی شکل میں رکھنا شروع کیا۔یوں سونے کی طلب اور نتیجے کے طور پر اس کی قیمت میں تیزی سے اضافہ ہوا اور تادمِ تحریر ہو رہا ہے۔اس صورتحال پر وہ لوگ تو بہت پریشان ہیں جو اپنے بچوں کی شادی کے لیے زیورات خرید رہے ہیں،مگر وہ لوگ جو عاقبت اندیشی (Foresightedness) کا مظاہرہ کرتے ہوئے بچیوں کے پیدا ہونے پر ان کے لیے سونا خرید کر رکھ لیتے ہیں بہت خوش ہیں۔کیونکہ انہوں نے بہت کم قیمت پر سونا خریدا تھا اور آج اس کی قدر و قیمت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔

یہ عاقبت اندیشی بہت اچھی چیز ہے۔مگر بہتر ہے کہ اس کا مظاہرہ اس دن کے لیے بھی ہونا چاہیے جو ہر انسان کی زندگی میں بہت جلد آنے والا ہے۔یہ دن پروردگار عالم کے حضور پیش ہونے کا دن ہے۔اور قرآن یہ کہتا ہے کہ اُس دن اگر انسان کے پاس زمین بھر سونا ہو اور وہ اسے دے کر اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے خود کو بچانا چاہے گا، تب بھی وہ نہیں بچ سکتا۔اس روز بچے گا وہی جس کے پاس ایمان و عمل صالح، اخلاق و عبادت، بندوں کی خدمت اور خدا کے دین کی نصرت کا سرمایہ ہوگا۔اپنے بچے بچیوں کے لیے چند گرام سونا خرید کر رکھنے والوں کو یہ حقیقت کبھی نہیں بھولنی چاہیے۔

غار اور سرنگ

خدا کی دنیا میں زندگی کا سفر روشنیوں اور اندھیروں کے درمیان آگے بڑھتا ہے۔ یہ سفر قوم کا ہو یا فرد کا، اس اصول سے کسی کو استثنا (Exception) حاصل نہیں ہے۔ روشنی کے سفر کے برعکس اندھیرے کا سفر بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ ایسے میں بارہا انسان کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے اور امید کا دامن چھوڑ بیٹھتا ہے۔ اس کا نتیجہ بارہا یہ نکلتا ہے کہ انسان زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

مگر خدا کی دنیا میں بہت سی ایسی نشانیاں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ اندھیرے میں بھی انسان کو آگے بڑھنا چاہیے۔ ان میں سب سے نمایاں چیز سرنگ ہے۔ سرنگ عام طور پر پہاڑوں میں بنائی جاتی ہے۔ ایک غار کی طرح اس کا دہانہ بھی بتدریج روشنی کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور اندھیرے کی سمت بڑھتا ہے۔ مگر ایک غار کے برعکس سرنگ کے دوسرے سرے پر ہمیشہ روشنی ہوتی ہے۔ جو لوگ استقامت کے ساتھ اندھیرے میں اپنا سفر جاری رکھتے ہیں وہ جلد یا بدیر روشنی کو پا لیتے ہیں۔ مگر جو لوگ مایوسی کے اندھیرے میں تھک کر بیٹھ جائیں وہ کبھی زندگی کی دوڑ میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔

ہماری زندگی میں بارہا اندھیرے آتے ہیں۔ یہ اندھیرے بیماری، بے روزگاری، غربت، غم و صدمات وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور انسان کو مایوسی کے غار میں دھکیل دیتے ہیں۔ قوموں کی زندگی میں جنگ، قحط، خانہ جنگی، معاشی بدحالی، امن وامان کی خرابی اور سیاسی خلفشار وغیرہ یہی کام کرتے ہیں۔ مگر فرد کا معاملہ ہو یا قوم کا، حقیقت یہی ہے کہ یہ اندھیرے غار کے نہیں، سرنگ کے اندھیرے ہوتے ہیں۔ وہ سرنگ جس کے دوسرے سرے پر روشنی ہوتی ہے۔

تاہم یہ روشنی صرف انہی لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو حوصلہ مندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ جو ہر اندھیرے کو چیر کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو اپنے لہو سے چراغ جلا کر اپنے راستے خود روشن کر لیتے ہیں۔ جو لوگ یہ کر سکیں، خدا کی دنیا میں کامیابی انہی کا مقدر ہوتی ہے۔

خدا کی معرفت کا ایک نیا تجربہ

آج کل میں اپنے گھر میں کچھ تعمیراتی تبدیلیاں (Rennovation) کروا رہا ہوں۔ اس عمل میں مجھے کئی تجربات ہو رہے ہیں۔ لیکن ان میں سب سے بڑا تجربہ خدا کی معرفت کا تجربہ ہے۔ تعمیر و تخلیق کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اس کے لیے سب سے پہلے کوئی خاکہ ذہن میں ترتیب پانا چاہیے۔ پھر اس کو روبہ عمل کرنے کے لیے طرح طرح کی صلاحیتیں چاہیے ہوتی ہیں۔ ایک گھر ہی کو لے لیجیے۔ الیکٹریشن، پلمبر، مزدور، مستری، کارپینٹر، رنگ کرنے والے اور ان جیسے بہت سے لوگ ہیں جن کی صلاحیتیں اور توانائیاں مل کر ایک گھر کو تخلیق کرتی ہیں۔ پھر بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک خاکہ بناتے ہیں، مگر جب وہ عمل میں آنے لگتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ حالانکہ عام طور پر ایسی بنی ہوئی چیز پہلے ہی سے ہمارے سامنے موجود ہوتی ہے۔ یا کسی چیز کے بننے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ بہتر چیز بنائی جا سکتی تھی۔ یا بنانے والے اپنے تجربے کے باوجود چیز اچھی نہیں بنا پاتے۔

لیکن اللہ تعالیٰ جو اس کائنات کے بادشاہ ہیں انہوں نے اس پوری کائنات کو پہلے سے موجود کسی نمونے یا خاکے کے بغیر بنایا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جو کچھ ہمیں اس دنیا میں نظر آتا ہے اس کے لیے کوئی تعمیری سامان پہلے سے موجود نہ تھا۔ اس دنیا میں جھرنے، آبشاریں، نہریں، کنویں، تالاب دریا اور سمندر موجود ہیں، مگر پانی موجود نہ تھا۔ اس دنیا میں شیر اور چیتے جیسے درندے، گائے اور بکری جیسے مویشی، گھوڑے اور گدھے جیسی سواریاں، کبوتر اور عقاب جیسے پرندے، سانپ اور بچھو جیسے حشرات اور گوشت اور دودھ دینے والے ان گنت زمینی اور سمندری مفید حیوانات موجود ہیں، مگر ان کی تخلیق کے لیے نہ کوئی نمونہ تھا اور نہ کوئی ساز و سامان۔ اس دنیا میں پہاڑ، سورج، چاند، ستارے، درخت، زمین، آسمان اور ان کے بیچ میں بے شمار تخلیقات ہیں جو بالکل منفرد اور انوکھی ہیں، مگر خدا نے انہیں بغیر کسی کے مشورے اور بغیر کسی خام مال کے تخلیق کر دیا۔

پھر بنانے والے نے جو بنایا تنہا بنایا۔ وہی انجینئر ہے، وہی منصوبہ ساز ہے، وہی مصور اور ڈیزائنر

ہے، وہی حساب کتاب رکھتا ہے اور وہی اعداد و شمار جمع کرتا ہے۔ اس پورے عمل میں جس وقت جن وسائل اور صلاحیتوں کی ضرورت ہوئی، وہ خدا نے بغیر کسی کی مدد کے تنہا فراہم کر دیے۔ ایک انسان کے لیے تنہا ہونا کمزوری کی علامت ہے، مگر خدا کی عظمت یہی ہے کہ سب کچھ اس نے تنہا کیا ہے۔

آخری بات یہ کہ اس نے جو بنایا اس میں کوئی عیب یا کمی نہیں۔ اس کی کسی تخلیق میں کوئی بہتری نہیں لائی جا سکتی نہ اس سے بڑھ کر کوئی نمونہ تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ اس بات کو اگر کوئی سمجھنا چاہے تو غور سے انسان کی اپنی بنائی ہوئی اشیاء کو دیکھے۔ اسے معلوم ہوگا کہ انسان کی ہر تخلیق دراصل کائنات میں موجود پہلے سے کسی مخلوق یا کسی نمونہ کی ایک بھونڈی اور کمزور نقل ہے۔ مثلاً ہوائی جہاز پرندوں کی، کشتیاں اور آبدوزیں مچھلیوں کی، ریل گاڑیاں اور موٹر کاریں حشرات اور حیوانی سواریوں کی اور کمپیوٹر انسانی دماغ کی ایک نقل ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ ہم خدا کی ایک عظیم کائنات میں رہتے ہیں۔ اس کی سب سے زیادہ خوبصورت تخلیق ہمارا یہ گھر یعنی ہماری زمین ہے اور اس کی سب سے شاندار اور عجیب مخلوق یہ انسان ہے۔ مگر نہ ہم زمین میں اس کی عظمت کو سراہتے ہیں اور نہ اپنے وجود میں موجود اس کی نشانیوں کو دیکھ کر اس کی حمد بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم میں سے ہر شخص جب کچھ تعمیر یا تخلیق کرتا ہے تو اپنی تعریف سننا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تخلیق و تعمیر کا عمل لازماً اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ اسے سراہا جائے، مگر پھر بھی ہم اس ہستی کی حمد و ثنا کو زندگی کا مقصد نہیں بناتے جس نے یہ کائنات بغیر کسی نمونہ اور بغیر کسی کی مدد کے بنائی ہے اور جو آنے والی دنیا میں ہمارے لیے جنت کی عظیم نعمت تعمیر کر رہا ہے۔

جو لوگ خدا کی اس دنیا میں خدا کی حمد کرتے ہیں وہی لوگ ہیں جو آخرت میں خدا کی بے مثال نعمت یعنی جنت میں بسائے جائیں گے۔ جنت کی قیمت کچھ نہیں بس بن دیکھے رب کی حمد کرنا اور اس کی مان کر زندگی گزارنا ہے۔ کتنی معمولی مگر کتنی فطری قیمت ہے یہ، مگر ہم یہ بھی نہیں دے پاتے۔

میں کیا کروں؟

''اپنی قوم کے مایوس کن حالات دیکھ کر میرا حوصلہ پست ہو جاتا ہے۔ سیاسی انتشار، بدامنی، مہنگائی، بے روزگاری، ہر دوسرے گھر میں بیٹھی بن بیاہی بہن بیٹیاں، ہر دوسرے ہفتے ہونے والے خودکش حملے، یہ سب میرا حوصلہ پست کر دیتے ہیں۔ اب تو جینے کا دل نہیں چاہتا، مجھے بتائیں میں کیا کروں؟''

ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے میں نے انہیں پیشکش کی کہ وہ میرے ساتھ چہل قدمی پر چلیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں پارک میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ پارک میں ہر طرف خدا کی دنیا بکھری ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہمارے بدن کو چھو کر گزرتے تو لگتا کہ فطرت اپنی خاموش آواز میں کوئی نغمہ چھیڑے ہوئے ہے۔ جگہ جگہ لگے رنگ برنگے پھول فطرت کی اس محفل میں روح تک اتر جانے والی کسی غزل کے اشعار کی مانند لگتے تھے۔ بادلوں کی اوٹ لیے سورج کی سنہری کرنیں شام کے افق پر سونے کی مانند بکھری ہوئی تھیں۔ نیلگوں آسمان کے پس منظر میں سرسبز اور سربلند درخت اپنے جمال و کمال کی گواہی آپ دے رہے تھے۔ گہری ہوتی ہوئی شام میں ہوا کے شانوں پر سوار پرندے اپنے گھروں کو لوٹنے کے لیے محوِ پرواز تھے۔

میں چلتے چلتے رکا اور ان کی طرف رخ کر کے کہنے لگا۔ آپ نے پوچھا تھا کہ آپ کیا کریں؟ آپ خدا کی دنیا میں جینا سیکھ لیں۔ پھر میں ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک ایسے پودے کی طرف لے گیا جس کی نرم و نازک کونپلیں ابھی سر اٹھا رہی تھیں۔ میں گویا ہوا: یہ ننھا پودا کبھی ایک بیج تھا جسے زمین میں دفنا دیا گیا تھا۔ مگر خدا کی دنیا میں ہر مشکل کے بعد آسانی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ بیج اپنی قبر سے نکل کر پودا بنا اور جلد ایک سربلند درخت بنے گا۔ خدا کی دنیا میں بدترین حالات کے بعد بہتری آتی ہے۔ آپ کی قوم مسائل کے بطن سے اپنا نیا وجود اگلنے کو تیار ہے۔ یہ پریشانیاں دردِ زہ کی سختیاں ہیں۔ آپ جلد دیکھیں گے کہ ان اندھیروں کے بعد نیا سورج طلوع ہونے کو ہے۔ میں خاموش ہو گیا، مگر ان کے چہرے پر امید کی چمک پیدا ہو چکی تھی۔ میرا ہاتھ تھامے وہ دوبارہ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔

ابدی خوشی

میں اور وہاج ٹہلتے ہوئے اپنے گھر والوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔سامنے تا حدِ نظر پھیلا ہوا سمندر تھا۔وہاج نے پوچھا کہ کیا جنت کی نعمتوں کی بھی کوئی حد نہ ہوگی۔شاید سمندر کی وسعت نے اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا کیا۔''کیا ہم وہاں بور نہیں ہوجائیں گے؟''

میں نے لمحے بھر کے لیے توقف کیا اور اس سے دریافت کیا۔یہ بتاؤ کہ انسان کتنے عرصے سے قصے کہانیاں سنا رہے ہیں۔کیا وہ کبھی ان سے بور ہوئے؟ان قصے کہانیوں نے افسانوں، ناولوں، اور اب ڈراموں نے فلموں کی شکل اختیار کرلی ہے۔کیا لوگ اِن سے بور ہوگئے ہیں؟انسان کتنے عرصے سے گا رہا ہے۔سننے والے سنتے چلے جارہے ہیں۔ہر روز ایک نئی دھن، ایک نیا گیت تخلیق ہوتا ہے۔مگر انسان کبھی بور نہیں ہوتا۔وہ نئی نئی تخلیقات کا منتظر رہتا ہے۔یہی جنت میں ہوگا۔

یہ واقعہ پرانا ہوگیا۔مگر کل میں قرآن پڑھتے ہوئے اس مقام پر پہنچا جہاں اس میں جنت کا پہلا تذکرہ ہے تو مجھے قرآن سے اپنی بات کی تائید مل گئی۔جنت کے اس تذکرے میں سب سے اہم بات یہی ہے کہ جب جب اہل جنت کو کوئی پھل بطور رزق ملے گا وہ کہیں گے کہ یہ تو ہمیں پہلے بھی دیا گیا ہے۔مگر قرآن یہ تبصرہ کرتا ہے کہ انہیں بظاہر یہ پھل پچھلے پھلوں سے ملتا جلتا لگے گا لیکن حقیقت میں یہ ایک بالکل مختلف پھل ہوگا۔نعمت کا یہی تنوع جنت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک خوشگوار مقام بنادے گا۔

انسان کبھی یکسانیت کو پسند نہیں کرتا۔انسان نعمتوں کی خواہش کرتا ہے۔مگر جیسے ہی یہ نعمت اس کی دسترس میں آتی ہے تو کچھ وقتی لذت کے بعد انسان بوریت کا شکار ہوجاتا ہے۔پھر وہ ایک نئی شے کی جستجو میں مشغول ہوجاتا ہے۔مگر اس دنیا میں طاقت، صحت، دولت، وقت اور زندگی کی محدودیت قدم قدم پر انسان کے آڑے آجاتی ہے۔جنت ہی وہ مقام ہے جہاں کوئی محدودیت نہ ہوگی۔اور اس سے بڑھ کر خدا اپنی ساری خلاقی کا مظاہرہ کرکے ہر روز اور ہر ساعت انسان کو ایک نئی نعمت اور لذت سے روشناس کرائے گا۔یہی جنت کی ابدی خوشی کا راز ہے۔

انسان اور حیوان

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ایک حیوانی قالب میں پیدا کیا ہے۔ آنکھ، ناک، کان اور دیگر اندرونی و بیرونی اعضاء میں انسان جانوروں سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہی حال جبلتوں (Instincts) کا ہے۔ بھوک، پیاس، تحفظ اور تولید کی خواہش جس طرح کسی جانور کو متحرک کرتے ہیں، اسی طرح انسانوں کو بھی آمادہ عمل کرتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ جانور اگر ایک لاکھ برس پہلے جنگل میں رہتے تھے تو آج بھی وہ جنگل میں ہیں۔ مگر انسان ترقی کرتے کرتے آج اس مقام پر آ گیا جہاں وہ بڑے بڑے شہر آباد کر چکا ہے۔

انسان کی اس ترقی کا سبب اپنے تجربات اور مشاہدات سے سیکھنے کی صلاحیت اور آگے بڑھنے کا جذبہ ہے۔ یہی دو چیزیں ہیں جو انسان کو زندگی میں مسلسل آگے بڑھاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو یہ صلاحیتیں دے کر اس دنیا میں بھیجا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان غلطی کرتا ہے، مگر وہ اس غلطی سے سیکھتا ہے اور اصلاح کر لیتا ہے۔ وہ زندگی کی دوڑ میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ مگر آگے بڑھنے کا جذبہ اسے سنبھالتا ہے اور دوبارہ آگے بڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔

سیکھنے اور آگے بڑھنے کی یہ صلاحیت جانور میں بھی ہوتی ہے، مگر وہ ان صلاحیتوں کا استعمال صرف بنیادی جبلی تقاضوں ہی کی حد تک کرتا ہے۔ جبکہ انسان میں یہ صلاحیت ان تقاضوں سے آگے بڑھ کر اپنی ذات کی اصلاح، اپنی شخصیت کے ارتقا، اپنے اخلاق کی درستی اور اپنے معمولات میں بہتری کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ مگر بہت سے انسان ایسے ہوتے ہیں جو اپنی ان صلاحیتوں کو صرف جانوروں ہی کی سطح پر استعمال کرتے ہیں۔ یہ کھاتے پیتے، شادی کرتے اور اولاد پیدا کرتے ہیں۔ اپنی بقا کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ مگر یہ درحقیقت ان کے حیوانی قالب کے بقا و ارتقا کی جدو جہد ہوتی ہے۔ یہ حیوانی قالب تو موت کے ساتھ ہی فنا ہو جاتا ہے۔

انسان کے وجود کا اصل حصہ اس کی شخصیت ہوتی ہے۔ یہ شخصیت ہے جو معاشرے کے خیر و شر پر

اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ شخصیت ہے جو انسانی تاریخ پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ یہ شخصیت ہے جو اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی زندگیاں بدل دیتی ہے۔ یہی شخصیت ہے جسے کل روز قیامت خدا کے حضور پیش ہونا ہے۔ جہاں اسے ایک نیا قالب دیا جائے گا۔ پھر اس شخصیت کے خیر وشر اور حسن و قبح اور اچھائی برائی کی بنیاد پر اس کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔

انسان اور جانور کا بنیادی فرق یہی ہے کہ جانور کی زندگی بس حیوانی قالب کی زندگی ہے۔ جبکہ انسان کی زندگی شخصیت کی زندگی ہے۔ یہ شخصیت اگر موسیٰؑ کی ہو تو بنی اسرائیل کی شکل میں ایک پوری قوم کی نجات اور اصلاح کا سبب بنتی ہے اور اگر فرعون کی ہو تو اپنی اور اپنی قوم کی تباہی کی وجہ بن جاتی ہے۔ یہ شخصیت اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو تو اربوں انسانوں کی ہدایت کا سبب بن جاتی ہے اور اگر ہٹلر کی ہو تو کروڑوں انسانوں کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔

اس شخصیت میں بہتری کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی سیکھنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیتوں کو صرف حیوانی تقاضوں تک محدود نہ رکھے۔ وہ کھائے پیئے اور سوئے مگر غور وفکر کو بھی اپنی زندگی میں کرنے کا ایک کام سمجھے۔ وہ کھیل کود، تفریح کو ضرور اختیار کرے، مگر علم اور مطالعہ سے بھی بے رخی نہ برتے۔ وہ نکاح کے ذریعے سے خاندان اور اولاد کی خوشیوں سے ہمکنار ہو، مگر ساتھ ہی معاشرے کے خیر وشر سے بے نیازی اختیار نہ کرے۔

ایک انسان کے لیے یہ کوئی قابل شرم بات نہیں کہ وہ حیوانی قالب کی ترقی کے لیے جدو جہد کرے۔ انسان کے لیے قابل شرم بات یہ ہے کہ وہ اپنے سیکھنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیتوں کو صرف اسی کام کے لیے مخصوص کر دے۔ کیونکہ ایسے انسان کی شخصیت میں کوئی ارتقا نہیں ہوتا۔ اس کے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کے رویے میں کوئی بہتری نہیں آتی۔ ایسے لوگ اپنے انسانی شرف کی توہین کرتے ہیں۔ یہ لوگ نہ معاشرے میں کوئی مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں اور نہ آخرت کی زندگی میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

عمران اور انضمام

عمران خان اور انضمام الحق پاکستانی کرکٹ کے دو ممتاز ترین نام ہیں۔ عمران خان کا شمار دنیا کے بہترین آل راؤنڈرز میں ہوتا ہے۔ وہ قومی ٹیم کے کپتان بھی رہے اور ان کی زیر قیادت پاکستان نے غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں۔ 1986 میں انڈیا کو انڈیا میں، 1987 میں انگلینڈ کو انگلینڈ میں شکست دینا اور 1992 میں ورلڈ کپ جیتنا ان کی سب سے نمایاں کامیابیاں ہیں۔ انہوں نے اپنے کیریئر میں 48 ٹیسٹ میچوں میں پاکستان کی قیادت کی، 14 جیتے، 8 ہارے اور 26 برابر رہے۔

انضمام الحق کا اصل میدان بیٹنگ تھا۔ وہ بھی عمران خان کی طرح نہ صرف پاکستان بلکہ کرکٹ کی تاریخ کے عظیم ترین کھلاڑی سمجھے جاتے ہیں۔ بحیثیت کپتان ان کی قیادت میں پاکستان نے 25 میچ کھیلے، 8 جیتے، 8 ہارے اور 9 برابر رہے۔ عمران خان کے برعکس جو اپنی قیادت کے دور میں زیادہ تر ان فٹ رہے، انضمام الحق نے اپنی کپتانی کے دور میں بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا۔ تاہم ان کی ٹیم عمران خان کی ٹیم کی طرح بڑی کامیابیاں حاصل نہ کرسکی۔

اس کا سبب کرکٹ کے مبصرین یہ بیان کرتے ہیں کہ عمران خان ایک فائٹر کپتان تھے۔ وہ بدترین حالات میں بھی حوصلہ نہیں ہارتے تھے۔ انہوں نے بیشتر کامیابیاں مشکل حالات میں حاصل کی تھیں۔ جبکہ انضمام کی ٹیم پر جب بھی دباؤ آتا ان کی ٹیم پرفارمنس نہ دے پاتی۔ بارہا ایسا ہوا کہ پہلی اننگز میں مخالف ٹیم نے بڑی لیڈ لے لی اور انضمام نے ٹی وی پر یہ بیان دیا کہ اب میچ نہیں بچایا جاسکتا۔ ظاہر ہے اس کے بعد ٹیم کا حوصلہ پست ہونا لازمی تھا۔

اس دنیا میں انسان کا سب سے بڑا سرمایہ حوصلہ ہوتا ہے۔ یہ حوصلہ اگر برقرار رہے تو انسان ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ وہ بدترین حالات میں بہترین نتائج پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا یہ حوصلہ دوسروں کو بھی بہترین نتائج دینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ مگر جب حوصلہ پست ہو جائے تو انسان بہترین صلاحیتوں کے باوجود مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر پاتا۔ یہی خدا کی دنیا کا قانون ہے۔

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

میں اپنے پرانے محلے میں کھڑا حسرت کے ساتھ ان ویران گلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ گلیاں تو گرمی کی تپتی ہوئی دوپہر میں بھی ویران نہ ہوتی تھیں۔کوئی نہ کوئی ہم نفس گھر سے نکلتا اور کسی یار غار کو ڈھونڈ ہی لیتا۔ پھر زمانے بھر کی باتیں ،دنیا بھر کے قصے، اپنی پرانی کہانیاں، ختم نہ ہونے والی داستانیں شروع ہوجاتیں۔ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا رفیق اس محفل ناتمام کا حصہ بنتا چلا جاتا۔

مگر آج تہذیب بدل گئی، وقت بدل گیا، مشاغل بدل گئے۔فکر معاش نے فرصت کی گھڑیوں کو بہت مختصر کر دیا ہے۔ان مختصر گھڑیوں سے بھی تنہائی کے جو لمحات مستعار لیے جاسکتے تھے، اسے ٹی وی کی ختم نہ ہونے والی مصروفیت نے چھین لیا ہے۔آج جس شخص سے ملیے اسے وقت نہیں ملتا۔وقت کیسے ملے؟ ''بندہ معاش'' اپنی توانائی کا ایک ایک قطرہ صرف کرنے کے بعد جب گھر پہنچتا ہے تو ساز و آواز، خوف و تجسس، طنز و مزاح اور علم و تفریح کے خزینے سمیٹے ایک رفیق شب اس کا منتظر ہوتا ہے۔

ٹی وی کی یہ رنگینی اسے کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیتی۔اسے مطالعے کا موقع نہیں دیتی۔ دوستوں کی محفلوں کو آباد کرنیکی فرصت نہیں دیتی۔قرابت داروں اور پڑوسیوں کے گھر جانے کی مہلت نہیں دیتی۔اسے تنہائی کے وہ لمحات نہیں دیتی جب وہ اپنے بارے میں غور کر سکے۔اپنی دنیا اور آخرت کے بارے میں غور کر سکے۔ملک اور ملت کے بارے میں غور کر سکے۔

بظاہر آج کا انسان بہت خوشحال ہے۔ وہ بہت خوش ہے۔وہ اچھے گھروں میں رہتا ہے۔ٹی وی، اے سی اور سواری کی نعمت سے مالا مال ہے۔اس نے اپنی خوشیوں اور تفریح کے لیے ایک سامان جمع کر رکھا ہے۔مگر آج کے انسان نے خود کو کھو دیا ہے۔ وہ ایک ایسا جانور بن گیا ہے جس کے ہر طرف ہری ہری گھاس رہتی ہے۔مگر وہ سوچنے والا، تنہائی میں بیٹھ کر حقائق پر غور کرنے والا انسان نہیں رہا۔

مجھے معلوم ہے کہ اب فرصت کے وہ رات دن لوٹ کر نہیں آسکتے ،مگر کوئی ہم ذوق تنہائی کے چند لمحات غور و فکر اور خود احتسابی کے لیے نکال لے تو اس فقیر کی صدا رائگاں نہیں جائے گی۔

عورت، مرد اور جنت

دور جدید میں عورتوں کے مقام و مرتبے کے بارے میں معاشرے کا رویہ بالعموم بہت تبدیل ہوا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے بہت سے سوالات اہل مذہب کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ان سوالات کا تعلق اس دنیا ہی سے نہیں بلکہ آخرت کی دنیا سے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک سوال اکثر یہ کیا جاتا ہے کہ جنت میں مردوں کو اگر حوریں دی جائیں گی تو خواتین کو کیا ملے گا؟

اس سوال کا ایک سادہ جواب تو وہ ہے جو قرآن نے جگہ جگہ دیا کہ جنت میں مرد و عورت کو تنہا تنہا نہیں بلکہ جوڑوں کی شکل میں رکھا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس جواب میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ خواتین کا جوڑا مردوں کے ساتھ بنے گا۔ ''عورتوں کو مرد دیے جائیں گے''، یہ تعبیر چونکہ حیا کے منافی تھی اس لیے قرآن نے جوڑے کا ذکر کیا ہے۔ جہاں تک حوروں کا سوال ہے بلاشبہ قرآن میں ان کا ذکر آیا ہے، مگر اتنی کثرت سے نہیں جتنا ہمارے ہاں بیان کیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ قرآن پاک میں صرف چار مقامات پر حوروں کا ذکر آیا ہے، جبکہ جوڑے بنائے جانے کا ذکر بکثرت آیا ہے۔

تاہم اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ انسانی نفسیات کے بعض ایسے تقاضے ہیں جن کی بنا پر مرد عورتوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے خواتین کو یہ فضیلت دے رکھی ہے کہ وہ نفسیاتی طور پر مردوں کی اس درجہ محتاج نہیں ہوتیں۔ خواتین کو مردوں کی ضرورت زیادہ تر معاشی یا سماجی حوالے سے ہوتی ہے، نفسیاتی طور پر نہیں۔ جنت کی زندگی میں نہ کوئی معاشی مسئلہ ہوگا نہ معاشرتی۔ البتہ نفسیاتی ضرورتیں اُس وقت بھی باقی رہیں گی۔ چنانچہ خواتین کو مردوں کی ضرورت اِس طرح نہیں ہوگی جس طرح مردوں کو خواتین کی۔ نتیجے کے طور پر خواتین کی قدر و منزلت بڑھ جائے گی، جبکہ مردوں کے لیے بعض مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ جنت کی زندگی میں حوروں کا وجود مردوں کے ایسے ہی بعض مسائل کا حل ہے۔

خواتین اطمینان رکھیں! انھیں حوروں جیسی کسی نعمت کی ضرورت نہیں۔ جنت کی زندگی میں تو ان کا اپنا وجود ایک عظیم نعمت ہوگا۔ یہ وہ فضیلت ہے جو جنت میں مردوں کو حاصل نہیں ہوگی۔

لکھ لیا کرو

انسانوں میں حرص اور لالچ کی اخلاقی خرابی عام پائی جاتی ہے۔لین دین،خرید وفروخت اور روپے پیسے کے دیگر معاملات کے وقت اس کا اظہار عام طور پر ہوتا رہتا ہے۔اسی طرح انسان کی طبیعت میں بھول اور نسیان کا مادہ بھی خلقی طور پر موجود ہے۔ہم نئی چیزیں یاد رکھتے ہیں اور پرانی چیزیں فراموش کرتے جاتے ہیں۔

انسانوں کے درمیان جب کبھی زر اور زمین کے معاملات پیش آتے ہیں تو طمع اور نسیان کے عناصر بارہا جھگڑے فساد کا سبب بن جاتے ہیں۔ وراثت،قرض اور خرید وفروخت کے معاملات میں تو اکثر اس کی نوبت آجاتی ہے۔ عام طور پر لوگ خرید وفروخت میں تو کچھ محتاط رہتے ہیں،مگر قرض اور وراثت کے معاملات چونکہ فوری نہیں ہوتے اور ان میں اکثر معاملہ اپنے قریبی لوگوں ہی سے پڑتا ہے،اس لیے لوگ محتاط نہیں رہتے اور کچھ عرصہ بعد باہمی اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔

دین نے اس معاملے میں ہماری یہ راہنمائی کی ہے کہ جب کبھی قرض کا معاملہ ہوتو پوری بات کو لکھ کر دو گواہ بنا لینے چاہییں۔اسی طرح وراثت کے مسئلے کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک پورا قانون دے کر خود حل کیا ہے۔ جو اس حکم کی تعمیل نہ کرے اسے جہنم کی وعید دی گئی ہے۔اس کے ساتھ وصیت کا ایک حکم دے کر امکانی طور پر پیدا ہونے والے جھگڑوں کا راستہ روک دیا ہے۔مگر بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں نہ قرض کے وقت گواہ اور تحریر کا اہتمام کیا جاتا ہے، نہ دین کے مطابق وراثت کی تقسیم کا۔اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اپنی وصیت لکھ کر رکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔

حالانکہ ان چیزوں کا اہتمام کرلیا جائے تو بہت سے اختلافات، دل شکنیوں اور تعلقات کی خرابی کی نوبت نہیں آتی۔مثلاً قرض کے معاملات میں رقم کی مقدار،اس کی ادائیگی کی شکل اور مدت پر بارہا اختلاف ہوجاتا ہے۔اس لیے ہمیشہ اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ قرض کی رقم کے ساتھ تحریری طور پر یہ بھی لکھ لیا جائے کہ یہ رقم کب واجب الادا ہوگی۔مقروض کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ قرض بہرحال اسے ادا کرنا ہے۔اس دنیا میں اگر وہ ادا نہیں کرے گا تو آخرت میں اسے اپنی نیکیوں کی کرنسی میں اس قرض کی ادائیگی کرنی ہوگی جو یقیناً بہت نقصان کا سودا ہوگا۔

اسی طرح وراثت کے دینی حکم کو نظرانداز کرکے اپنے مفادات کی بنیاد پر فیصلہ کرنا،اللہ تعالیٰ سے سرکشی اور بغاوت کے ہم معنی ہے،جس کا انجام سوائے جہنم کی آگ کے اور کچھ نہیں۔وراثت کے حکم کی طرح وصیت کا حکم

بھی بہت سے اختلافات کو پیدا نہیں ہونے دیتا۔ وصیت کے حکم کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ہمارے مال میں ہر چیز اس طرح نہیں ہوتی جس طرح کاغذات میں نظر آ رہی ہوتی ہے۔ مثلاً بہت سی زمین اور مال ایسا ہوتا ہے جو ہماری ملکیت ہوتا ہے، مگر ہم نے بعض مصالح کی بنا پر اسے کسی اور کے نام کر رکھا ہوتا ہے۔

بعض اوقات بہت سے وارثوں میں سے کسی ایک وارث کے نام کچھ زمین جائداد کر رکھی ہوتی ہے۔ بارہا اس بات کا کسی اور کو علم نہیں ہوتا اور جس کے نام جائداد ہوتی ہے وہ خاموشی سے اسے دبا لیتا ہے حالانکہ اس پر سب وارثوں کا حق ہوتا ہے۔ اگر دوسروں کو اس کا علم ہوتا ہے تو عموماً یہ ایک زبانی بات ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اختلافات اور جھگڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ عدالتوں کے چکر لگتے ہیں اور خاندانی تعلقات ختم ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں وصیت نہ لکھنے کا ایک اور سبب لوگوں کا یہ سمجھنا ہے کہ سب وارثوں کا حق اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے۔ حالانکہ اپنے مال کے ایک تہائی پر وصیت کا حق ہمیں بہر حال حاصل ہے۔ ہمارے ہاں عام دینی رائے یہ ہے کہ کسی وارث کو اپنی طرف سے کچھ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بات عام حالات میں بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بہت اہم دینی رائے یہ بھی ہے کہ کسی وارث کو اس کے حقِ قرابت کی بنا پر تو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے حصے سے زیادہ کچھ نہیں دیا جا سکتا، مگر ضرورت یا خدمت کی بنیاد پر یقیناً دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے اپنے پانچ بچوں میں سے چار کی شادیاں کر کے انہیں سیٹ کرا دیا۔ اب اس کا آخری بچہ یا بچی کم سن ہے تو اس کے بارے میں یہ وضاحت کی جا سکتی ہے کہ اگر میں اس کی شادی سے قبل مر جاؤں تو وراثت کی تقسیم سے قبل اس کی شادی کا خرچہ الگ کیا جائے گا، پھر جائیداد تقسیم ہو گی۔

یہ بات عین عدل پر مبنی ہے۔ شریعت کے کسی اصول کی روشنی میں اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے اور نہ اخلاقی طور پر اس بات میں کوئی خرابی ہے۔ اس لیے کہ باپ نے اگر چار بچوں کی شادی کا اہتمام کیا ہے تو پانچویں کو اس سے محروم رکھنا ایک ظلم ہو گا۔ شریعت کبھی ظلم گوارا نہیں کر سکتی۔ اس لیے یہ ہدایت کی جا سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ وصیت کے بغیر ممکن نہیں۔

ہم میں سے ہر شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی وصیت تحریر کرے۔ جس طرح بہت سے لوگ ہر رمضان میں زکوٰۃ کی ادائیگی کو معمول بناتے ہیں، اسی طرح ہر سال اپنی وصیت پر حالات کے مطابق نظر ثانی کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے بہت سے مسائل، ناانصافیوں، حق تلفیوں اور اختلافات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جنگل کا بادشاہ

انسانوں میں شیر جنگل کا بادشاہ مانا جاتا ہے۔شیر کو بہادری کی علامت سمجھا جاتا ہےاوراس حوالے سے کئی محاورے ہمارے ہاں عام ہیں۔دور جدید میں مغربی اہل علم نے جہاں اور بہت سی چیزوں کواپنی تحقیقات کا موضوع بنایا ہے وہیں جنگل اوراس میں پائے جانے والے جانداروں پر بھی بڑی تحقیقات ہوئی ہیں۔ان کے حالات، رویّوں اور معاملات کا مطالعہ کرنے کے لیےلوگوں نے اپنی زندگیاں وقف کردی ہیں۔اس موضوع پر کتابیں لکھی گئیں اورآج کل ڈاکومنٹری فلموں کےذریعے سےبھی ان معلومات کوعام کیاجارہاہے۔

جنگل کے دیگر باسیوں کی طرح شیر کے بارے میں بھی تحقیقات ہوئی ہیں۔ان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شیر کی بہادری کے بارے میں جو باتیں مشہور تھیں وہ محض ایک افسانہ تھیں۔شیر کی درست تصویر جنگل کے بادشاہ کی نہیں بلکہ جنگل کےایک درندے کی ہے۔شیر اتنا ہی بہادر ہوتا ہے جتنا اس کا حریف کمزور ہوتا ہے۔وہ ہرن پر حملہ کرتا ہےتو بڑی 'بہادری' سے کرتا ہے،مگر جب اس کا واسطہ زرافے جیسے معصوم مگر بلند قامت جانور سے پڑتا ہےتو وہ اتنا 'بہادر' نہیں رہتا۔کئی شیر عیاری اور خاموشی کےساتھ مل کر اسے قابو کرتے ہیں۔وہ اس کے سامنےآنے کی جرات نہیں کرتے اور پیچھے سے حملہ آور ہوتے ہیں۔جب وہ زخموں سے چور ہوکر گرجاتا ہےتب اس کی گردن پکڑ لیتے ہیں۔

جس طرح شیر کے بارے میں درست رائے تحقیق کے بعد ہی قائم ہوسکی اسی طرح انسانوں کے بارے میں بھی رائے ہمیشہ تحقیق کے بعدقائم ہونی چاہیے۔سنی سنائی باتوں سے کسی کی عظمت کے قصے تراشنا یاکسی فرد کےمتعلق غلط رائے قائم کرنا درست رویّہ نہیں۔اس رویّے کے بعدانسان جب کسی کےمتعلق بڑائی کاتصور قائم کرتاہےتواسے ہر طرح کی تنقید سے بالاتر قرار دے کرا کابر پرستی کی راہ ہموار کرتا ہے۔جب وہ کسی کےمتعلق منفی رائے قائم کرتاہےتواس کی طرف ایسے عیب منسوب کردیتاہے جواس میں نہیں ہوتے۔ یہ دونوں رویے دین واخلاق کےاعتبار سے جرم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ایک مومن پرفرض ہے کہ وہ ہمیشہ تحقیق کے بعدکسی کے بارے میں اظہار رائے کرے یا پھر خاموشی اختیار کرے۔

خوشی کا راز

میرے دفتر کے راستے میں بہت سی نرسریاں آتی ہیں۔ان کا مشاہدہ کرنا ہمیشہ میرے لیے قلب و نظر کی راحت کا سامان رہا ہے۔ ان کے رنگ برنگے پھول، خوش نما پودے، سرسبز و شاداب درخت راستے سے گزرنے والے ہر شخص کو ایک خوش گوار ذہنی کیفیت سے روشناس کراتے ہیں۔

اس راستے میں ایک ٹریفک سگنل بھی آتا ہے۔اس سگنل پر جب کبھی میں رکتا ہوں تو اپنی ساری توجہ پھولوں اور سبزے کی اس خوش نما دنیا کی طرف مرکوز کر لیتا ہوں۔ یہ توجہ اور ارتکاز مجھے ایک اور حقیقت سے آشنا کرتا ہے۔ وہ یہ کہ اس خوش نما منظر میں بہت سی ناگوار حقیقتیں موجود ہیں۔ پھولوں کے درمیان کیڑے کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ پھول پودوں کے رنگ و خوشبو کے ساتھ کھاد کی غلاظت بھی ہوتی ہے۔ درختوں کی بلندی پر جو سرسبز شاخیں جھولتی ہیں، وہ ایک نسبتاً بدنما اور بدرنگ تنے کے سہارے پر بلند ہوتی ہیں۔ یہ اور ان جیسے بہت سے ناگزیر حقائق اس دلکش دنیا کا لازمی حصہ ہیں۔

یہ حقائق ہمیں خدا کی دنیا کے ایک قانون سے روشناس کراتے ہیں۔ وہ یہ کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے جس اصول پر تخلیق کیا ہے، وہ آزمائش کا اصول ہے۔اس لیے یہاں حسن کے ساتھ بدصورتی، خوشبو کے ساتھ بدبو اور پھول کے ساتھ کیڑے کانٹے سب ہوتے ہیں۔اسی طرح دنیا میں خوشی کے ساتھ غم، آسانی کے ساتھ مشکل، راحت کے ساتھ زحمت اور امید کے ساتھ مایوسی ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔لیکن جس طرح پھولوں کی دنیا میں منفی حقائق کو قبول کر کے ہی رنگ و خوشبو اور حسن و سبزے کی بہار کا لطف اٹھایا جاتا ہے، اسی طرح زندگی کی تلخ حقیقتوں پر کڑھنے کے بجائے انھیں حوصلے سے قبول کرنے ہی سے انسان دنیا کی نعمتوں کا فائدہ اٹھانے کے قابل ہوتا ہے۔

خدا کی دنیا میں خوشگوار حالات کے ساتھ ہمیشہ منفی حالات پائے جائیں گے۔خوشی کا راز یہ ہے کہ اپنی نظر ہمیشہ اچھی چیزوں کی طرف رکھی جائے۔ جو بدلا جا سکے اسے بدلنے کی کوشش کرنے کے بعد ہر ناگوار چیز کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہی اس دنیا میں حقیقی خوشی کا راز ہے۔

لعنت نہیں بلکہ تربیت

بزرگوار کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ان کی زبان سے الفاظ نہیں آگ نکل رہی تھی ۔میں بڑے تحمل سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔اس گفتگو کا قدرے مہذب اور قابل بیان مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

''لعنت ہے اس قوم پر......آپ دیکھیے کہ اس ملک میں فوج کا سربراہ دو تہائی اکثریت رکھنے والے وزیر اعظم کو ہٹا کر اقتدار پر قبضہ کرتا ہے اور علانیہ ٹی وی پر کہتا ہے کہ میں نے کوئی (coup) نہیں کیا بلکہ یہ 'کاؤنٹر کو' تھا۔مطلب یہ کہ وزیر اعظم جو ملک کا انتظامی سربراہ ہے اگر فوج کے چیف کو اس کے منصب سے ہٹانے کی کوشش کرے تو اصل بغاوت یہ ہے۔ چنانچہ اس جرنل نے عوامی بغاوت کو کچل دیا اور پھر آٹھ برس تک اقتدار کے مزے لوٹتا رہا ہے اور قوم اسے برداشت کرتی رہی۔

اس ملک کا اپوزیشن لیڈر جو سیاست میں اسلام کے نام پر کھڑا ہے، علانیہ عہد کرتا ہے کہ وہ اور اس کی پارٹی اسمبلیوں سے استعفیٰ دے گی۔اس کے بعد وہ اپنے عہد سے مکر جاتا ہے۔مگر پھر بھی وہ اس قوم میں ایک لیڈر کی حیثیت سے موجود ہے،لعنت ہے اس قوم پر......اور دیکھیے کہ ملک کی سب سے بڑی پارٹی کا چیئر مین مری میں ایک معاہدہ کرتا ہے اور قوم سے وعدہ کرتا ہے کہ تیس دن میں جج بحال ہو جائیں گے۔ پھر وہ علانیہ یہ کہتا ہے کہ معاہدہ مری کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ پھر بھی قوم ایسے وعدہ خلاف لیڈروں کو برداشت کرتی ہے۔لعنت ہے اس قوم پر۔''

ان کی بات ختم ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ بزرگوار آپ کا غصہ بجا ہے لیکن یہ وقت لعنت کرنے کا نہیں ہدایت کی دعا کرنے کا ہے۔قوم کو یہ بتانے کا ہے کہ حلف توڑنے والا اور عہد توڑنے والا کوئی شخص لیڈر بنائے جانے کے نہیں بلکہ حضور کے الفاظ میں بے دین اور منافق قرار دیے جانے کے قابل ہے۔دیکھیے ! قوم اولاد کی طرح ہوتی ہے۔اولاد پر لعنت نہیں کی جاتی اس کی تربیت کی جاتی ہے۔

یہ آخری بات شاید ان کی سمجھ میں آ گئی۔انھوں نے سر جھکا یا خدا سے مخاطب ہو گئے۔میں جو ان کی گفتگو سنتے ہوئے دعا کر رہا تھا،ان کے جانے کے بعد اپنے قارئین سے مخاطب ہو گیا۔

مصر اور اسپین

مصر کا شمار دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ یہاں ہزاروں برس سے قبطی قوم آباد ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت مسیحی مذہب کی پیرو تھی۔ عربوں نے اس خطے کو حضرت عمرؓ کے دور میں فتح کیا۔ جس کے بعد یہ قوم جو صرف مذہب میں نہیں بلکہ تہذیب، ثقافت، زبان اور رسم و رواج ہر اعتبار سے عربوں سے مختلف تھی، عرب کلچر کا ایک حصہ بن گئی۔ مذہب سے لے کر زبان تک عربوں کے کلچر میں اس طرح ڈھلی کہ اب جغرافیائی طور پر بھی مصر کو مڈل ایسٹ میں شمار کیا جاتا ہے حالانکہ اصلاً یہ براعظم ایشیا کا نہیں بلکہ افریقہ کا ایک ملک ہے۔

خلفائے راشدین کے بعد جو پہلا بڑا ملک مسلمانوں کی سلطنت میں شامل ہوا وہ اسپین تھا۔ عربوں نے اسپین کو 92ھ (711ء) میں فتح کیا۔ یہاں مسلمانوں کا اقتدار 896ھ (1492ء) تک قائم رہا۔ مسلمانوں نے اسپین میں اپنے آٹھ سو سالہ دورِ اقتدار میں بڑے بڑے کارنامے سر انجام دیے۔ فلسفے اور سائنس کی عظیم دریافتیں اور تعمیر و ترقی کے ان گنت نمونے اسپین میں عربوں ہی سے منسوب ہیں۔ وہ کئی اعتبار سے دنیا بھر کے مسلمانوں سے آگے تھے۔ مگر مصر کے برعکس جہاں آج تک عربوں کی چھاپ لگی ہوئی ہے، اسپین کے عرب حرفِ غلط کی طرح اس سرزمین سے مٹا دیے گئے۔

سوال یہ ہے کہ مصر کے مقابلے میں اسپین کے عربوں کا انجام کیوں مختلف ہوا۔ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ مصر صحابہ کرامؓ نے فتح کیا تھا۔ وہ عرب بعد میں تھے، اسلام کے داعی پہلے تھے۔ ان کی دلچسپی اپنے اقتدار سے زیادہ بندوں کو خدا کی غلامی میں لانے سے تھی۔ انہوں نے مفتوح قوم پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے بجائے اسلام کا اقتدار قائم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام مفتوح قوم کے لیے حکمرانوں کا دین نہیں رہا بلکہ ان کا اپنا دین بن گیا۔ یہ تبدیلی اس مقام تک پہنچی کہ ہزاروں برس سے قائم قبطی تہذیب آج ماضی کی تاریخ کا ایک واقعہ ہے اور دنیا مصریوں کو عالم عرب کے ایک اہم حصے کے طور پر پہچانتی ہے۔

اس کے برعکس اسپین میں عربوں کے اقتدار کا تمام تر انحصار ان کی سیاسی قوت پر تھا۔ اسپین میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ تاریخ اس پر گواہ ہے کہ وہ اس عرصے میں اندرونی بغاوتیں کچلتے رہے یا پھر یورپ کی مسیحی قوتوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اپنے دورِ عروج میں وہ اپنی طاقت کی بنیاد پر مخالفین پر غالب رہے۔ انھوں نے علم و فن اور تعمیر و ترقی میں عظیم کارنامے سرانجام دیے۔ وہ مذہب سے بھی غافل نہ تھے اور علمی اور عملی طور پر دین سے وابستہ رہے۔ اسلامی تاریخ کے کئی نامور اہل علم کا تعلق اسپین سے تھا۔ مگر دین سے ان کی یہ وابستگی زیادہ تر دین کو سمجھنے، اس کے تحفظ اور اس پر عمل تک رہی۔ مگر انھوں نے کبھی اسلام کی دعوتی طاقت سے اہل یورپ کو مسخر کرنے کی کوشش نہ کی۔ انھوں نے ہمیشہ اہل یورپ کو ایک سیاسی حریف سمجھا، انہیں اسلام کا مدعو بنانے کی حقیقی کوشش کبھی نہ کی۔

اس بات کا اندازہ ابتدائی عربوں اور بعد کے عربوں کی غیر مسلم خواتین سے شادیوں کے نتائج سے کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے مسلمانوں کو اہل کتاب عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت اس لیے دی تھی کہ محبت کا یہ تعلق انھیں اسلام کی طرف راغب کر دے گا۔ چنانچہ ابتدائی عربوں نے اسی داعیانہ جذبے سے غیر مسلم خواتین سے شادیاں کیں اور انہیں اسلام کے حلقے میں لے آئے۔ مگر اسپین میں مسلمانوں نے مسیحی خواتین سے شادیاں انھی انسانی جذبات کی بنا پر کیں، جن کی بنا پر لوگ شادیاں کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ خواتین مسیحی ہی رہیں اور بارہا ان کے خیالات مسلمانوں میں فروغ پائے اور کئی دفعہ یہ مسلمانوں میں خانہ جنگی اور بغاوت کا سبب بن گئیں۔ چنانچہ جب تک مسلمانوں کی سیاسی قوت باقی رہی، ان کا اقتدار قائم رہا اور اس کے بعد وہ ماضی کی ایک داستان بن گئے۔

مصر اور اسپین کا یہ موازنہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی اصل طاقت سیاسی نہیں بلکہ نظریے کی طاقت ہے جو اگر ان کے دور عروج میں ان کے لیے بڑی اہم تھی تو ان کے دورِ زوال میں یہ اہم تر ہے۔ آج فرض کے درجے میں مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی دعوت کو اقوام عالم تک پہنچائیں۔ یہ ان کی ذمہ داری ہی نہیں ان کے زوال کے خاتمے کا سب سے موثر طریقہ بھی ہے۔

مغرب اور ہم

دورِ جدید مغربی تہذیب کا دور ہے۔ پچھلی پانچ صدیوں میں مغرب نے علم وفن، ثقافت وتمدن، قانون وسیاست، معیشت ومعاشرت اور سائنس وٹیکنالوجی میں وہ ترقی کی ہے جس نے انھیں دنیا کی غالب قوت اوران کی تہذیب کو دنیا کی برتر تہذیب بنادیا ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں دنیا پران کی سیاسی فتوحات نے اور بیسویں اوراکیسویں صدی میں میڈیا کی عالمی رسائی کی بناپراہل مغرب دنیا کے امام بن چکے ہیں۔

انسانی تاریخ میں مغرب کی یہ امامت کوئی انفرادی واقعہ نہیں۔اس سے قبل بھی اقوام عالم اسی طرح ایک دوسرے پرغالب آتی رہی ہیں۔کون نہیں جانتا کہ مغرب سے قبل یہ حیثیت مسلمانوں کو حاصل تھی۔تاہم بدقسمتی سے مسلمانوں کی یہی حیثیت موجودہ دور میں ان کے لیے بعض مسائل کا سبب بن گئی ہے۔اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ایک طرف وہ مغرب سے تصادم کی حالت میں ہیں اوردوسری طرف ان کی نئی نسلیں مغربی تہذیب وفکر کی اسیر ہوتی چلی جارہی ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ مغربی فکروتہذیب کا تجزیہ کرکے یہ بتایا جائے کہ اس میں کیا چیزیں ایسی ہیں جنھیں ہمیں اپنی میراث سمجھ کرقبول کرنا چاہیےاورکیاایسی ہیں جن پرہمیں کسی صورت سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے۔

مغربی تہذیب کی سب سے نمایاں خصوصیت علم کے میدان میں اس کی کامیابیاں ہیں۔آج مغرب کی کل طاقت،علم وتحقیق کی اس روایت میں پوشیدہ ہے جوکبھی مسلمانوں کا سرمایہ تھی۔علم کی یہ روایت کسی قوم یا ملت کا اثاثہ نہیں ہوتی بلکہ انسانیت کے عالمی سفر کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ لہٰذامسلمانوں پرلازم ہے کہ اس روایت میں خودکوشامل کریں۔جدیدسائنسی ترقی کواللہ تعالیٰ کی ایک نعمت سمجھیں اورعلم کے ارتقامیں اپنا حصہ ڈالنے کواپناملی فریضہ خیال کریں۔

مغرب کی دوسری نمایاں خصوصیت اجتماعی سطح پر اداروں کا قیام ہے۔معیشت وسیاست،

قانون و معاشرت، تعلیم و تربیت غرض زندگی کے ہر شعبہ میں مغرب نے اداروں کے ذریعے سے زندگی کے نظام کو محکم کردیا ہے۔ صرف ریاست ہی کو لے لیجیے تو مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ کو اوپر سے نیچے تک جس طرح منظّم کردیا گیا ہے وہ یقیناً انسانیت کے لیے ایک سرمایہ ہے۔ اس سرمائے کو ہم معمولی سی ترمیم و اضافے کے بعد بآسانی اپنی تہذیبی روایات میں ڈھال کر اپنا سکتے ہیں، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ بڑی حد تک اپنا چکے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ یہاں ہماری سوچ غلامانہ نہ ہو بلکہ مجتہدانہ انداز میں ترک و اختیار کا اپنا حق پورے اعتماد کے ساتھ استعمال کر کے چیزوں کو اپنایا جائے۔

مغربی تہذیب کی تیسری اساس آزادی کی بنیادی قدر (Value) ہے۔ دورِ جدید میں اس قدر نے مرد و عورت کے تعلق کو نکاح کے بندھن اور عفت کی قید سے آزاد کردیا ہے۔ اولاد کو والدین اور بیوی کو شوہر کی تابعداری سے آزاد کردیا ہے۔ نوجوانوں کو اساتذہ، خاندان اور پڑوس کے بزرگوں کی نگرانی اور تنبیہ و توجہ سے آزاد کردیا ہے۔

یہی وہ میدان ہے جہاں مغرب سے ہمارا اصل مقابلہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہماری تہذیب آزادی کے بالکل برعکس اصول یعنی عبودیت پر قائم ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے ہاں آزادی کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہم انسان کے مقابلے پر انسان کی آزادی کے قائل ہیں۔ لیکن انسان کو خدا کا بندہ سمجھتے ہیں اور اس کی مقرر کردہ حدود میں ہم بخوشی اپنی آزادی کھو دینے کے لیے تیار ہیں۔ دینی تعلیم کا گہرا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تین مقامات ہیں جہاں ہماری عبودیت یہ تقاضہ کرتی ہے کہ ہم اپنی آزادی پر کچھ قدغن لگائیں۔

پہلے مقام کو ہم قرآن پاک کی اصطلاح میں 'حفظ فروج' کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد و عورت کے تعلق میں ہم خود کو آزاد و بے لگام نہیں سمجھیں گے۔ ہمیں اپنی خواہشات نفس

ہر حال میں نکاح کے تعلق تک محدود رکھنی ہیں۔ زنا ہمارے ہاں گناہ سے بڑھ کر ایک جرم ہے۔عفت وعصمت بہرحال ہمارے ہاں ایک لازمی تقاضا ہے۔اس پر ہم سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔

دوسرا مقام 'حفظ مراتب' ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر حیثیت میں برابر ہیں، لیکن جب وہ کسی رشتے میں جڑتے ہیں تو ان کی حیثیت و مرتبے میں ایک نوعیت کا فرق آ جاتا ہے۔اس کو ایک مثال سے یوں سمجھیں کہ مرد وعورت بحیثیت انسان برابر ہیں۔لیکن میاں بیوی کے رشتے میں شوہر کو اور ماں بیٹے کے رشتے میں ماں کو ایک درجہ کی برتری حاصل ہو جاتی ہے۔جس کے نتیجے میں ان کا ادب، لحاظ اور اطاعت کی وہ تہذیبی اقدار جنم لیتی ہیں جنھیں ہم آزادی کے سیلاب کی نذر نہیں کر سکتے۔تیسرا مقام 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' ہے۔یعنی ہم اپنے معاشرے کے خیر وشر سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔آزادی کے نام پر ہم معاشرے میں عریاں فلموں، فحاشی کے اڈوں اور جوئے کے اڈوں کا وجود اجتماعی سطح پر گوارا نہیں کر سکتے۔

یہاں ایک اور بات کی وضاحت بھی ضروری ہے۔وہ یہ کہ مغرب ہمارے لیے اسلام کا مدعو ہے۔ہمیں دین کی دعوت پہنچانی ہے۔یہ دعوت جنگ وجدال کی موجودگی میں نہیں ہو سکتی۔نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم اخلاقی اور علمی سطح پر اتنے پست ہیں کہ فی الوقت مغرب کو جنگ کے میدان میں شکست نہیں دے سکتے۔ان دونوں وجوہات کی بنا پر یہ لازم ہے کہ ہم مغرب سے ٹکراؤ کا رویہ ترک کریں۔اپنی اخلاقی اور علمی حالت کو بہتر کریں۔مغرب کو دین کی دعوت پہنچانے،توحید کی منادی کرنے اور آخرت میں رب کے حضور پیشی سے خبردار کرنے کو اپنا مشن بنائیں۔یہی ہمارے لیے راہ عمل ہے۔یہی ہمارے لیے راہ نجات ہے۔

نافرمانی کی دو بنیادیں

قرآن میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے قصہ آدم و ابلیس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس قصے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دو چیزیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی بنیاد ہیں۔ ایک عریانی و فحاشی اور دوسرے اپنی بڑائی کے زعم میں مبتلا ہو کر سرکش ہو جانا۔ تاریخ اس پر گواہ ہے کہ انسانیت انھی دو بنیادوں پر بارہا صراط مستقیم سے بھٹکی ہے۔ یہاں تک کہ مذہبی لوگ بھی ان برائیوں میں پوری طرح مبتلا ہوئے۔ مگر مذہبی لوگ اپنے آپ کو حرف زنی سے بچانے کے لیے ان اعمال کا ارتکاب ہمیشہ دین کے نام ہی پر کرتے ہیں۔

پہلی چیز کی مثال ہمیں سورہ اعراف میں ملتی ہے جہاں قصہ آدم و ابلیس بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ قریش کو ان کی ایک صریح بے حیائی کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کا دستور تھا کہ وہ برہنہ ہو کر حرم کعبہ کا طواف کرتے۔ اس مکروہ عمل کے جواز کے لیے قریش نے ایک مذہبی عذر تراشا تھا۔ ان کے نزدیک باہر سے آنے والے لوگوں کے کپڑے زینتِ دنیا میں شامل ہیں جس کی حج جیسی درویشانہ عبادت میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ یا تو وہ قریش میں اپنے کسی جاننے والے سے اُس کے کپڑے مستعار لیں یا برہنہ ہو کر حرم کا طواف کریں۔ اس طرح خود قریش اور ان کے دوست احباب تو اس مکروہ عمل سے بچے رہتے، مگر دیگر لوگ، مرد ہوں یا عورت، برہنہ ہو کر حرم کا طواف کرتے اور قریش کے عیاش طبع لوگوں کے لیے ایک سامان لذت فراہم کرتے۔

قریش نے اس مکروہ عمل کو ایک مذہبی عمل اور بزرگوں کے دستور کے طور پر رائج کر رکھا تھا۔ وہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر انتہائی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور واضح کیا کہ وہ کبھی کسی فحش چیز کا حکم نہیں دیتے۔ قریش کی طرح تاریخ دیگر مذاہب کے نفس پرور لوگوں کی ایسی ہی کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ مندروں اور کلیساؤں میں پروہت اور پادری جو کچھ کرتے رہے اور جس طرح اپنی بدکرداری کو مذہبی تقدس دیتے رہے ہیں، اس سے تاریخ کے صفحات سیاہ ہیں۔

فحاشی کے علاوہ، جیسا کہ قصہ آدم وابلیس کے حوالے سے ہم نے بیان کیا، انانیت اور اپنی بڑائی کا ذہن وہ چیز ہے جو انسانوں کو اللہ کی راہ سے ہٹاتی ہے۔ عام لوگوں کی طرح مذہبی لوگ بھی اپنے دورِ زوال میں انانیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مگر عام لوگوں کے برخلاف ایک دفعہ پھر وہ اپنی انانیت اور تکبر کا جواز بھی مذہب کے نام پر پیش کرتے ہیں۔ قرآن پاک نے اس کی تصویر جگہ جگہ یہودیوں کی اُس سیرت وکردار کی شکل میں پیش کی ہے جنھیں معلوم تھا کہ حضور اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں، مگر وہ اس حقیقت کو مان کر نہیں دیتے تھے۔ یہودیت پر مبنی یہ رویہ آج کے دن تک عام ہے۔

چنانچہ آج جس مذہبی گروہ کو دیکھ لیجیے وہ اپنی بڑائی اور حق پرستی کے زعم میں گم ہوتا ہے۔ اسی پر بس نہیں وہ ہر دوسری رائے رکھنے والے کو کافر، مشرک، بدعتی، گمراہ اور مغرب کا ایجنٹ قرار دیتا ہے۔ وہ بدگمانی کرتا ہے، برے نام رکھتا ہے، مخالفت میں جھوٹ، دروغ گوئی، بہتان، غیبت، سب وشتم غرض اخلاقی دنیا کے ہر ضابطے کو پامال کرتا ہے اور ساتھ میں یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ ہم دین کے خادم اور اس کا دفاع کرنے والے ہیں۔

ایسے لوگ اپنے پیروکاروں اور اپنے ضمیر کو یہی کہہ کر مطمئن کرتے ہیں کہ سامنے والا فرقہ اور فکر بہرحال غلط ہے۔ اس لیے نہ ان کو جان سے مارنا غلط ہے اور نہ ان کے خلاف بہتان وجھوٹ کے تیر برسانا کوئی جرم ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مسلمانوں کے تمام فرقے ایک دوسرے کے نزدیک گمراہ، کافر اور واجب القتل ہیں۔

یہ رویہ نبیوں کی نہیں بلکہ شیطان کی میراث ہے جس نے اپنے تکبر کو خوبصورت الفاظ میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ عالم الغیب کے سامنے موجود تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے فوراً اس پر لعنت کردی۔ نزول قرآن کے وقت یہی رویہ یہودیوں کا تھا۔ ان پر بھی اللہ کی لعنت ہوگئی۔ آج مسلمانوں میں سے بھی جو لوگ اس رویے کو اختیار کریں گے، ان کا انجام بھی خدا کی لعنت کے سوا اور کچھ نہیں۔ چاہے وہ خود کو کتنا ہی بڑا خادم دین قرار دیں۔ چاہے اپنے پیروکاروں کی نظر میں وہ کتنے ہی بڑے عالم وفاضل کیوں نہ ہوں۔

محرومی کی نعمت

انسانوں کی دنیا میں محرومی سے بڑی کوئی آفت نہیں اور خدا کی دنیا میں محرومی سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ یہ بات پڑھنے والوں کو شائد ایک مذاق لگے، مگر بلاشبہ یہ سب سے بڑی حقیقت ہے۔

انسانی دنیا میں محرومی کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس لیے کہ محرومی کا مطلب دکھ، تکلیف، مایوسی، معذوری، بدحالی اور دوسروں سے پیچھے رہ جانا ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ محرومی اس دنیا میں ناگزیر طور پر پائی جاتی ہے۔ ہر شخص زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر محرومی سے گزرتا ہے۔ چھوٹی اور بڑی، عارضی اور مستقل، اپنی اور دوسروں کی محرومی۔ زندگی گویا کہ محرومی کی داستان سے عبارت ہے۔ لوگ مال سے، طاقت سے، صحت سے، تحفظ سے اور متعدد دیگر چیزوں سے محروم ہو سکتے ہیں۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان جتنی خواہشات کر سکتا ہے اتنی ہی محرومی کی قسمیں گنوائی جا سکتی ہیں۔

یہ محرومی انسانوں کو بدقسمتی لگتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان چاہے تو اس محرومی کو دنیا کی عظیم ترین طاقت میں تبدیل کر لے۔ دراصل اس دنیا میں انسان کو سب کچھ رب کی عطا ہی سے ملتا ہے۔ ایسے میں کوئی بندہ اگر ابرِ کرم کی اس برسات میں محروم رہ جائے تو اس پر ایک عظیم ترین دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہ دروازہ خدا تک براہِ راست رسائی کا دروازہ ہے۔ یہ پروردگار کے قرب کا دروازہ ہے۔ یہ دروازہ بڑی سے بڑی عبادت، انفاق حتیٰ کہ شہادت کے بعد بھی کھلوانا آسان نہیں۔ اس لیے کہ ہر عمل کو احتساب کے خدائی آپریشن سے گزرنا ہوگا جس میں نیت، خلوص اور محرکات کو پرکھا جائے گا۔

لیکن محروم آدمی صرف اپنی محرومی کی وجہ سے اس آپریشن سے نہیں گزارا جائے گا۔ اس کی محرومی اور اس کا صبر ہر قربانی کا نعم البدل بن جائے گا۔ اس کے گناہوں کے لیے مغفرت کا پروانہ ہوگا اور نعمتیں دیتے وقت رحمت کے لامحدود پیمانے سے اسے دیا جائے گا۔

محرومی خدا کی قربت کا راز ہے۔ وہ خدا جس کے ہاتھ میں آسمان اور زمین کے خزانے اور ان کی بادشاہی ہے۔ جس شخص نے اس راز کو جان لیا اس کی محرومی اس کی عظیم ترین راحت بن جائے گی۔

تالے کی چابی

''جانتے ہو اس دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور چیز کیا ہے؟'' یہ سوال پوچھ کر میں نے لمحے بھر کا توقف کیا اور غور سے اس نوجوان کے چہرے کو دیکھا جو اپنے مسائل اور پریشانیوں کی داستان سنا کر خاموش ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کو بدستور پژمردہ دیکھ کر میں دوبارہ گویا ہوا۔ ''امید اس دنیا کی سب سے طاقتور چیز ہے اور حوصلہ انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ یہ اگر تمھارے پاس ہے تو تم ہر کھوئی ہوئی چیز پا سکتے ہو۔''

اس نوجوان کی آنکھوں میں اب سوال پیدا ہو رہا تھا۔ وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا اور کہا۔ '' مجھے معلوم ہے تم کیا کہو گے؟ تم اپنے حالات کا دکھڑا روگے۔ اپنے مسائل کی داستان سناؤ گے اور پھر پوچھو گے کہ ان حالات میں کیا کیا جا سکتا ہے۔'' میرا یہ قیاس بلاوجہ نہیں تھا۔ کیونکہ پچھلے آدھے گھنٹے سے میری ہر بات کے جواب میں وہ اسی طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ اس لیے میرے نزدیک اب hammering کرنی ضروری تھی۔

''سنو اور غور سے سنو! یہ ہماری نہیں خدا کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں ستاروں کی وسعت سے لے کر خوردبینی خلیہ تک ہر لمحہ کھربوں زندگیاں جنم لیتی ہیں۔ وہ مردہ سے زندہ ہو جاتی ہیں۔ خدا یہ سب کچھ اپنی تخلیقی صفت کو استعمال کر کے کرتا ہے۔ اس نے تمھیں، مجھے ہر انسان کو یہ شرف بخشا ہے کہ اپنی تخلیقی صفت میں سے ایک حصہ ہم کو دیا ہے۔ اس صفت کو استعمال کر کے ہم زندگی کے ہر اندھیرے کو روشنی، شر کو خیر اور مشکل کو آسانی میں بدل سکتے ہیں۔ صرف سوچنے کا انداز تعمیری ہونا چاہیے۔ یہ تعمیری انداز امید اور حوصلہ سے جنم لیتا ہے۔ اس کے بعد انسان بڑا ہو جاتا ہے اور مسئلہ چھوٹا ہو جاتا ہے۔ انسان ذہن کی ناقابل شکست تخلیقی صلاحیت کو استعمال کر کے ہر مسئلے کا ایک حل تلاش کر لیتا ہے۔''

پہلی دفعہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ جاتے وقت وہ کہنے لگا، '' آپ نے میرا کوئی بند تالا تو نہیں کھولا، لیکن مجھے سمجھا دیا کہ ہر بند تالے کی چابی امید کی دکان سے مل سکتی ہے۔ یہی بہت ہے۔''

برستی بارش کا پیغام

بارش کے قطرے آسمان کی بلندی سے زمین کی پستی پر مسلسل برس رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ قطرے زمین پر آسمان کا قرض ہیں۔ دیر نہ ہوگی کہ زمین یہ قرض ان درختوں کی شکل میں لوٹا دے گی جو زمین کی تہہ سے نکلتے ہیں اور آسمان کی طرف نگاہیں جمائے بلند ہوتے رہتے ہیں۔

پھر میری نگاہ اس 'قرض' پر پڑی جو پہلے ہی چکا دیا گیا تھا۔ ان خوشنما درختوں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ بارش نباتات اگاتی ہے، مگر وہ ان کو بدل نہیں سکتی۔ پھل والے درخت پھل ہی دیں گے اور کانٹوں والے پودے کانٹے ہی اگائیں گے۔ اس لیے کہ بارش وہی اگاتی ہے، جو بیج میں ہوتا ہے۔ بیج ہی کانٹا ہے اور بیج ہی پھول۔

یہی حال ایمان و اخلاق کی دعوت کا ہے۔ یہ بارش کی طرح انسان پر برستی ہے۔ کچھ وجود بنجر زمین کی طرح ہوتے ہیں۔ بارش سے پہلے بھی صحرا اور بارش کے بعد بھی بنجر۔ مگر بہت سے انسان اس برسات کا قرض اتار دیتے ہیں — اس دعوت کو قبول کر کے، پکار پر لبیک کہہ کر۔ مگر اس کے بعد بھی بعض شخصیتوں سے خرابی نہیں جاتی۔ ان کے وجود پر اخلاق کے پھل نہیں اگتے، بداخلاقی کے کانٹے نکلتے ہیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے، آج مجھے اس سوال کا جواب مل گیا۔ مسئلہ دعوت کی بارش کا نہیں۔ شعور کی زمین کا نہیں۔ مسئلہ شخصیت کے بیج کا ہے۔ بیج اگر پیدا ہی شخصی کمزوریوں اور کردار کی خامیوں کے ساتھ ہوا ہے تو شعوری طور پر قبول ایمان کے بعد بھی اس پر اخلاق کے پھل پھول پیدا نہیں ہو سکتے۔

جس شخص کی زندگی بدانتظامی کا نمونہ ہو وہ کسی جگہ وقت پر پہنچنے کا وعدہ کیسے نبھائے گا۔ جس کی زندگی بے اعتدال جذباتیت سے عبارت ہو وہ غصے پر کیسے قابو پائے گا۔ جس کا خمیر جلد بازی سے اٹھا ہو وہ صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا کرے گا۔

اخلاق کو دعوت بنانا کافی نہیں، اسے شخصیت بنانا ہوگا۔ علم کی اصلاح کافی نہیں، کردار کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ برستی بارش اپنی رم جھم میں مجھے یہ پیغام دے گئی۔

پھسلنے والے

غالباً فٹ پاتھ پر کوئی چکنی چیز یا کیلے کا چھلکا کسی غیر ذمہ دار شخص نے پھینک رکھا تھا۔ اس لیے جیسے ہی نوجوان نے اس پر قدم رکھا، وہ لڑکھڑا گیا اور پھسل کر گر گیا۔ لمحہ بھر کے لیے وہ حواس باختہ ہوا اور پھر کپڑے جھاڑتا، جسم سہلاتا کھڑا ہو گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر کچھ لوگ نوجوان کو سہارا دینے کے لیے آگے بڑھے، کچھ نے تاسف کا اظہار کیا اور کچھ ایسے بھی تھے جن کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

یہ منظر آخری لمحے میں میں نے بھی دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے میرے دل میں ہمدردی کی ایک لہر اٹھی مگر نوجوان کو اٹھتا دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ لیکن اس کے بعد بے اختیار میرے منہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعا نکلی جس کے ایک حصے کا مفہوم اس طرح ہے۔

''اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں......میں پھسل جاؤں یا کسی اور کے پھسلنے کا باعث بنوں......''

اس دعا میں جس پھسلنے کا ذکر ہے وہ یقیناً اس نوجوان کا پھسلنا نہیں تھا۔ یہ تو میرا ایک فوری ردعمل تھا۔ لیکن جس پھسلنے کا اس دعا میں ذکر ہے وہ کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ یہ پھسلنا صراط مستقیم سے پھسلنا ہوتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان شارع زندگی پر سیدھا جا رہا ہوا اور اچانک اس کے سامنے اس کا مفاد آ جائے، اس کی خواہش آ جائے، اس کے جذبات آ جائیں، اس کے تعصّبات آ جائیں۔ انسان لین دین کا معاملہ کر رہا ہو۔ حقوق و فرائض کا تعین کر رہا ہو۔ انسان بات کر رہا ہو، انسان بازار سے گزر رہا ہو، انسان کمرے میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہو۔

ان تمام مواقع پر کوئی باطل عمل، کوئی حق تلفی، کوئی فحش منظر، ظلم و ناانصافی کا کوئی موقع، مفاد اور خواہش کا کوئی لمحہ، حرص و لالچ کا کوئی امکان کیلے کے ایک چھلکے کی طرح، چکنائی اور پھسلن کی طرح، کیچڑ اور پانی کی طرح، اس کے راستے میں آتی ہے اور انسان کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں۔ وہ ڈگمگاتا ہے اور گر پڑتا ہے۔ مگر یہ وہ مقام ہے جہاں اصل فرق شروع ہوتا ہے۔ کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو گرنے کے بعد فوراً اٹھ جائیں، لڑکھڑانے کے بعد فوراً سنبھل جائیں، پھسلنے کے بعد فوراً کھڑے ہو جائیں۔

انسانوں کی اکثریت اس پھسلنے کو انجوائے کرتی ہے۔ان کا پاؤں جب کیلے کے کسی 'چھلکے' پر پڑتا ہے تو بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ان کا ضمیر، ان کا ایمان، ان کی فطرت اور ان کی عقل سلیم انھیں بتادیتی ہے کہ ہوشیار ہو جاؤ، مگر وہ اس آواز کو نظر انداز کر کے خوشی خوشی پھسلنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔اس لیے کہ ان کے وجود کو کوئی چوٹ نہیں لگتی بلکہ مزہ آتا ہے۔نفس کو خوشی ہوتی ہے۔اندر کے حیوان کو تسکین ملتی ہے۔ زخمی اگر ہوتا ہے تو ایمان ہوتا ہے۔اخلاقی وجود ہوتا ہے۔ظاہر ہے اس چوٹ کا جتنا کچھ درد ہے اور بلاشبہ بہت شدید درد ہے، وہ قیامت کے دن ظاہر ہوگا اور جب ہوگا تو انسان سر پکڑ کر روئے گا کہ یہ کیا ہو گیا۔مگر اس دن نہ کوئی سہارا دینے والا ہوگا نہ کوئی تاسف کرنے والا۔

چنانچہ سطح بین اور جلد باز انسان پھسلنے کو اپنی عادت بنا لیتے ہیں۔وہ بار بار کیچڑ کے پاس سے گزرتے ہیں تاکہ پھسلنے کا کوئی موقع مل جائے۔وہ ٹی وی کے چینل بدلتے ہیں، گرلز کالج اور بازاروں کے چکر کاٹتے ہیں، دفتروں میں کسی ضرورت مند سے رشوت کے بہانے ڈھونڈتے ہیں، دکانوں میں بیٹھ کر اپنی چرب زبانی سے فریب کے جال بنتے ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ پھسلنے والے نہیں رہتے، گرنے والے نہیں رہتے بلکہ ہمیشہ کے لیے گر جاتے ہیں۔وہ دوسروں کی راہ میں چھلکے ڈالنے والے انہیں پھسلنے پر آمادہ کرنے والے، انہیں بھٹکانے والے بن جاتے ہیں۔یہ سرکشی ہے۔یہ وہ جرم ہے جس کی معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔جہنم کی آگ اصل میں ایسے ہی لوگوں کے لیے بھڑکائی جارہی ہے۔مگر جو شخص پہلی دفعہ پھسلنے کے بعد اٹھ جاتا ہے وہ گرنے والوں میں نہیں ہے کیونکہ اس راہ میں

وہ بھی نہیں گرا جو گرا پھر سنبھل گیا

اٹھنے کا یہ رویہ، سنبھلنے کی یہ عادت، لوٹ آنے کا یہ راستہ، توبہ کا یہ طریقہ جنتیوں کا طریقہ ہوتا ہے۔یہ ان کا طریقہ ہوتا ہے جنھوں نے اپنی خواہش، لذت، مفاد اور ضرورت کی مکمل تسکین کے لیے قیامت کے دن تک انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہوتا ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ختم نہ ہونے والی دنیا اور ہمیشہ کے مزوں میں آباد کر دیا جائے گا۔

نماز اور خدا کی یاد

نماز اسلام کا سب سے زیادہ مطلوب اور بنیادی فریضہ ہے۔ اسی لیے اس کی طرف اکثر توجہ دلائی جاتی ہے۔ چنانچہ ہر وہ شخص جو دین کی طرف راغب ہوتا ہے نماز کی پابندی سے اپنی دین داری کا آغاز کرتا ہے۔ اس طرح معاشرے میں نمازیوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے، مسجدیں آباد ہو رہی ہیں، اذان و اقامت کی آوازوں سے فضا معمور ہے۔ مگر اس کے باوجود فرد اور معاشرے میں جو تبدیلی آنی چاہیئے، وہ نہیں آ رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں نماز کی جتنی کچھ اہمیت اور پابندی ہے وہ اس کے ظاہر کے لحاظ سے ہے۔ ہمارے ہاں نمازی وہ ہے جس کے روزمرہ کے معمولات میں نماز ادا کرنے اور مسجد جانے کی مصروفیت بھی شامل ہے۔ بلاشبہ یہ عین مطلوب ہے۔ لیکن درحقیقت یہ نماز کا نقطہ آغاز ہے۔ اس فریضے کی صحیح تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب نماز قرآن کے الفاظ میں ''خدا کی یاد'' (طٰہ 20 :14) کا ذریعہ بن جائے۔ نماز ادا کرنے کا عمل انسان پر اس طرح اثر انداز ہو کہ خدا کی ہستی اس کے خیالات پر چھا جائے اور انسان خدا سے رابطے میں آ جائے۔ مگر دورانِ نماز اکثر ہمارے ذہن میں دوسرے خیالات کا غلبہ رہتا ہے۔ چنانچہ ہماری نماز ہمارے اندر مطلوبہ اوصاف پیدا نہیں کر پاتی۔ ہم نماز پڑھتے ہیں پھر بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ جھوٹی قسم کھا کر مال بیچتے ہیں۔ خدا کے بندوں کے حقوق پامال کرتے ہیں۔ انسانوں کی تحقیر کرتے ہیں۔ غرض وہ سب کچھ جو ایک غیر نمازی کر سکتا ہے ہمارے معاشرے کا نمازی بھی کرتا ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ نماز کے داخلی پہلو یعنی ''خدا کی یاد'' کو پوری طرح سے اجاگر کیا جائے تاکہ لوگوں میں اس کی اہمیت کا احساس اور حصول کی خواہش پیدا ہو۔

خدا کی یاد کے حوالے سے نماز میں دو چیزیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ اول خدا کی بڑائی، دوسرے خدا کی پاکی کا بیان۔ اللہ اکبر اور سبحان اللہ، نماز میں سب سے زیادہ دہرائے جانے والے الفاظ ہی نہیں ہیں۔ بلکہ دو ایسی بنیادی حقیقتوں کا بیان ہے۔ جن کا صحیح ادراک انسانی نفسیات اور نتیجتاً اس کے عمل کو یکسر بدل دیتا ہے۔

پہلے اللہ اکبر کو لیجئے۔ یہ کلمہ انسان کو بار بار یاد دلاتا ہے کہ اس کا رب ایک بڑی ہستی ہے۔ اس سے بڑی ہستی ہے۔سب سے بڑی ہستی ہے۔انسان جو فطری طور پر کسی بڑے کی پکڑ سے ڈرتا ہے، جب خدا کا یہ تعارف بار بار حاصل کرتا ہے تو پہلے دوران نماز، ذہن کی دنیا میں، وہ خدا کے سامنے چھوٹا ہو جاتا ہے اور پھر نماز سے باہر عمل کی دنیا میں بھی اس کے سامنے سر جھکائے رکھتا ہے۔ جب کوئی ایسا لمحہ اس کے سامنے آتا ہے جس میں وہ طاقت ور ہوتا ہے کہ ظلم کرے، آزاد ہوتا ہے کہ نافرمانی کرے، با اختیار ہوتا ہے کہ کسی کا حق مارے تو وہی نماز والا بڑا خدا اسے یاد آجاتا ہے۔ پھر وہ طاقتور، آزاد اور با اختیار انسان چھوٹا ہو جاتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ وہ اس بڑے خدا سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ پھر مجمع تو در کنار، تنہائی میں بھی گناہ نہیں ہوتا۔ ظاہر میں تو کجا، باطن کی گہرائیوں میں بھی معصیت کا گذر نہیں ہوتا۔ وہ خدا کے حقوق پامال کرتا ہے نہ بندوں کے۔ وہ دین کی حدیں توڑتا ہے نہ فطرت کی۔ نماز کے ہر رکن کے ساتھ اللہ اکبر کی یاد دہانی انسان کو پابند کر دیتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی بڑائی کو مانے اور اس کے تقاضے کو پورا کرے۔

تکبیر کے ساتھ نماز کی دوسری یاد دہانی تسبیح سے ہے۔ تسبیح کیا ہے؟ اس بات کا اعتراف ہے کہ خدا بے عیب ہے۔ ہر کمی، ہر غلطی سے پاک ہے۔ ہر تشبیہ، ہر تمثیل سے منزہ ہے۔ وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کی اعلیٰ اور عظیم ہستی کو ہونا چاہیئے۔ انسان نماز کا آغاز اس حقیقت کے اقرار سے کرتا ہے۔ رکوع میں اس بات کو مان کر جھک جاتا ہے اور سجدے میں اس حقیقت کے اعتراف میں اپنا ماتھا زمین پر رکھ دیتا ہے۔

خدا کے سبحان ہونے کو جاننا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس حقیقت کو جانے بغیر ایک طرف انسان خدا سے وہ کچھ منسوب کرتا ہے جو اسے شرک و الحاد تک پہنچا دیتا ہے، تو دوسری طرف بندے اور رب کے درمیان جو اعتماد و محبت کا تعلق ہونا چاہیے اور جو در حقیقت روح کی غذا ہے، وہ کبھی پیدا نہیں ہوسکتا۔

انسان ایک ظاہر پرست مخلوق ہے۔ وہ خالق جو مجسم نہیں اس سے کہیں زیادہ، اپنے جذبۂ عبودیت کی تسکین کے لیے اسے وہ مخلوق پسند آتی ہے جسے وہ دیکھ سکے، چھو سکے اور جو اس کے احاطۂ خیال میں

آ سکے۔ چنانچہ انسان مخلوق کا ایک پیکر لیتا ہے اس میں خدا کی صفات ڈالتا ہے۔ پھر کبھی خدا سے اس کا نسب ملاتا ہے، کبھی اسے خدا کا مقرب ٹھیراتا ہے۔ پھر نمازی نماز پڑھتا ہے، رب کی تسبیح کرتا ہے مگر اس کے ساتھ غیر اللہ کو بھی پکارتا ہے، اس کے لیے روتا ہے، اس کے حضور میں نذریں پیش کرتا ہے اور اس سے دعائیں مانگتا ہے۔ اس کے بعد غیرت مند خدا اپنے حصے کی عبادت بھی اپنے شریک کو دے دیتا ہے۔

اس حقیقت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان بے حد حساس واقع ہوا ہے۔ پھر وہ ایک ایسی دنیا کا باسی ہے، جہاں ظلم عام ہے۔ یہاں اکثر وہ ہوتا ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں روز ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو ایک حساس انسان کو تڑپا دیتے ہیں۔ وہ کمزوروں کو مظلوم، اچھوں کو دکھی اور بے قصوروں کو پریشان دیکھتا ہے۔ ایسے میں اگر خدائے سبحان اس کے ذہن میں پورے طور پر زندہ نہ ہو تو وہ ایسے ''بے حس'' خدا کا منکر ہو جاتا ہے۔ وہ اس خدا سے بے نیاز ہو جاتا ہے جو ظلم ہوتے ہوئے دیکھے مگر خاموش رہے۔ جس کا ہاتھ ظالم کو پکڑنے کے لیے تو نہیں اٹھتا مگر معصوموں پر زلزلے، سیلاب، موت، معذوری اور پریشانی بھیجنے کے لیے خوب حرکت میں آتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے نام لیواؤں کو بدترین حالات میں بھی تنہا چھوڑ دیتا ہے۔

یہ تسبیح کا عمل ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ خدا نہ بے بس ہے نہ بے حس، نہ وہ رعایا سے بے پرواہ بادشاہ ہے، نہ ثبوت و گواہی کے لیے محتاجِ قانون، وہ تو پاک ہے، عظیم ہے، اعلیٰ ہے...... اس دن کا منتظر جو بہت جلد آنے والا ہے۔ جس دن ہر سرکش اور ظالم کا ٹھکانہ جہنم اور ہر نیکوکار کا مقام جنت کی ابدی نعمتیں ہوں گی۔ چنانچہ تسبیح انسان کو شرک، الحاد، مایوسی اور بے عملی سے بچاتی اور مشکل ترین حالات میں بھی اس کو خدا کے آگے جھکائے رکھتی ہے۔

اس طرح نماز کے یہ داخلی پہلو یعنی تکبیر و تسبیح، متقی، باعمل، حوصلہ مند اور صاحبِ ایمان انسان کو جنم دیتے ہیں۔ وہ انسان جن کی آج کے دور میں سب سے زیادہ کمی ہے۔

ایک دن کا روزہ

رمضان کا ہماری پوری زندگی سے کیا تعلق ہے، اس حقیقت کو ایک عارف نے کمال خوبصورتی سے اس طرح بیان کیا ہے: ہم اس دنیا میں ایک دن کے لیے آئے ہیں ......اور اس دن ہم نے روزہ رکھ لیا ہے۔

انسان اس دنیا میں جب آنکھ کھولتا ہے تو وہ خود کو نعمتوں کے سمندر میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ اسے بھوک میں کھانا، پیاس میں پانی، نیند کے لیے پرسکون رات، کام کے لیے روشن دن، جینے کے لیے رشتوں کا تعلق اور رہنے کے لیے کرہ ارض جیسا آرام دہ گھر ہی نہیں دیا گیا، بلکہ اس کی زبان کے لیے لذیذ ترین ذائقے، سماعت کے لیے نرم و شیریں آہنگ، بصارت کے لیے ان گنت رنگوں کی برسات اور قوت شامہ کو معطر کر کے روح تک اتر جانے والی خوشبوؤں کی مہک بھی عطا کی گئی ہیں۔

نعمتوں کی یہ حسین دنیا اسے بتاتی ہے کہ اس کا ایک خالق اور مالک ہے جس کی مہربانیوں کے اعتراف میں اسے سراپا شکر اور سراپا اطاعت بن جانا چاہیے۔ اسے رب کی نافرمانی کے ہر راستے سے رک جانا چاہیے۔ مگر اس کی خواہشات، ضروریات، انسانی کمزوریاں اور حیوانی جذبات اکثر اسے اطاعت کے سیدھے راستے سے ہٹا کر نافرمانی کی پگڈنڈیوں پر لے جاتے ہیں جن پر چلنے سے صرف جہنم کی منزل سامنے آتی ہے۔

ایسے میں رمضان کا روزہ اسے یاد دلاتا ہے کہ اسے کیسی اعلیٰ نعمتیں دی گئی ہیں اور ان کے جواب میں اسے نافرمانی کے ہر کام سے رک کر، عمرِ رواں کے بس ایک ہی دن کا تو روزہ رکھنا ہے۔ جس دن کے بعد حیاتِ جاوداں کا وہ دور آئے گا جب ہر پابندی اٹھالی جائے گی اور ہر سختی آسان کر دی جائے گی۔ یہی رمضان کی مشقت کا حاصل ہے۔

زکوٰۃ اور نذر

ہمارے ہاں زکوٰۃ کو ایک بہت اہم عبادت کے طور پر ادا کیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ جو نماز نہیں بھی پڑھتے ، زکوٰۃ بڑی پابندی سے دیتے ہیں۔ تاہم ہمارے ہاں لوگ زکوٰۃ کو غریبوں کی مدد کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ زکوٰۃ اصل میں کیا ہے اور کیوں ادا کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے رمضان کا مہینہ مقرر کرلیا گیا ہے، اس لیے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ اس موقع پر زکوٰۃ کی حقیقت سے متعلق لوگوں کی کچھ راہنمائی کر دی جائے۔

زکوٰۃ اپنی حقیقت کے اعتبار سے نذر ہے۔ نذر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے مال کا ایک حصہ اپنے معبود کو راضی کرنے کے لیے بطور نذرانہ اس کے حضور پیش کر رہا ہے۔ قدیم زمانے میں جب شرک کا غلبہ تھا تو لوگ مندروں اور معبدوں میں جا کر اپنا مال مختلف شکلوں میں بتوں کی بھینٹ چڑھاتے تھے اور پھر یہ مال معبد کے خدام وہاں آنے والے زائرین کی ضروریات پر خرچ کرتے۔

اسلام نے اس صورتحال کو تبدیل کیا۔ خدا کے حضور نذر کو زکوٰۃ کی مستقل عبادت کی شکل دے کر اسے نظم اجتماعی، غریبوں کی مدد اور ضرورتمندوں کے لیے خاص کر دیا۔ تاہم اس کے پیچھے جو روح اور جذبہ ہے وہ اسی طرح باقی ہے۔ آج بھی جب کوئی شخص زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو وہ کسی انسان کو کچھ نہیں دے رہا ہوتا، بلکہ اپنا سر اور دل جھکا کر، اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر، لہجے میں عاجزی اور پستی پیدا کر کے دراصل اللہ تعالیٰ کو پیش کرتا ہے۔

البتہ جو شخص سر اٹھا کر، احسان جتلا کر، دبنگ لہجے کے ساتھ انسانوں کو زکوٰۃ دینے کی کوشش کرتا ہے، اس کا مال تو خرچ ہو جاتا ہے، مگر پروردگار عالم کی بارگاہ سے ایسے شخص کو سند قبولیت نہیں ملتی۔ اس لیے کہ خدا کی بارگاہ میں کوئی گردن اس قابل نہیں کہ بلند ہو کر شرف قبولیت حاصل کر سکے۔ اس کے حضور صرف عاجزی اور پستی قبول ہوتی ہے۔

زکوٰۃ دینے اور انفاق کرنے والوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ انسانوں کو دے رہے ہیں تو بلاشبہ سر اٹھا کر دیں، لیکن مال اگر رب کی نذر کر رہے ہیں تو سر جھکا ہوا رکھیں۔ یہی درِ قبولیت کا راستہ ہے۔

Shock Absorber

گاڑی اسپیڈ بریکر تک پہنچ گئی مگر اس کی رفتار کم نہ ہوئی۔ مجھے اور ہر دیکھنے والے کو یہ یقین تھا کہ گاڑی اسپیڈ بریکر سے گزرے گی اور اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو ایک زوردار جھٹکا لگے گا۔ گاڑی واقعی اسپیڈ بریکر پر تیزی سے گزری مگر اس طرح کہ اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو کسی جھٹکے کا احساس نہیں ہوا۔ یہ مرسڈیز گاڑی کے شاک ایبزوربر (Shock Absorber) کا کمال تھا۔

یہ مشاہدہ مجھے بہت عرصے قبل ہوا جب اسپیڈ بریکر کی وبا نئی نئی عام ہوئی تھی۔ اس سے پہلے میں اسپیڈ بریکر کے جھٹکے سے بچنے کے صرف ایک طریقے سے واقف تھا۔ وہ یہ کہ اپنی گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی جائے۔ مگر اس روز مجھے معلوم ہوا کہ یہ کام Shock Absorber بھی کر سکتے ہیں۔

زندگی میں پیش آنے والے مسائل اسپیڈ بریکر کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ انسان کے وجود کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ شاہراہ زندگی پر انسان کی رفتار توڑ دیتے ہیں۔ ترقی اور کامیابی کی طرف اس کا سفر آہستہ کر دیتے ہیں۔ اس مسئلے کا بظاہر کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اس لیے زندگی کی سڑک پر مسائل کے اسپیڈ بریکر ختم نہیں کیے جا سکتے۔ یہ خدا کے قانون کے خلاف ہے۔

لیکن اس روز مجھے معلوم ہوا کہ ان مسائل کو حل کرنے کا ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اپنی شخصیت میں مرسڈیز گاڑی جیسے Shock Absorber لگا دے۔ انسان اپنے اندر صبر اور برداشت جیسی صفات پیدا کرے۔ وہ مشکل حالات میں چھپے آسانی کے پہلوؤں کو تلاش کرے۔ وہ موجودہ مشکلات کے بعد قدرت کے قانون کے تحت لازماً آنے والی راحتوں پر نظر رکھے۔ وہ امید اور حوصلے کی شمع کو نہاں خانہ دل میں کبھی بجھنے نہ دے۔ یہی وہ Shock Absorber ہیں جو زندگی کی راہ میں آنے والی ہر مشکل اور ہر جھٹکے کے اثرات سے اسے محفوظ رکھنے کا سبب بنیں گے۔

خدا کی دنیا میں جو مسئلہ حل ہو سکتا ہے اسے اپنی حکمت اور تدبیر سے ختم کرنا چاہیے۔ جو حل نہیں ہو سکتا اسے Shock Absorber کے حوالے کر دینا چاہیے۔ یہ ہر مسئلے کی کنجی ہے۔

قیامت کا قانون نجات

اس دنیا میں ہر انسان کی زندگی جس بنیادی اصول پر گزرتی ہے وہ ہر قسم کے شر، ضرر اور برائی سے بچنے کا اصول ہے۔ ان چیزوں سے محفوظ رہ کر غم والم، درد و تکلیف اور خوف وحزن سے عافیت پانا ہی انسان کی پہلی ترجیح ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی انسان کے لطیف احساسات انگڑائی لے کر بیدار ہوتے، اس کے دل میں خواہشات کی کلیاں چٹکتیں، شبستان وجود میں جذبات کے شعلے بھڑکتے، تصورات کے افق پر امید کے تارے چمکتے اور خواب وخیال کی وادیوں میں آرزوؤں کے محل تعمیر ہوتے ہیں۔ یہ بات اگر ٹھیک ہے تو پھر اس کے بعد دوسری حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان شر اور ضرر سے پانچ ذرائع کو اختیار کر کے بچ سکتا ہے۔

1) یہ کہ انسان اپنی ذاتی محنت، کوشش، صلاحیت اور اثر ورسوخ کو استعمال کر کے اپنی ضروریات کو پورا کرے، اپنے مسائل کو حل کرے اور زندگی سے تکلیف دہ چیزوں کو دور کرے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم اپنے عمل سے اپنی بھوک پیاس کو دور کرتے، اپنے ستر کو ڈھانپتے اور بیماری میں علاج کراتے ہیں۔

2) یہ کہ ایک انسان دوسرے انسان کی ذمہ داری لے لے۔ اس کی ضروریات کو پورا کرے اور مصائب زمانہ سے اس کی حفاظت کرے۔ والدین اولاد کے لیے جو کچھ کرتے ہیں وہ اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ مگر یہ زیادہ تر خونی اور قریبی رشتوں ہی میں ہوتا ہے۔

3) یہ کہ انسان کے پاس مال اتنی وافر مقدار میں ہو کہ روزمرہ زندگی کے معمولات اور ان سے ہٹ کر جب کبھی کوئی مسئلہ پیدا ہو تو انسان کا مال اس کی حفاظت کا ذریعہ بن جائے۔ مثلاً جو لوگ اپنی گاڑی کا انشورنس کرا لیتے ہیں، چوری وغیرہ کی صورت میں ان کے نقصان کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

4) یہ کہ انسان کے تعلقات ایسے لوگوں سے ہوں جو صاحب اثر ورسوخ ہوں۔ ان لوگوں کی سفارش سے آدمی بہت سے مسائل سے بچ سکتا اور بہت سی مشکلات سے نکل جاتا ہے۔

5) یہ کہ ایک انسان کسی بھی وجہ سے دوسرے انسان کے کام آئے اور اس کی مدد کرے۔ انسانوں کی مدد

بھی وہ ذریعہ ہے جو لوگوں کو بہت سی مشکلات سے نکال دیتی ہے۔

یہ وہ پانچ ذرائع ہیں جن کی بنا پر انسان اِس دنیا میں اپنی تمام پریشانیوں سے نجات حاصل کرتا ہے۔ اِس دنیا کے بعد جو اگلی دنیا روزِ قیامت شروع ہوگی اس کا پہلا دن بہت سخت اور مشقت کا ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس نے اپنے پیغمبروں اور کتابوں کی وساطت سے ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ اس دن کے تمام مصائب اور آلام سے بچنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ انسان ایمان اور عمل صالح کا سرمایہ لے کر وہاں پہنچے۔ یہ وہی چیز ہے جسے ہم نے مندرجہ بالا نکات میں سے پہلے نکتے میں بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مزید کرم یہ ہے کہ اس نے ہمیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ قیامت کے دن پہلے ذریعے کو چھوڑ کر شر اور ضرر سے بچنے کے باقی چار ذرائع ختم کر دیے جائیں گے۔

قرآن کریم جو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اور قیامت تک انسانیت کی ہدایت کا ذریعہ ہے اس میں ان گنت مقامات پر اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ ہم مثال کے طور پر صرف سورہ بقرہ کے دو مقامات کو بیان کریں گے جن میں کم و بیش ایک ہی الفاظ میں یہ بات بیان کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی، نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوگی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا، اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی، (بقرہ 48:2)''

''اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ قبول ہوگا، نہ اس کو کوئی شفاعت نفع پہنچائے گی اور نہ ان کی کوئی مدد ہی کی جا سکے گی، (بقرہ 123:2)''

یہ آیات نہ صرف یہ بتاتی ہیں کہ شر اور ضرر سے بچنے کے آخری چار ذرائع اُس روز ختم ہو جائیں گے بلکہ کچھ اور اہم باتیں ایسی ہیں جو آیات میں الفاظ کی تبدیلی اور ان کی تقدیم و تاخیر سے واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں بعض لوگ مال پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور بعض لوگ سفارش اور تعلقات پر۔

اسی طرح زندگی میں بعض مواقعوں پر مال زیادہ کام آتا ہے اور بعض جگہ تعلقات۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر سفارش کی نفی پہلے کر کے اور دوسرے مقام پر مالی تاوان اور فدیے کی عدم قبولیت کا ذکر پہلے کر کے یہ واضح کر دیا کہ اس روز نہ مال کام آئے گا اور نہ کسی کی سفارش۔ جو پہلے کے بھروسے پر بیٹھے ہیں وہ بھی نقصان اٹھائیں گے اور جو دوسرے پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں وہ بھی برباد ہوں گے۔

اسی طرح مال کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ بعض اوقات انسان رشوت پیش کر کے خود کو چھڑانا چاہتا ہے۔ اور بعض اوقات انسان پر جرمانہ عائد کر دیا جاتا ہے جو اسے بہرحال دینا ہوتا ہے۔ جس کے پاس مال ہوتا ہے وہ ان دونوں مراحل سے گزر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ مال قبول نہ کرنے اور دوسری جگہ نہ مال لیے جانے کے الفاظ استعمال کر کے ان دونوں پہلوؤں سے بھی انسان کو مایوس کر دیا ہے۔

تیسری بات سفارش کے پس منظر میں یہ بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے دن قانون نجات میں سفارش کا سرے سے کوئی کردار ہی نہیں۔ سفارش یا تو انسان خود ڈھونڈتا ہے یا پھر کوئی دوسرا انسان ترس کھا کر سفارش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے مقام پر اس بات کی نفی کی ہے کہ انسان نے کوئی سفارش ڈھونڈ بھی لی تو کسی صورت قبول نہیں کی جائے گی۔ دوسرے مقام پر یہ واضح کر دیا کہ اس روزِ عدل میں سفارش سرے سے کوئی منفعت بخش چیز ہی نہیں۔ جو اس پر بھروسہ کرے گا نقصان اٹھائے گا۔

قیامت کے دن کا جو نقشہ قرآن پاک میں ہمارے سامنے آتا ہے اس کے مطابق یہ سخت مصیبت کا ایک انتہائی تکلیف دہ اور طویل دن ہوگا۔ موجودہ دنیا کی تمام تکالیف کو اگر اکھٹا کیا جائے تو وہ بھی اس دن کی شدت کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ ایسے میں یہ ضروری ہے کہ ہر شخص جان لے کہ اس دن کے شر اور ضرر سے بچنے کا طریقہ صرف اور صرف ایمان اور عمل صالح ہے۔ جس انسان نے اس کے سوا کسی اور چیز پر بھروسہ کیا دنیا کی کوئی طاقت اسے خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکتی۔ یہی ختم نہ ہونے والی دنیا کے پہلے روز عدل، روزِ قیامت کا قانون نجات ہے۔

عید کا دن

عید خوشیوں کا دن ہے۔ یہ بھوک اور پیاس کی تکلیف اٹھانے کے بعد بے روک ٹوک کھانے پینے کا دن ہے۔ یہ مہینہ بھر رمضان کی مشقت جھیلنے کے بعد ایام عید کی تفریح، راحت اور سرور کا نام ہے۔ یہ عبادت و ریاضت کے ساتھ رب سے جڑے رہنے کے بعد دوبارہ انسانوں کی طرف لوٹنے اور ان سے ملنے ملانے کا دن ہے۔ عید کے دن کی یہ حیثیت سب لوگ جانتے ہیں۔ مگر عید کے دن کی ایک اور حیثیت بھی ہے جسے کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ وہ یہ کہ عید کا دن اہل ایمان کے لیے جنت میں داخلے کی ریہرسل اور یاد دہانی کا دن ہے۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ وہ انسانوں کو یہاں اچھے برے حالات سے آزماتے ہیں۔ اپنے بندوں سے ان کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حالات کے سرد وگرم اور زمانے کے خیر وشر سے بے نیاز ہوکر خدا پرستی کے رویے پر قائم رہیں۔ لوگ جھوٹ بولیں، لیکن وہ سچ پر قائم رہیں۔ لوگ وعدے توڑیں، مگر وہ ایفائے عہد کو زندگی بنا کر جیئیں۔ لوگ رزق حرام کو اپنے دسترخوان کی زینت بنائیں، مگر وہ حصول رزق حلال کو اپنا نصب العین بنائیں۔ لوگ غفلت کی زندگی گزاریں، مگر وہ اطاعت کے راستے پر گامزن رہیں۔

یہ اور ان جیسے مطالبات کو پورا کرتے ہوئے زندگی گزارنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ روزہ کی بھوک پیاس برداشت کرنے جیسا مشکل عمل ہے۔ مگر جو لوگ ساٹھ ستر برس کی مختصر عمر میں یہ کر گئے، انہیں ہمیشہ کے لیے نعمت بھری جنتوں میں داخل کر دیا جائے گا جہاں ہر چیز بلا روک ٹوک انہیں ملتی رہے گی۔ جس دن یہ ہوگا وہ ان کی زندگی کا سب سے خوبصورت دن ہوگا۔

عید کا دن اُسی آنے والے دن کی یاد دہانی ہے جب رکنے، ٹھہرنے، صبر کرنے کے سارے مطالبات ختم کر کے اہل ایمان پر ختم نہ ہونے والی خوشیوں کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

خزانے کا سانپ

کہانیوں میں ایک مشہور کہانی اس خزانے سے متعلق بیان کی جاتی ہے جس پر ایک ناگ پہرہ دیتا ہے۔ یہ ناگ کسی شخص کو اس خزانے تک پہنچنے نہیں دیتا۔ کہانیوں ہی سے خزانے کے سانپ کی مثال ہماری زبان میں عام ہوگئی ہے اور یہ اس شخص یا ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو کسی مفید شے سے خود استفادہ کرتے ہیں نہ دوسرے کو کرنے دیتے ہیں۔

دین اسلام بلاشبہ ایک خزانہ ہے۔ یہ خزانہ آج کل عقائد، ایمانیات اور اعمال کی شکل میں ہے، مگر بہت جلد یہ آخرت کی ابدی دنیا میں مادی شکل میں ڈھل جائے گا۔ یہ فردوس کی اس بادشاہی میں بدل جائے گا جہاں انسان کو ہر تکلیف و دکھ سے بچا کر ہمیشہ رہنے والی نعمتوں اور راحتوں کی پرآسائش دنیا میں بسا دیا جائے گا۔

ختم نبوت سے قبل اس خزانے کی طرف لوگوں کو بلانے کی ذمہ داری خدا کے پیغمبروں کی تھی۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری ان لوگوں پر ڈال دی گئی جو نبی آخرالزماں پر ایمان لے آئے۔ مگر آج کے مسلمان دوسرے تک دین پہنچانے کی ذمہ داری سے بالکل غافل ہیں۔ ایک طویل عرصے سے یہ انہی لوگوں سے بدترین نفرت کا شکار ہیں جن تک ان کو خزانے کی اطلاع پہنچانی ہے۔ مسلمان اس کا سبب دوسروں کا ظلم بیان کرتے ہیں، مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اس سے قبل تاتاریوں نے مسلمانوں پر کہیں زیادہ ظلم کیا تھا۔ لیکن اُس دور کے مسلمانوں نے اپنی دعوتی ذمہ داریوں سے کوتاہی نہیں کی، تاتاریوں تک اسلام پہنچایا، انہیں مسلمان کیا اور نتیجتاً مزید چھ سو برس دنیا پر حکمرانی کی۔ مگر آج کے مسلمان اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے بجائے وہ بن بیٹھے ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا۔

مسلمانوں کی دعوتی غفلت دنیا میں ان کی ذلت اور رسوائی کی بنیادی وجہ ہے۔ جس دن انہوں نے دعوت دین کا کام شروع کر دیا، ان کے عروج کا زمانہ شروع ہو جائے گا۔

پریشانی اور خوشگوار زندگی

اللہ تعالیٰ نے انسانی ذہن کو غیر معمولی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ان میں سے ایک صلاحیت ماضی کے گزرے ہوئے اور مستقبل میں ممکنہ طور پر ہونے والے واقعات کو اپنے تصور میں لا کر دیکھ لینا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ صلاحیت اس لیے دی ہے کہ وہ ماضی کی غلطیوں سے سیکھے اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کر سکے،مگر بیشتر انسان اپنے اس وصف کو ماضی کے پچھتاؤں پر کڑھنے اور مستقبل کے اندیشوں کے لیے پریشان ہونے میں استعمال کرتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر وہ بہت سے ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی عوارض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

لوگ عام طور پر دو قسم کے مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔ایک وہ جن میں وہ کچھ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔مثلاً مہنگائی بدامنی وغیرہ کے بارے میں سوچ کر لوگ بہت پریشان ہوتے ہیں۔حالانکہ نہ مہنگائی کو دور کرنا ایک عام آدمی کے بس کی بات ہے اور نہ امن وامان قائم کرنا۔اس لیے اس بارے میں پریشان ہونے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔اس کے بجائے انسان کو اپنی سوچ کا دائرہ ان جگہوں تک محدود کر لینا چاہیے جہاں وہ کچھ کر سکتا ہے۔جیسے آمدنی کیسے بڑھائی جائے وغیرہ۔

مسائل کی دوسری قسم وہ ہے جن کے حل کی کنجی لوگوں کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جہاں ان کا فوری عمل، فوری توجہ مسئلے کو حل کر سکتا ہے۔ایسے معاملات میں سوچنے، تاخیر کرنے اور پریشان ہونے سے کام نہیں چلتا۔ مثلاً کسی بیماری کے آغاز میں مناسب علاج کروا کر انسان بہت بڑے مسئلے سے بچ سکتا ہے،مگر لوگ ان میں سستی کر کے معاملات خراب کر دیتے ہیں۔

مسائل کے بارے میں پریشان ہونا ان کا حل نہیں بلکہ مسائل کی فہرست میں ایک اور مسئلے کا اضافہ کرنا ہے۔صحیح طریقہ یہ ہے کہ جہاں کچھ کیا جا سکتا ہو وہاں فوری عمل کیا جائے اور باقی چیزوں میں معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے۔یہی خوشگوار زندگی کا راز ہے۔

بہت ٹینشن ہے

''اس ٹینشن میں زندگی بڑی مشکل ہوچکی ہے بھائی، بہت ٹینشن ہے۔'' یہ اس گفتگو کا خلاصہ تھا جسے میں پچھلے نصف گھنٹے سے سن رہا تھا۔ میں نے گفتگو میں اس لیے مداخلت نہیں کی کہ باتیں ساری ٹھیک تھیں۔ مہنگائی، بدامنی، سیاسی عدم استحکام اور بے یقینی، ملکی سالمیت پر لہراتے خطرات کے سائے، روپے کی گرتی قیمت، اسٹاک ایکسچینج کی بگڑتی صورتحال، وکلا تحریک، امریکی کارروائیاں وغیرہ۔ان کا رونا اگر کوئی شخص روتا ہے تو اس کی تردید کرنے سے کیا حاصل۔

مگر اب میری باری تھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کی ہر بات سر آنکھوں پر۔ آپ کی ٹینشن بھی بجا، لیکن میرے چند سوالات کا جواب دیجیے۔ مانا مہنگائی بہت ہے، مگر کیا آپ پر فاقے آئے ہیں؟ بدامنی سے بھی انکار نہیں، مگر کیا آپ کی جان اور اعضا کو کوئی نقصان پہنچا ہے؟ ملک کی معاشی صورتحال نازک ہے، مگر آپ کا کاروبار بہر حال بند نہیں ہوا اور ملکی سالمیت کے متعلق پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ جو قوم اپنا نصف دھڑ گنوا کر بھی اقوام عالم میں سر بلند رہی اسے آئندہ بھی کوئی فیصلہ کن نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ جب یہ حقائق ہیں تو پھر ٹینشن کیسی؟

پھر سوچیے کہ ان سارے حالات کے باوجود آپ کتنی نعمتوں میں جی رہے ہیں۔ زندگی اور صحت کی نعمت، اعضا و قویٰ کی نعمت، اولاد اور گھر کی نعمت، عزت اور عافیت کی نعمت اور ان جیسی نہ جانے کتنی نعمتیں۔ ان نعمتوں کی میں اگر تفصیل شروع کردوں تو صبح سے شام اور شام سے رات ہوجائے گی، مگر ان نعمتوں کی تفصیل ختم نہ ہوگی۔ اور نعمتیں بھی ایسی کہ ایک ایک کے پیچھے آپ دنیا دینے کے لیے تیار ہوجائیں گے۔

خدانخواستہ آپ کے بیٹے کی جان کو کوئی خطرہ لاحق ہوجائے تو آپ کیا نہیں کریں گے؟ آپ سے آپ کی آنکھوں کی روشنی چھین لی جائے تو ان تاریکیوں سے نکلنے کے لیے آپ کیا قیمت نہیں دیں گے؟ آپ کی آبرو پر کوئی داغ لگنے لگے تو اسے مٹانے کے لیے آپ اپنا سب کچھ قربان نہیں کردیں گے؟

پھر یہ نعمتیں تنہا آپ ہی پر نہیں ہیں۔ پوری قوم کو امن و عافیت دی گئی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں چین میں زلزلہ آیا اور لاکھ لوگ مر گئے۔ میمار (برما) میں طوفان آیا بستیوں کی بستیاں برباد ہو گئیں۔ پڑوسی ملک افغانستان میں جنگ و جدل کے نتیجے میں پورا ملک کھنڈر بن گیا۔ لاکھوں لوگ مر گئے۔ مگر آپ کے ہاں خیر ہے۔ وبائیں نہیں پھوٹیں، قحط نہیں پڑا، سیلاب نہیں آیا۔

پھر تاریخ اٹھائیں اور اس کے صفحات پڑھیں کہ دنیا میں لوگوں کے ساتھ کیا کچھ ہوا ہے۔ خود آپ کی قریبی تاریخ میں 1857 کے غدر، بنگال کے قحط، تقسیم ہند، اور بنگلہ دیش کی علیحدگی کی وہ قیامتیں رقم ہیں جن میں لاکھوں لوگ نہیں کروڑوں لوگ برباد ہو گئے۔ لوگوں کی جان، مال، جائیداد، اولاد اور آبرو سب مٹی میں مل گئے۔ آپ کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا۔

آپ ٹینشن لینا چاہتے ہیں تو ضرور لیں، مگر پہلے ان نعمتوں کا تو شکر ادا کریں جو ذاتی اور قومی حیثیت میں آپ پر کی گئی ہیں۔ آپ رب کا شکریہ ادا کریں، ٹینشن نہ لیں۔ آپ شکر ادا کریں گے تو لوگوں کے ساتھ بھی مہربانی سے پیش آئیں گے اور ٹینشن لیں گے تو پھر آپ لازماً دوسروں کو ٹینشن دیں گے۔ پھر آپ خود مسئلہ بن جائیں گے۔ پھر کوئی شخص اپنے مسائل جب گنوائے گا تو ان مسائل میں ایک نام اور شائد سر فہرست نام آپ کا ہو گا۔

شکر کرنا سیکھیے۔ اپنی آنکھوں میں احسان مندی کا سرمہ لگائیے۔ اپنی بینائی کو نعمتوں کی یاددہانی سے روشن کیجیے۔ اپنے نفسیاتی وجود کو مثبت سوچ سے معطر کیجیے۔ اس سے آپ شکر کریں گے۔ جب آپ شکر کریں گے تو جانتے ہیں اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ آپ دوسروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت بن جائیں گے۔ اس کے برعکس جب آپ ٹینشن لیتے ہیں تو آپ دوسرے کے لیے عذاب بن جاتے ہیں۔ کچھ اور نہیں تو آپ اپنے الفاظ سے دوسروں کے کانوں میں ٹینشن کا زہر انڈیلنے لگتے ہیں۔ یہی عذاب کچھ کم نہیں۔

شکر کیجیے اور نعمت بنئے۔ ٹینشن لے کر عذاب مت بنئے۔ مت کہیے کہ بہت ٹینشن ہے۔ یہ کہیے کہ بڑا کرم ہے۔ آپ پر مزید کرم ہو گا۔

ہماری سادگی

ہمارے ہاں آج کل بعض حلقوں میں امریکی معاشی بحران پر بڑی خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ ان کے خیال میں بیس برس قبل جس طرح ہمارے مجاہدین نے روس کوشکستِ فاش دی تھی اسی طرح اب انہوں نے امریکہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا ہے۔ وہ وقت اب دور نہیں جب امریکہ نہ صرف افغانستان میں شکست کھائے گا بلکہ روس کی طرح اس کا بھی شیرازہ منتشر ہوجائے گا۔

ہم اس سادگی پر کیا تبصرہ کریں؟ یہ لوگ شائد نہیں جانتے کہ پہلی گلف وار کے بعد بھی امریکہ ایک بڑے معاشی بحران کا شکار ہوا تھا۔ جس کے بعد پوری قوم سر جوڑ کر بیٹھی اور پھر بل کلنٹن کے زیر صدارت امریکہ اس بحران سے نکل کر عالمی افق پر چھا گیا۔ بظاہر یہی کچھ اب بھی ہوگا اور اوباما کی زیر ِصدارت ایک دفعہ پھر امریکہ اس بحران سے نکل جائے گا۔ بالفرض ایسا نہ ہوا اور امریکہ شکست کھا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے تو اس میں ہمارے لیے خوشی کی کیا بات ہے؟ ٹکراؤ اور تصادم کی ہماری سوچ نے عراق اور افغانستان کو لاکھوں لوگوں کا قبرستان بنادیا ہے۔ امریکہ اگر ٹوٹنے بھی لگا تو عجب نہیں کہ وہ جاتے جاتے تباہ حال پاکستان کو بھی قبرستان بناتا جائے۔ کیا اسی میں ہماری خوشی ہے؟

پھر امریکہ برباد بھی ہوگیا تو کیا دنیا کا اقتدار مسلمانوں کے پاس آجائے گا؟ اس قطار میں اگلا نمبر ہمارا نہیں چین کا ہے۔ وہ چین جس نے اپنے ہاں مسلمانوں کو بنیادی حقوق سے محروم کررکھا ہے۔ ہمارے لڑاکا اس سے بھی ٹکرانے کی کوشش کریں گے اور اس کے بعد چین ہمارے ساتھ وہ کرے گا جو آٹھ صدیوں قبل تاتاریوں نے کیا تھا یعنی پورے عالم اسلام کو کھنڈر بنادے گا۔

وقت آگیا ہے کہ ہم ٹکراؤ اور نفرت کو چھوڑ کر دعوت اور محبت کو اختیار کریں۔ تصادم کو چھوڑ کر ملت کی تعمیر کا کام شروع کریں۔ اپنی بربادی کی قیمت پر دوسروں کی تباہی کا جشن منانے کے بجائے ان کو جنت میں پہنچانے کی فکر کریں۔ یہ ہماری مذہبی ذمہ داری ہی نہیں، دنیا پر غلبے کا واحد راستہ بھی ہے۔

احساسِ لذت

اس دنیا میں پائی جانے والی اشیا کی دو نمایاں تقسیم ہیں۔ایک جاندار اور دوسری بے جان۔تمام جاندار زندگی اور موت کے سلسلے میں بندھے ہوئے ہیں۔زندگی ان کے آغاز کا نام ہے اور موت ان کے انجام کا۔دوسرے جانداروں کی طرح انسان کا معاملہ بھی یہی ہے۔مگر انسان کو 'احساسات' کی شکل میں ایک اضافی چیز بھی عطا کی گئی ہے جو اسے جانوروں سے افضل بناتی ہے۔

ان احساسات میں غالباً احساس لذت سب سے بڑی نعمت ہے۔اسی کی وجہ سے انسان کے لیے آواز ایک نغمہ ہے۔خوراک ایک پرلطف ذائقہ ہے۔ ہوا ایک لمس اور خوشبو ہے۔ دنیا رنگ و کمال کا ایک حسین نظارہ ہے۔چنانچہ انسان اس احساس لذت کی تکمیل کو اپنی زندگی کا ہدف بنالیتا ہے۔اس کے حصول کے منصوبے بناتا ہے۔اس کے لیے محنت اور جستجو کرتا ہے۔اس کے حاصل ہونے پر خوشیاں مناتا ہے۔

مگر انسان جس دنیا میں جیتا ہے اس میں زندگی کے بعد موت لازمی ہے۔ ملنے کے بعد کھونا ناگزیر ہے۔آنے کے بعد چلے جانا قانون فطرت ہے۔ ایک ایسی دنیا میں زندگی گزارنے کی صرف دو سطحیں ممکن ہیں۔ایک وہ جس پر آج کا ہر انسان جی رہا ہے۔وہ یہ کہ اس عارضی دنیا میں انسان اپنی لذتوں کی تکمیل ڈھونڈے۔اس فانی دنیا میں حیاتِ ابدی کی خوشیاں تلاش کرے۔ موت کی چھاؤں تلے رہ کر ابدی راحتوں کے خواب دیکھے۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا کو امتحان گاہ سمجھے۔ وہ نعمت پر شکر کرے اور محرومی پر صبر کرے۔زندگی کے سرد و گرم میں رب کی رضا کو اپنا مقصود بنالے۔ ہر حال میں اعلیٰ اخلاقی رویے پر قائم رہے۔یہی وہ لوگ ہیں جن کو جنت کی ابدی بستی میں ہمیشہ کی زندگی دی جائے گی۔ جہاں ان کا احساسِ لذت ختم نہ ہونے والی نعمتوں سے اپنے ذوق کی داد پاتا رہے گا۔

ہم تمھیں نہیں جانتے

گاڑی کے پچھلے شیشے پر اللہ کا نام لکھا دیکھ کر مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ایسا لگا جیسے کسی اجنبی شہر کے اجنبی لوگوں کے بیچ کوئی شناسا ٹکرا جائے۔غیروں کی محفل میں اچانک کسی اپنے پر نظر پڑ جائے۔حالانکہ میں کہیں اور نہیں کلمہ گو لوگوں کے شہر کراچی ہی میں تھا۔

اس شہر میں ہر جگہ میں نے 'غیر' ہی کا نام لکھا ہوا دیکھا۔خدا کے محبوبوں کو اس کا رقیب بناتے دیکھا۔خدا کا نام کہیں دیکھا تو کسی 'غیر' کے ساتھ رسمی خانہ پری کے لیے یا بس ایک حفاظتی نسخے کے طور پر۔وہ کریم جو سب کچھ ہے، جس نے سب کچھ دیا ہمارے لیے شاید اس انشورنس پالیسی سے زیادہ کچھ نہیں جسے لے کے انسان خود کو محفوظ سمجھتا ہے۔

ہماری ساری محبت 'غیر' لیے ہے۔خدا کے حصے میں تو بے روح سجدوں اور اس کے نام کی بے معنی تکرار کے سوا کچھ نہیں آیا۔میں سمجھتا تھا کہ خدا تنہا معبود ہے۔قانونی طور پر شائد ایسا ہی ہے، مگر یہاں دل کے صنم خانے میں آج تک خدا کے ساتھ اور بھی بہت سی ہستیاں شریک ہیں۔ انھی کے بت ہیں جن کی پرستش ہوتی اور انھی کی ذات ہے جن سے کرم کی امید ہوتی ہے۔انھی سے مدد مانگنے، انھی کی محبت سے سرشار ہونے، انھی کے نام پر جھومنے، انھی کے ذکر پر آنسو بہانے اور انھی کی یاد میں گم رہنے کو لوگ ایمان کا کمال سمجھتے ہیں۔

کاش اِنھیں کوئی یہ بتائے کہ یہاں سارا اقتدار، سارا اختیار تنہا ایک ہی معبود کے پاس ہے۔ 'غیر' سے مدد مانگنے والے اور 'غیر' کی الفت کا شکار یہ لوگ سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ بھاگنے والوں کو جب موت کی ٹھوکر لگے گی، جب حقیقت سے پردہ اٹھے گا تو معلوم ہوگا کہ زندگی فریب میں گزار دی۔اس روز سب سے بڑی سزا یہ ہوگی کہ جن کے لیے خدا کو چھوڑا اور خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارا، وہی کہہ دیں گے......ہم تمھیں نہیں جانتے۔ہم تمھیں نہیں جانتے۔

قیامت کی تباہی

قرآنِ کریم کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ یہ دنیا اوراس کے باسی بہت جلد ایک عظیم حادثے سے دوچار ہونے والے ہیں۔ یہ حادثہ قیامت کا وہ زلزلہ ہے جو زمین پر ناقابلِ تصور تباہی برپا کرے گا۔جس حادثے کے نتیجے میں ہمالیہ جیسے بلند پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح فضا میں اڑتے پھریں، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی شدت کیا ہوگی اوراس کے نتیجے میں انسانوں پر کیا گزرے گی۔

قرآنِ کریم کے ایک طالب علم کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانیت کی موت اس ہولناک طریقے پر کیوں واقع ہوگی۔زندگی کی بساط لپیٹنے کا کوئی آسان طریقہ بھی اختیار کیا جاسکتا تھا۔اصل بات یہ ہے کہ انسان کو اس دنیا میں اللہ کی بندگی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔مگر لوگ اللہ کے بجائے دوسروں کی بندگی میں لگ گئے۔پوری انسانی تاریخ میں بتوں کی پرستش کی جاتی رہی ہے اور آج تاریخ کے اختتام پر انسان نے اپنی خواہش نفس کو معبود بنالیا ہے۔ایسے میں قیامت کی عظیم تباہی لوگوں کو یہ بتانے آئے گی کہ جس خدا کو انھوں نے نظر انداز کر دیا تھا وہ کس قدر بلند، طاقتور اور صاحبِ جبروت ہستی ہے۔

عقل کا تقاضا تھا کہ عظیم سمندروں کے خالق کے آگے جھکا جائے۔لوگ نہ جھکے۔سو اب سمندر خود ابل کر اس کی گواہی دیں گے۔فطرت کا تقاضا تھا کہ بلند پہاڑوں کے مالک کے سامنے سرنگوں ہوا جائے۔انسان نہ ہوا۔اب پہاڑ ریزہ ریزہ ہوکر خدا کی عظمت کا ثبوت دیں گے۔پیغمبروں کی تعلیم تھی کہ ساری مخلوق کے رب کو اپنی توجہات کا تنہا مرکز بنایا جائے۔ابنِ آدم نے اس تعلیم کو بھلا دیا۔اب مخلوق کی مکمل تباہی اسے رب کی بڑائی کا احساس دلائے گی۔جو لوگ عقل، فطرت اور نبیوں کا پیغام نہ سمجھ سکے، قیامت ان اندھے، بہرے غافل لوگوں کو خدا کا تعارف کرائے گی۔اوراس میں کیا شک ہے کہ ایسے اندھے بہروں کو جھنجوڑنے کے لیے قیامت جیسی تباہی ہی کی ضرورت ہے۔

سطحی سوچ

ہمارے معاشرے کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ اس میں سطحی سوچ رکھنے والے لوگ تو بہت ہیں، مگر مشاہدات سے گزر کر حقائق تک پہنچنے والے، الفاظ سے گزر کر معانی تک پہنچنے والے لوگ کم ہی رہ گئے ہیں۔ جو لوگ کسی وجہ سے ذرا ٹھہر کر واقعات کا جائزہ لیتے اور معاملات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی اکثر تعصب کی عینک پہنے ہوئے ہوتے ہیں۔

اگر آپ کو اس بات کا کبھی تجربہ کرنا ہو تو کسی سنجیدہ موضوع پر معاشرے کے کسی فرد سے بات کر لیجیے۔ اول تو یہ اس کی دلچسپی کا موضوع ہی نہیں ہوگا۔ اگر کسی وجہ سے اُسے اِس سنجیدہ بات سے دلچسپی ہوگی تو اگلے لمحے پتا چلے گا کہ آپ نے ایک ایسی گفتگو کا آغاز کیا ہے جس میں دوسرا آدمی صرف بولنے میں دلچسپی رکھتا ہے، سننے میں نہیں۔ سنانے میں مہارت رکھتا ہے سمجھنے میں نہیں۔ وہ اپنی انتہائی سطحی معلومات اور سرسری نگاہ کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر آپ پر ٹھونسنے کے لیے تیار ہو جائیگا۔ یہ بولنا اور یہ سنانا اگر علم و تجزیے پر مبنی ہو تو سر آنکھوں پر مگر اکثر یہ بولنا محض عادتاً ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سامنے والا آپ کی اُس بات پر تبصرہ کرے گا جو آپ نے نہیں کی۔ وہ اُس نقطۂ نظر پر تنقید کرے گا جو آپ کو پتا ہی نہیں ہوگا۔ آپ کے سوال کا وہ جواب دے گا جس کا زیرِ بحث مسئلے سے کوئی تعلق ہی نہ ہوگا۔

معاشرے میں اس رویے کے فروغ کا ایک اہم سبب اچھی کتابوں کے مطالعہ کی کمی ہے۔ مطالعہ انسان کو تحمل کے ساتھ دوسروں کا نقطۂ نظر پڑھنے اور سمجھنے کی تربیت دیتا ہے۔ وہ اِس میں برداشت اور تحمل کا مادہ پیدا کرتا ہے۔ وہ اِس کی نظر میں وسعت، خیالات میں گہرائی اور تجزیے میں معروضیت (Objectivity) پیدا کرتا ہے۔ مطالعہ نہ ہو تو اچھی تربیت یہ کمی پوری کر سکتی ہے۔

ضروری ہے کہ کچھ لوگ خود کو قوم کی تربیت کے لیے وقف کر دیں۔ وہ لوگوں کو تہذیب، اخلاق اور صبر کی تعلیم دیں۔ سطحیت، تعصب، خود پسندی اور مفاد پرستی جیسی خرابیوں پر متنبہ کریں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے معاشرے میں خیر و شر، جھوٹ و سچ، پروپیگنڈا اور حقیقت میں فرق کا شعور پیدا ہوگا۔

عبدیت کا سفر ابدیت تک

ہاتھ میں دبی ریت آہستہ آہستہ بند مٹھی سے پھسلتی جارہی تھی۔ میں اس ریت کو روکنے کے لیے جتنی مضبوطی سے ہاتھ بند کرتا، اتنی ہی رفتار سے وہ خالی ہورہا تھا۔ یہ زندگی کی تمثیل تھی۔ زندگی کچھ اسی طرح...... لیل ونہار کی گردش اور شام وسحر کی دوڑ میں...... غیر محسوس طریقے سے، ہاتھوں سے پھسلتی چلی جاتی ہے۔ جیسے خالی گلاس میں پڑی برف کی ڈلی، زندگی کی حرارت سے پگھلتی چلی جائے......اور آخر کار اس کا وجود ہے سے نہیں میں بدل جاتا ہے۔

میں ساحل پر کھڑا کبھی سمندر کی موجوں کو دیکھتا جو ایک کے بعد دوسری اور تیسری لہر بن کر اٹھتیں اور ساحل کی ریت پر نمی کا ایک احساس چھوڑ کر فنا ہو جاتیں۔ کبھی میری نظر اس سورج کی طرف اٹھ جاتی جو بڑھتے گھٹتے بادلوں سے اپنی روشنی کو بچانے کی جدوجہد کررہا تھا۔ آسمان کا یہ نور ایک ظاہر بین نظر کو فریبِ سکوت میں مبتلا کرتا ہے، لیکن درحقیقت وہ بھی زندگی کی پھسلتی، ختم ہوتی ریت کی مانند آہستہ آہستہ فنائے شب کی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہورہے تھے، اپنے محبت کرنے والوں کے ساتھ بحیرۂ عرب کے اس حسین ساحل پر ایک بہترین دن گزارنے کے بعد میں حساب لگا رہا تھا کہ میرے ہاتھ کیا آیا؟ کچھ میٹھی یادیں، بےفکری کی کچھ گھڑیاں، اپنوں کے ساتھ گزارے ہوئے پرمسرت لمحوں کا احساس۔ وہ احساس جو سمندر پار کے اِن مہمانوں اور یقیناً میرے لیے بھی، اُس مستقبل کا بڑا سرمایہ ہے جو اپنے دامن میں جدائی کا داغ لیے آرہا ہے۔ یہ اگرچہ بڑا سرمایہ ہے، مگر میرا دکھ یہ تھا کہ وقت کی پھسلتی ڈور نے زندگی کے اِس دن کو بھی کتابِ ماضی کا ایک ورق بنا دیا۔

خدایا اس دنیا میں مسرت ابدی کیوں نہیں ہوتی؟ سکون کو دوام کیوں نہیں؟ ہر وصل کو جدائی کا داغ کیوں لگتا ہے؟ ایامِ زیست ......ریت کے ذروں کی مانند، گرفتِ حیات سے کیوں نکل

جاتے ہیں؟ جواب ملا کہ ان صاحبانِ بصیرت میں سے بنو جن کے لیے آسمان وزمین کی پیدائش اور رات اور دن کے آنے جانے میں بڑی نشانیاں ہیں۔ ہر سوال کا جواب ملے گا۔

بصیرت نے کہا کہ زمین ازلی لگتی ہے اور آسمان...... ابدی لگتا ہے۔ شام وسحر کے ترازو میں وقت کے باٹ...... اسی طرح...... تبدیلی کے ہر زنگ سے بچا کر رکھے جا سکتے تھے، مگر رات ودن کی گردش رکھی گئی...... یہی بتانے کو رکھی گئی کہ فنا کے اس جزیرے میں ابدی مسرتوں، ختم نہ ہونے والی چاہتوں، ماند نہ پڑنے والی خوشیوں کو مت ڈھونڈو۔ اس حقیقت کو سمجھو کہ زمین کا یہ گھر اور آسمان کی یہ چھت تمھارے لیے بنائی تو گئی ہے، مگر بدلتے روز وشب کی اسیر اس حیاتِ فانی میں انہیں حاصل کرنے کے خواب مت دیکھو۔ سوائے محرومی کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

اتنی حسین کائنات، اتنی بامعنی زندگی اتنی بے مقصد نہیں کہ چند بے فکرے اس کے کنارے خوشیوں کے اسباب اکٹھے کریں اور جب حیاتِ مستعار کی گھڑیاں بیت جائیں تو خانہ بدوشوں کی طرح اگلی منزل کو چل نکلیں...... کبھی لوٹ کر نہ آنے کو۔

خالق نے زندگی عبدیت کے لیے بنائی ہے اور عبدیت کی راہ پر چلنے والوں کے لیے ابدی زندگی بنائی ہے۔ وہ زندگی جس میں وقت کی خاموش آندھی کسی محفل کو درہم برہم نہیں کر سکتی۔ جس میں شب وروز کی گردش خوشیوں اور نعمتوں میں محرومی اور مایوسی کے وقفے نہیں ڈال سکتی۔

انسان کا سفر معمولی سفر نہیں۔ یہ عبدیت کا سفر ہے جو ابدیت کے حصول تک جاری رہے گا۔ اس سفر کی ابتدا یہ دنیا ہے۔ جس میں بندگی کرنا ہے۔ جس میں کام کرنا ہے۔ اس سفر کی انتہا آخرت کی دنیا ہے۔ جس میں بادشاہی کرنا ہے۔ جس میں آرام کرنا ہے۔ جس میں انسان کے لیے زمین وآسمان ہی کو مسخر نہیں کر دیا جائے گا بلکہ انسان کے لیے وقت کی پھسلتی ڈور اور زندگی کی پھسلتی ریت کو بھی مسخر کر دیا جائے گا۔ عبدیت کا سفر ابدیت کے سوا کسی اور جگہ ختم نہیں ہوگا۔

باشعور مسلمان کی ذمہ داری

پچھلے دنوں مجھے بار بار یہ خیال آیا کہ انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں ہمارے عظیم ترین رہنماؤں سرسید، اقبال، قائداعظم اور محمد علی جوہر وغیرہ میں سے ہر ایک کو یورپ میں قیام کے مواقع ملے۔ شہری مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ اگر ذاتی سکون، مادی آسائشوں اور آسان زندگی کو اپنا مقصد بنا کر یورپ ہی میں مقیم ہو جاتے تو ملت اسلامیہ پاک و ہند کا کیا حشر ہوتا؟ ہندو اکثریت اور انگریزوں کی حاکمیت کے سامنے سیاسی اور ذہنی شکست سے دوچار اور معاشی طور پر مفلوج قوم شائد ہمیشہ کے لیے جمود اور غلامی کا شکار ہو جاتی۔

اس خیال کے آنے کی وجہ یہ تھی کہ میرے احباب میں بہت سے لوگ مجھ سے یہ بات باصرار کہہ رہے ہیں کہ مجھے ملک چھوڑ کر چلا جانا چاہیے۔ ہر طرف چھائی بے یقینی، بدحالی، بدامنی اور مایوسی کی اس لہر میں لوگوں کو یہ بات احمقانہ لگتی ہے کہ کوئی شخص قوم کی اصلاح اور تربیت کا مشن لے کر کھڑا ہو۔ اور خاص طور پر یہ کام کوئی ایسا شخص کرے جسے ملک سے باہر جینے اور رہنے کے اعلیٰ ترین مواقع حاصل تھے۔ ایک ایسے ماحول میں جب ہر نوجوان اپنے لیے اور والدین اپنے بچوں کے لیے صرف یہی راستہ دیکھتے ہوں کہ کسی طرح ملک سے باہر نکل جائیں، یہ سوچ تعجب کی بات نہیں۔ حالات سے پریشان ہو کر بہت سے احباب خود اپنے متعلق یہ فیصلہ کر رہے ہیں کہ وہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ وہ مجھ سے اس عمل کی شرعی اور اخلاقی حیثیت دریافت کرتے ہیں۔

میرے نزدیک ایک انسان کو یہ حق ہے کہ وہ چاہے تو اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے ملک سے باہر جا کر رہ سکتا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی انسان کو ایک مسلمان کے گھر میں پیدا کرتے ہیں تو ایک طرف یہ ان کا خصوصی فضل ہوتا ہے، مگر دوسری طرف یہ ایک اضافی ذمہ داری بھی ہوتی ہے جو کسی غیر مسلم پر عائد نہیں ہوتی۔ یہ اضافی ذمہ داری اس بات کی ہوتی

ہے کہ انسان اب اپنے ماحول، ملک اور قوم کے خیر وشر سے بے نیاز ہو کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ ایک عام آدمی سے دین کا مطالبہ ہے وہ کہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ وہ اپنے قریبی لوگوں کو اچھے کاموں کی تلقین اور برائی سے رکنے کی تاکید کرتا رہے۔ زیادہ باشعور اور باصلاحیت لوگوں سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ دین کی نصرت کریں اور اپنی قوم، مسلم ہو یا غیر مسلم، اس کی خیر خواہی کریں۔

اگر آپ ملک میں رہتے ہیں تو قوم کی اصلاح، اس کی تعلیم و تربیت اور دین کے صحیح تصورات کی ترویج کے ہر اس کام میں عملاً معاونت کریں جس پر آپ کا اطمینان ہو۔ اپنی زبان، اپنے عمل اور اپنے پیسے سے اس کام میں حصہ ڈالیں۔ اگر آپ ملک سے باہر غیر مسلم قوم میں رہتے ہیں تو آپ کے اندر ہر لمحہ یہ احساس زندہ رہنا چاہیے کہ لوگ آپ کو مسلمان سمجھتے اور آپ کے ذریعے سے اسلام سے متعارف ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ کا قول اور فعل ایک اعلیٰ اخلاقی سطح پر ہونا چاہیے۔ شرک و الحاد کے درمیان رہتے ہوئے ہر لمحہ آپ کو یہ فکر ہونی چاہیے کہ توحید کا پیغام کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اس کے ساتھ حق کے ابلاغ، اس کی دعوت کے فروغ اور دین کے حوالے سے پیدا ہونے والے سوالات کے جواب فراہم کرنا بھی آپ کی ذمہ داری ہے۔

آپ کی قوم مسلم ہو یا غیر مسلم، اگر آپ کا رویہ یہ نہیں تو سمجھ لیجیے کہ دنیا کی آسانیاں تو آپ نے سمیٹ لیں، لیکن جنت کے اعلیٰ مقامات سے آپ محروم ہو چکے ہیں۔ انسان کے پیدا کردہ مسائل سے تو شائد آپ نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے، مگر جہنم کا ختم نہ ہونے والے مسئلہ اب آپ کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ قوم کے خیر و شر سے بے نیاز ہو کر فیملی اور کیریئر کی سطح پر تو آپ نے آسائشیں اور کامیابیاں حاصل کر لیں، مگر جنت کی حسین بستی میں ایک چھوٹا سا گھر بھی نہ بنا سکے۔

باشعور مسلمان کے سامنے سوال یہ نہیں ہوتا کہ اس نے زندگی کہاں گزاری۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ اس نے ایمان اور عمل صالح کے ساتھ اپنی قوم کی فلاح کے لیے کوئی جدوجہد کی یا نہیں کی۔

ڈائری کا ایک ورق: امید کا پیغامبر

آج 9 نومبر کا دن اور علامہ اقبال کا یوم پیدائش ہے۔ اتوار کی تعطیل کی بنا پر میں گھر ہی میں ہوں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے اقبال کے کلام کو اٹھایا اور پڑھتا چلا گیا۔ میرے ذہن میں اپنی نوعمری کے وہ ایام تازہ ہو گئے جب میں اسکول سے آکر اقبال کے کلام کا گھنٹوں مطالعہ کیا کرتا تھا۔ بچپن کی عمر بھی کیا عمر تھی، جو چیز ہاتھ آئی پڑھ لی۔ عمران سیریز، ناول اور ڈائجسٹیں جو صرف بالغوں کے مطالعے کی چیزیں سمجھی جاتی تھیں، انہیں گھر والوں سے چھپ چھپ کر پڑھنا، اسکول کے زمانے ہی میں اپنے بڑے بھائی بہنوں کی نصاب کی کتابیں چاٹ ڈالنا، کچھ نہ ملے تو درجنوں دفعہ پڑھی ہوئی کتابوں کو ایک دفعہ اور پڑھ جانا۔ مگر اب کیا زمانہ آ گیا ہے، ٹی وی نے عادت ایسی خراب کی ہے کہ مطالعہ کرنا پہاڑ کی چوٹی سر کرنے جیسا مشکل کام لگتا ہے۔

خیر یہی وہ زمانے تھے جب میں اقبال کی کتابیں خرید کر لاتا اور ان کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اقبال کے کلام میں زندگی کا جوش اور امید کی جو روشنی تھی وہ آج کے دن تک میرا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اقبال کا زمانہ کیا زمانہ تھا۔ وہ 1877 میں پیدا ہوئے، جب غدر کے بعد ایک پوری نسل مایوسی، شکست، غلامی، ذلت اور محرومی کے احساس میں پل کر جوان ہو چکی تھی۔ ایک طرف مذہبی لوگ تھے جنہوں نے قدیم دینی تعلیم کے فروغ کو اپنا مشن بنا کر انگریزوں کے نظام سے بالکل لاتعلقی کو ہر مسئلہ کا حل سمجھ لیا تھا اور دوسری طرف سرسید کی وہ راہنمائی تھی، جس میں جدید تعلیم کے ساتھ انگریزوں کی مکمل پیروی ہر بند تالے کی چابی سمجھ لی گئی تھی۔

ایسے میں اقبال اٹھے۔ وہ دین کی محبت سے سرشار اور جدید تعلیم کے اسلحے سے لیس تھے۔ امت کی تاریخ، معاصر افکار، ملکی سیاست اور بین الاقوامی حالات پر ان کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ قومی راہنمائی کے یہ دو دھارے یعنی جدید دنیا سے لاتعلق ہو کر اختیار کی جانے والی

جامد مذہبیت اور انگریزوں کی مکمل پیروی کا راستہ، دونوں ہی غلط ہیں۔اس سے بڑھ کر انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ایک مایوس اور ذہنی شکست خوردگی کے احساس میں مبتلا قوم دنیا میں کچھ حاصل نہیں کر سکتی۔اقبال کی پوری فکر اور ان کا کل پیغام اصل میں انہی دو چیزوں کے اردگرد گھومتا ہے۔

انھوں نے شاعری کو اپنی زبان بنایا اور امید کے دیئے روشن کرنا شروع کر دیے۔ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مایوس کن حالات کے اعتراف کے ساتھ بات شروع کرتے اور پھر بتدریج ذہنوں میں امید کے چراغ جلاتے چلے جاتے۔وہ ہلال عید کو دیکھ کر قوم کا مرثیہ پڑھتے ہوئے کہتے ہیں:

اوج گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے

اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

شمع و شاعر نامی شاہکار نظم کا آغاز بھی اسی مایوس کن لہجے میں ہوتا ہے۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

یہ مایوس کن لہجہ جب اپنے عروج پر پہنچتا ہے تب وہ دلوں میں امید کی شمع روشن کرتے ہیں۔

شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی

ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی

سرزمین ہند کے مسلمان جنہیں ہندو اور انگریزوں کے ہاتھوں اپنے مٹ جانے کا اندیشہ تھا، وہ یہ کہہ کر ان کی امید زندہ کرتے ہیں:

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے

تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

پھر مستقبل کا نقشہ اپنے وجدانی اسلوب میں اس طرح کھینچتے ہیں کہ مردہ سے مردہ دل بھی زندگی

کی حرارت سے جاگ اٹھتا ہے:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

بانگ درا کا یہی انداز بال جبریل میں پہنچتا ہے۔ مسجد قرطبہ کے آئینے میں وہ بندۂ مومن کو اس کے جلال و جمال، شوق ومحبت اور بلند پروازی کی مطلوبہ صفات دکھاتے ہیں۔ اسے اپنے ان خوابوں میں شریک کرتے ہیں جو قرطبہ کے دریائے کبیر کے کنارے انہوں نے دیکھے تھے۔

آب روان کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب

آج بھی ہماری قوم کو سب سے بڑھ کر جس چیز کی ضرورت ہے وہ امید ہے۔ سر دست اس قوم کے اعصاب پر وہ لوگ مسلط ہیں جو صرف مایوسی کی زبان بولنا جانتے ہیں جبکہ ہماری ضرورت مثبت سوچ رکھنے والے فکری راہنما ہیں۔

آج ہمارے حالات اس وقت سے کہیں بہتر ہیں جب پورا عالم اسلام یورپی طاقتوں کا غلام تھا۔ جب جہالت اور غربت کے آسمان پر غلامی کی سیاہ رات طاری تھی۔ جب دین و دنیا کے علوم میں ہر جگہ جمود چھایا ہوا تھا۔ آج تو حالات بہت بہتر ہیں۔ غلامی کے سائے چھٹ چکے ہیں اور علم کا سفر شروع ہو چکا ہے۔ اگر آج چند لوگ یہ طے کر لیں کہ ہر طرح کے حالات میں امید کے چراغ بجھنے نہیں دیں گے تو امت کا دربدر بھٹکتا یہ قافلہ اس سفر کا انجام پا سکتا ہے جو اقبال کی بانگ درا کے ساتھ ایک صدی قبل شروع ہوا تھا۔

ہمہ یاراں دوزخ

بریگیڈیئر صدیق سالک مرحوم (1935-1988) ایک صاحب قلم فوجی تھے۔ وہ 1971 کی پاک بھارت جنگ میں ہندوستانی فوج کی قید میں چلے گئے اور دو برس قید و بند میں گزارے۔ اپنی اس قید کی داستان انہوں نے ''ہمہ یاراں دوزخ'' کے عنوان سے کتابی شکل میں تحریر کی۔ قید کے ابتدائی مرحلے میں صدیق سالک صاحب کو قید تنہائی میں رکھا گیا۔ قید و بند کے اس مرحلے کا احوال انہوں نے کتاب کے باب ''قیدی نمبر 10 ''میں بیان کیا ہے۔

دشمن ملک میں قید تنہائی کی یہ قسم گزری تو بہت سے لوگوں پر ہوگی، مگر ایک ادیب ہونے کے ناطے صدیق سالک نے جس طرح اس قید کا احوال لکھا ہے، وہ انسان کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اس قید میں سالک صاحب کو زیر زمین ایک ایسے سیل میں رکھا گیا تھا جہاں رات تو کجا دن میں بھی روشنی کے گزرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ قبر نما یہ سیل چھ مربع فٹ کی ایک ایسی کال کوٹھری تھی جس میں انسان پھینکا تو جا سکتا ہے، جی نہیں سکتا۔

تنگی و تنہائی اور تاریکی و وحشت کے اس ماحول میں ان کا ساتھ دینے کے لیے اس سیلن زدہ سیل میں کوئی تھا تو وہ موسم سرما کی شدید ٹھنڈ تھی یا پھر مچھر، کھٹمل اور پسوؤں کی ایک بڑی تعداد ان کا لہو پینے کے لیے وہاں موجود تھی۔ یا پھر ان کے اندر سے ابلتی بلکتی بھوک اور نیند کی جبلتیں تھیں جن کی تسکین کے لیے حالات آخری درجے میں ناسازگار تھے۔ وہاں اگر کوئی انسان تھا تو باہر تعینات وہ سنتری تھا جو انہیں اس کال کوٹھری میں لیٹے یا دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے دیکھتا تو مغلظات اور گالیوں سے ان کی خبر گیری کرتا۔

صدیق صاحب نے اس پورے مرحلے کا احوال جس طرح بیان کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک عام قاری کے لیے یہ قوموں کی دشمنی، جنگوں کی ہولناکی اور قید کے احوال کے

اعتبار سے ایک موثر تحریر ہوگی، مگر ایک بندہ مومن کی نظر سے یہ دوزخ کے عذاب کا ایک تعارف ہے۔ قرآن مجید میں دوزخ کی جو سزائیں بیان ہوئی ہیں ان میں سے سب سے ہلکی سزا وہ ہے جو سورہ فرقان (13:25) میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ اہل جہنم دوزخ میں کسی تنگ جگہ پر باندھ کر پھینک دیے جائیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور جب یہ اس کی کسی تنگ جگہ میں باندھ کر ڈال دیے جائیں گے تو اس وقت اپنی ہلاکت کو پکاریں گے۔ آج ایک ہی ہلاکت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی ہلاکتوں کو پکارو۔''

سالک صاحب کی تحریر پڑھ کر ان آیات کی ایک بہترین تشریح سامنے آتی ہے۔ یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ دوزخ کا بظاہر کم نظر آنے والا عذاب بھی انسانی برداشت کے لیے اتنا زیادہ ہے کہ کوئی انسان اس کو جھیلنے کی تاب نہیں رکھتا۔ قرآن مجید اس عذاب ہی کو واضح نہیں کرتا بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ عذاب ناشکری کے بدترین جرم کی سزا ہیں۔ یہ ناشکری کیا ہوتی ہے، اس کی بڑی خوبصورت وضاحت بھی سالک صاحب کی اس کتاب میں ملتی ہے۔ وہ اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ اس قید سے ذرا دیر کی رہائی میں انہیں وہ مناظر فطرت بھی کیسی قیمتی چیز محسوس ہوئے جن کے درمیان ہمارے صبح شام گزرتے ہیں اور ہم کبھی ان پر توجہ بھی نہیں دیتے۔ اس بیان کو ذرا ان ہی کی زبانی سنیے:

''آدھ گھنٹے بعد مجھے پھر روئے زمین پر آنے کی دعوت ملی۔ میں نے پھر مناظر قدرت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ پیپل کے پتے جھڑتے دیکھے۔ اس پر جنگلی چوہے چڑھتے دیکھے۔ غسل خانے کی منڈیر پر کبوتروں کو مصروفِ غٹرغوں پایا...... صحن سے ایک فاختہ کو فکر آشیاں بندی میں تنکے اکٹھے کرتے دیکھا۔ غلاظت کے ڈھیروں سے کوؤں کو چاول اور چیلوں کو تلاش گوشت میں اس پر جھپٹتے دیکھا۔ بس کچھ نہ پوچھیے ان عیاش آنکھوں نے کیا کیا ضیافت نہ اڑائی۔ رستی بستی دنیا کی ایک جھلک دیکھ لی اور پھر

چوبیس گھنٹے کے لیے زیر زمین دفن!‘‘

فطرت کی حسین دنیا کا یہ نظارہ جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہوئے رنگوں، روشنیوں، اور نظاروں پر مشتمل ہے ان اربوں کھربوں نعمتوں میں سے صرف ایک نعمت ہے جس میں ہم جیتے ہیں۔ وگرنہ زندگی، اس کی بقا اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے جو ساز وسامان اس کائنات میں ہمیں اللہ تعالیٰ نے دے رکھے ہیں ان کی کوئی قیمت نہیں دی جاسکتی۔ یہ سب کچھ ہمیں مفت میں ملتا ہے۔ ہوا، پانی، غذا، قویٰ، صحت، طاقت، رشتے ناتے، مال واسباب غرض ہر جگہ یہ نعمتیں بے حساب بکھری ہوئی ہیں۔ مگر ہم دینے والے کو بھول کر جیتے ہیں۔ اس کی پکار کا جواب نہیں دیتے۔ اس کی یاد کو اپنی زندگی نہیں بناتے۔

یہی نہیں ہم اس مہربان رب کی نافرمانی میں جیتے ہیں۔ اس کی عبادت میں غیر اللہ کو شریک کرتے ہیں۔ اس کے بندوں پر ظلم کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کی نعمتوں کے بغیر ایک لمحہ جی نہیں سکتے۔ کوئی محرومی برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر ہمارا حوصلہ دیکھیے کہ ہم اس عجز کے باوجود ایسی غفلت اور سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جہنم کی ابدی قید ایسی ہی ناشکری اور سرکشی کا بدلہ ہے۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کو یاد کر کے اور اس شکرگزاری میں جیتے ہیں تو ان کا بدلہ اسی آیت کے ساتھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ان سے پوچھو کیا یہ (انجام) بہتر ہے یا وہ ابدی جنت جس کا وعدہ نیک لوگوں سے کیا جارہا ہے۔ وہ ان کی جزا اور ان کا ٹھکانہ ہوگی۔ اس میں ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ تیرے رب کا وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس کی حتمی ذمہ داری ہے۔ (فرقان 25:16-14)

بیچ کی نماز

قرآن کریم کی سورہ بقرہ (238:2) میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی نمازوں اور خصوصاً بیچ کی نماز کی حفاظت کریں۔ نمازیں پانچ ہوتی ہیں، اس اعتبار سے بیچ کی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے جو پانچ نمازوں کے وسط میں آتی ہے۔ نمازِ عصر سے متعلق اس خصوصی ہدایت کا ایک خاص پس منظر ہے جس کا اندازہ آج کل کے لوگوں کو نہیں ہو سکتا۔

انیسویں صدی تک انسانی بستیاں، بجلی نہ ہونے کی بنا پر آج کل کے دور کی طرح روشن نہ ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں یہ ناگزیر تھا کہ کاروبار زندگی سر شام ہی بند کر دیا جائے تا کہ سورج کی روشنی ہی میں لوگ اپنے معاملات نمٹا کر گھروں کو لوٹ سکیں۔ ایسے میں زمانۂ قدیم کی خاموش اور سست رفتار زندگی میں عصر کا وقت بڑی مصروفیت اور تیزی کا وقت ہوا کرتا تھا۔ اس وقت میں سورج بھی اسی تیزی سے ڈھلا کرتا ہے۔ چنانچہ اس بات کا شدید اندیشہ تھا کہ بازار کی چہل پہل اور خرید و فروخت کی ہنگامہ آرائی میں لوگ نمازِ عصر کو فراموش کر دیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر لوگوں کی توجہ اس نماز کی طرف مبذول کرائی۔

دورِ جدید میں ایک دوسرے پہلو سے اب یہ توجہ فجر کی نماز کی طرف دلانے کی ضرورت ہے۔ آج کل کی زندگی میں دیر رات کو سونا معمولاتِ زندگی میں شامل ہو چکا ہے۔ دوسری طرف زمانۂ قدیم کی طرح کاروبارِ حیات علی الصبح شروع نہیں ہوتا بلکہ اسکول، کاروبار اور دفاتر سب سورج نکلنے کے کافی دیر بعد شروع ہوتے ہیں۔ چنانچہ دیر سے سونے والوں کے لیے نہ صرف فجر کے اندھیرے میں اٹھنا مشکل ہے بلکہ نماز کے بعد دوبارہ سونا بھی ایک ضرورت بن گیا ہے۔ ان حالات میں فجر کی نماز پڑھنا بہت مشکل کام بن گیا ہے اور عملاً فجر پڑھنا تہجد پڑھنے جیسا عمل بن چکا ہے۔

ایسے میں اہمیت، فضائل اور اجر، تمام پہلوؤں سے فجر کی نماز سب سے بڑی نماز بن چکی ہے۔ اس کا اہتمام بلاشبہ ایک نمازی کی معراج ہے

جب زندگی شروع ہوگی

مصنف: ابو یحییٰ
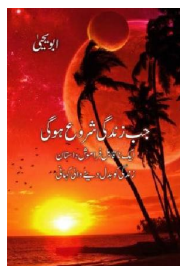
☆ ایک ایسی کتاب جس نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا

☆ ایک ایسی تحریر جسے لاکھوں لوگوں نے پڑھا

☆ ایک ایسی تحریر جس نے بہت سی زندگیاں بدل دیں

☆ ایک ایسی تحریر جو اب ایک تحریک بن چکی ہے

☆ آنے والی دنیا اور نئی زندگی کا جامع نقشہ ایک دلچسپ ناول کی شکل میں

☆ ایک ایسی تحریر جو اللہ اور اس کی ملاقات پر آپ کا یقین تازہ کر دے گی

☆ علم و ادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف

قسم اُس وقت کی

مصنف: ابو یحییٰ
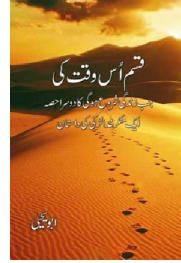
''جب زندگی شروع ہوگی'' سے شروع ہوئی کہانی کا دوسرا حصہ

☆ ایک ایسی کتاب جس نے کفر کی طرف بڑھتے کئی قدموں کو تھام لیا

☆ ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر جو سچ تلاش کرنے نکلی تھی

☆ ایک خدا پرست کی کہانی جس کی زندگی سراپا بندگی تھی

☆ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور روز قیامت کا ناقابل تردید ثبوت

☆ رسولوں کی صداقت کا نشان دور رسالت کی زندہ داستان

☆ کفر والحاد کے ہر سوال کا جواب ہر شبہے کا ازالہ

☆ ایک ایسی کتاب جو آپ کے ایمان کو یقین میں بدل دے گی

☆ ابو یحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

آخری جنگ

مصنف: ابویحییٰ
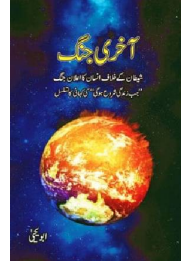
''جب زندگی شروع ہوگی'' سے شروع ہوئی کہانی کا تیسرا حصہ

☆ جب زندگی شروع ہوگی کی کہانی کا دلچسپ تسلسل

☆ شیطان اور انسان کی ازلی جنگ کا آخری معرکہ

☆ شیطانی طاقتوں کے طریقہ واردات کا دلچسپ بیان

☆ شیطان کے حملوں کو ناکام بنانے کے موثر طریقے

☆ مسلمانوں کے عروج کا وہ راستہ جو قرآن مجید بتاتا ہے

☆ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کامیابی کا حقیقی راستہ

☆ تاریخ کے وہ اسباق جو مسلمان بھول چکے ہیں

☆ یہ سب کچھ عبداللہ اور ناعمہ کی داستان کی شکل میں پڑھیے

خدا بول رہا ہے

مصنف: ابو یحییٰ
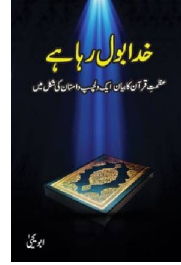
''جب زندگی شروع ہوگی'' سے شروع ہوئی کہانی کا چوتھا حصہ

☆ ''جب زندگی شروع ہوگی'' کی کہانی کا ایک نیا پہلو

☆ جنت میں عبداللہ کی اپنے والدین سے ملاقات کی روداد

☆ عظمتِ قرآن کا بیان، ایک منفرد ناول کی شکل میں

☆ ایک باوفا شخص کے اوراقِ حیات جس کی دنیا لٹ گئی تھی

☆ ایک نوعمر لڑکی کی داستان جو دنیا کو اپنی جنت بنانا چاہتی تھی

☆ قرآن کی تاثیر کا بیان جس نے ان دونوں کی زندگیاں بدل کر رکھ دیں

☆ قرآن کی دعوت کو سمجھنے اور سمجھانے کا انوکھا انداز

☆ وہ کہانی جس کا اختتام جانتے ہوئے بھی آپ اسے ختم کیے بنا نہیں رہ سکتے

☆ ایک اچھوتے اور منفرد انداز میں قرآن مجید کا تعارف

قرآن کا مطلوب انسان

مصنف: ابو یحییٰ
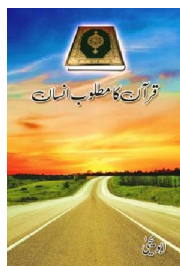
☆ قرآن مجید پر مبنی اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام

☆ اللہ تعالیٰ ہمیں کیسا دیکھنا چاہتے ہیں

☆ وہ کن لوگوں کو جنت عطا کریں گے

☆ کون سے اعمال انہیں ناراض کر دیتے ہیں

☆ ان کی پسند اور ناپسند کا راستہ کیا ہے

☆ اللہ تعالیٰ کی مرضی ان کے اپنے الفاظ میں جاننے کا منفرد ذریعہ

☆ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مزین اخلاق نبوی کا قرآنی نمونہ

☆ ابو یحییٰ کی ایک منفرد تصنیف

تیسری روشنی

مصنف: ابو یحییٰ
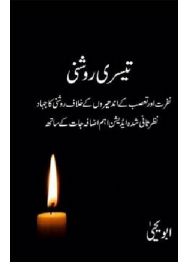
☆ ابو یحییٰ کی داستان حیات ۔ تلاش حق کی سچی کہانی

☆ نفرت اور تعصب کے اندھیروں کے خلاف روشنی کا جہاد

☆ جب زندگی شروع ہوگی کے حوالے سے اٹھائے گئے اہم سوالات کا جواب

☆ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے والے رویوں کا تفصیلی بیان

☆ امت مسلمہ کے اتحاد کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے ایک رہنما تصنیف

☆ ابو یحییٰ کی ایک اور منفرد تصنیف

بس یہی دل

مصنف: ابو یحییٰ
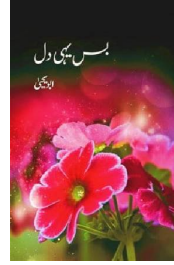
☆ دل کو چھو لینے والے مضامین

☆ ذہن کو روشن کر دینے والی تحریریں

☆ آنکھوں کو نم کر دینے والے الفاظ

☆ ابو یحییٰ کے قلم سے نکلے ہوئے وہ مضامین جو ایمان و اخلاق کی اسلامی دعوت کا بھرپور اور موثر بیان ہیں۔

☆ دلنشین اسلوب میں لکھی گئی ایسی تحریریں جنھیں پڑھ کر آپ دل کے دروازے پر ایمان کی دستک سن سکیں گے۔

حدیثِ دل

مصنف: ابو یحییٰ
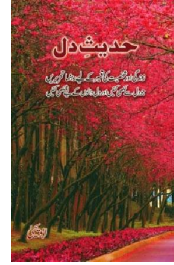
مجموعہ مضامین جس میں آپ پائیں گے اپنی

☆ شخصیت کی تعمیر

☆ اخلاق کی اصلاح

☆ ایمان کی تازگی

☆ اقدار کی زندگی اور

☆ افکار کی تشکیل نو

☆ ہمیشہ کی طرح ابو یحییٰ کے الفاظ کی دستک آپ اپنے دل کے دروازے پر محسوس کریں گے۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ

مصنف: ابو یحییٰ
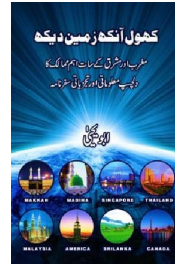
☆ مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفر نامہ

☆ کینیڈا، امریکہ کی زندگی کا تفصیلی جائزہ

☆ مکہ، مدینہ کی مقدس سرزمین اور سعودی عرب کا احوال

☆ سری لنکا، تھائی لینڈ، ملائیشا اور سنگاپور کی زندگی کا نقشہ

☆ مغرب اور مشرق کے ممالک کا تقابل اور اسلام کی علمی برتری کا بیان

☆ مغربی تہذیب کی کمزوریوں نظام کی خوبیوں کا بے لاگ جائزہ

☆ سات ممالک کے اہم قابل دید مقامات کی دلچسپ منظر کشی

☆ سفرنامے کے اسلوب میں لکھی گئی ایک اہم فکری کتاب

سیر ناتمام

مصنف: ابویحییٰ
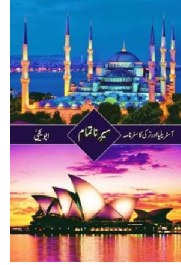
☆ آسٹریلیا کی نئی دنیا کے تمام اہم شہروں کے دعوتی سفر کی روداد

☆ مغرب اور مشرق کے سنگم ترکی کا آنکھوں دیکھا حال

☆ جدید اور قدیم دنیا کے تفریحی مقامات کی دلچسپ سیر

☆ سترہ صدیوں تک دنیا کا مرکز رہنے والے استنبول کی کہانی

☆ احوال سفر کے دلچسپ مشاہدات، معلومات اور نئی چیزوں کا تعارف

☆ ابویحییٰ کے دلچسپ اور پرمغز تجزیے، تنقید اور تبصرے

☆ ہر قدم پر تاریخ کے اسباق اور جدید و قدیم دنیا کا تعارف

☆ آپ کے وژن اور طرز فکر کو نیا انداز عطا کرنے والی کتاب

☆ ایک داستان سفر جو سفر سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہے

ملاقات

مصنف: ابو یحییٰ
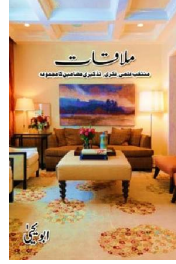
☆ اہم علمی، اصلاحی اور اجتماعی معاملات پر ابو یحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

☆ کریم اور رحیم کا خطاب پانے والے انبیا کی دلنواز سیرت کا بیان

☆ دین کی حقانیت اور دعوت دین کے اہم پہلوؤں کی وضاحت

☆ قیامت اور قرب قیامت کے اہم احوال کی تفصیل

☆ اہم معاشرتی اور خاندانی مسائل کے حل کے لیے رہنما تحریریں

☆ لونڈیوں سے تعلقات کے ضمن میں اسلام کے موقف کی وضاحت

☆ مسائل زندگی کے حل کے لیے رہنما تحریریں

☆ ہم جنسی تعلقات اور ارتقا جیسی عملی اور فکری گمراہیوں کی موثر تردید

When Life Begins

English Translation of Abu Yahya's Famous book **Jab Zindagi Shuru Ho Gee**
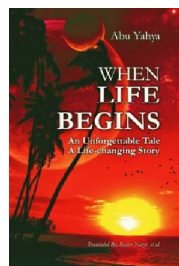
A Book that created ripples through out the world

A Writing that was read by Millions

A Book that changed many Lives

A Writing that has become a Movement

A Comprehensive sketch of the World and Life in Hereafter in the form of an interesting Novel

A Book that will strengthen your Faith in God and Hereafter

The first book of its kind in the world of Literature